منہاج العابدین

تصنیف

امام ہمام حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ و حواشی

از مولانا محمد سعید احمد نقشبندی

خطیب و امام مسجد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لاہور

ناشر

حفیظ بک ڈپو اردو بازار دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ

اردو ترجمہ کتاب مستطاب

مِنہاجُ العَابِدِین

تصنیف

امام ہمام حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ حواشی

از مولانا محمد سعید احمد نقشبندی

خطیب و امام مسجد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، لاہور

ناشر

حفیظ بک ڈپو اردو بازار دہلی ۶

بار دوم　　　آفسٹ طباعت　　　دسمبر ۱۹۷۳ء

کتاب　منہاج العابدین اُردو

تصنیف　حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ترجمہ وحواشی　مولانا محمد سعید احمد نقشبندی خطیب مسجد حضرت داتا صاحب لاہور

کاتب　محمد یوسف خوشنویس سکنہ حضرت کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ

طابع　جوہر آفسٹ پریس دہلی

تعداد　ایک ہزار (۱۰۰۰)

صفحات　۳۴۶

قیمت　-/۱۵۰ روپے

فہرست مضامین منہاج العابدین اُردو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(از جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری)

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی قدس سرہٗ (متوفی ۵۰۵ھ) اسلام کے جلیل القدر عالم، عارف، مفکر اور مجدد تسلیم کیے گئے ہیں۔ انہوں نے فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، اصول کلام، اخلاق، تصوف واحسان، فلسفہ، مناظرہ اور دیگر علوم وفنون پر ایک سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں جو ان کی زندگی میں ہی مقبول ہو گئی تھیں۔ ان کی تعلیمات وافکار کو اسلامی دنیا میں بے پناہ قبولیت و پذیرائی کے علاوہ یورپ میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور ایک عرصہ تک ان کی تصانیف وہاں کے اہل علم کی تحقیق کا مرکز بنی رہیں۔

امام غزالی کے زمانے میں فلاسفہ، متکلمین اور بدمذہبوں نے اپنے عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ کو بڑے شدومد سے پھیلانا شروع کر دیا تھا اور دین کے نام پر طرح طرح کے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ امام حجۃ الاسلام نے ان بدمذہبوں کے مذموم ومسموم نظریات کا بلیغ رد کیا اور اپنے علم کلام کے ذریعے ٹھیٹ اسلام کی پرزور ترجمانی کی۔ حق یہ ہے کہ امام غزالی اپنے علم کلام کے خود موجد اور خود خاتم تھے۔ ان کا طریق استدلال اور انداز افہام بالکل نرالا ہے۔ ان کے بعد ان جیسا کوئی اور مفکر اور متکلم دنیائے اسلام میں پیدا نہیں ہوا۔ علامہ اقبال نے بھی اسی لیے فرمایا ہے ؎

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مشہور ومعروف اور مقبول ومطبوع تصانیف میں سے ایک "منہاج العابدین الی جنت رب العالمین" ہے جس کا ترجمہ پیش نظر ہے۔ اس کتاب بارے میں حضرت امام غزالی کے شاگرد جناب عبداللہ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ یہ امام صاحب کی آخری تصنیف ہے اور اس کو ان کے خاص شاگردوں کے سوا کسی اور نے نقل نہیں کیا۔۔۔۔ کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے

اور خود مصنف علام نے موضوع اور مقصدِ تصنیف کو ابتداء کتاب میں بصراحت بیان کیا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت امام نے غایتِ تخلیق جن وانس اور جنت میں داخل ہونے کا واحد ذریعہ "عبادت" کے موضوع پر متصوفانہ انداز میں یہ کتاب لکھی ہے۔ سالک کو اس راہ میں قسم قسم کی جو رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، ان کی اور شیطانی ونفسانی وساوس کی ہلاکت آفرینیوں کی نشان دہی کر کے ان سے بچنے کی تدابیر بتائی ہیں اور محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر بندگی کرنے کی تلقین کی ہے اور بے شمار مسائل شریعت وطریقت اور معرفت وحقیقت کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ غرض کہ یہ کتاب طالب حق وسالک راہِ ھدیٰ کے لیے مرشدِ طریق کا حکم رکھتی ہے اور خود امام غزالی اس کتاب کے ثنا خواں اور اس کی عمدہ الہامی ترتیب پر نازاں ہیں۔ مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں:

"بزرگانِ دین نے جن کا درگاہ ایزدی میں بلند مقام ہے، فضول اعتراضات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور تمام امت پر نظرِ کرم فرماتے ہوئے اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ میں بھی اس ذات اقدس کی طرف ملتجی ہوا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالمِ خلق و امر کی چیزیں ہیں، کہ مجھے ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کی توفیق دے جس پر سب متفق ہوں اور جس کے پڑھنے سے تمام کو فائدہ پہنچے۔ تو اس رحیم وکریم ذات نے میری التجا قبول فرمائی۔ اس نے اپنے فضل وکرم سے عبادت کے عجیب وغریب اسرار ورموز پر مطلع فرمایا۔ اور مجھے اس کتاب کی عجیب ترتیب وتدوین کا الہام فرمایا ——— ایسی ترتیب میں کسی اور کتاب کی تصنیف میں قائم نہیں رکھ سکا۔ یہ وہ تصنیف ہے جس کی میں خود تعریف کرتا ہوں۔"

اس تصنیفِ منیف کی افادیت واہمیت کے پیشِ نظر بعض علماء وصوفیہ نے اس کی شروح لکھیں اور ملخص تیار کیے۔ استاد جلال الدین ہمائی (تہران) رقم طراز ہیں:

"ایں کتاب راہم بعض علماء شرح وتلخیص کردہ اند، از جملہ شمس الدین بلاطنسی دو شرح مختصر ومفصل برآں نوشت ونیز آں را تلخیص کردہ "بغیۃ الطالبین" نام نہاد۔"[1]

مشہور عارف وعالم اور متعدد کتب تصوف کے مصنف حضرت شاہ کلیم اللہ چشتی جہان آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی ۱۰۷۳ھ میں "منہاج العابدین" کی تلخیص کی۔ جس کا نام "ما لا بد" ہے۔ شاہ کلیم اللہ نے منہاج العابدین کو علم سلوک کی معیاری کتاب قرار دیا ہے۔

---

[1] غزالی نامہ مطبوعہ تہران ص ۲۶۶

پاک و ہند میں منہاج العابدین کے متعدد اردو تراجم ہوئے۔ اس وقت میرے پیش نظر صرف تین ترجمے ہیں۔ ان میں قدیم ترجمہ وہ ہے جسے مطبع نظامی لدھیانہ نے ۱۲۷۲ھ میں شائع کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ مولانا محمد منیر نے ۱۲۸۰ھ میں کیا اور ۱۲۸۸ھ میں مطبع منشی نولکشور سے طبع و شائع ہوا۔ یہ دونوں ترجمے اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔ تیسرا ترجمہ مولانا عابدالرحمٰن کاندھلوی کا ہے جو چند سال ہوئے کراچی سے چھپا تھا۔

منہاج العابدین ایسی عمدہ، مفید اور نافع کتاب کے ایک اچھے ترجمے کی اشد ضرورت تھی۔ الحمد للہ کہ فاضل محترم حضرت مولانا محمد سعید احمد نقشبندی مجددی مدظلہ، خطیب جامع مسجد دربار حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ العزیز نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

مولانا محمد سعید احمد زید مجدہٗ کے ترجمے کو میں نے پہلے اکثر تراجم سے بہتر پایا ہے۔ فاضل مترجم نے آیات و احادیث کے علاوہ اقوال بزرگان دین اور اشعار کو بھی اصل عربی زبان میں درج کر کے ان کے بالمقابل ترجمہ دیا ہے۔ جس سے ان کی نورانیت و برکت قائم رہنے کے ساتھ ساتھ عربی ادب سے شغف رکھنے والوں کے ذوق کی تسکین کا سامان موجود رہا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ جناب مترجم کو جزائے خیر سے نوازے اور اس کتاب کے قارئین اور احقر کو جنت میں جانے والے سیدھے راستے پر گامزن ہونے کی توفیق عطا کرے۔ آمین ثم آمین بجاہ نبی الامین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

محمد موسیٰ عفی عنہ ــ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

شیخ، صالح، زاہد، علامہ عبدالملک بن عبداللہ نے فرمایا (اللہ تعالیٰ اُسے بخشے) کہ میرے شیخ امام اجل، نیک بخت، توفیق یافتہ، حجۃ الاسلام، دین کی زینت، اُمت کے لیے شرف، ابو حامد محمد بن محمد بن محمد غزالی طوسی نے میرے سامنے یہ کتاب پڑھی اور نقل کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی رُوح کو خوش کرے اور جنت میں ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے ——— یہ امام موصوف کی آخری تصنیف ہے، اور مصنف علیہ الرحمۃ سے اس کتاب کے سننے کا موقع صرف ان کے خاص احباب کو ہی میسّر آیا ہے۔

کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

سب خوبیاں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام کائنات کا مالک ہے، جس نے تمام موجودات کو اپنی حکمتِ کاملہ سے ترتیب دیا۔ جو حکیم، جواد، غالب اور کریم جیسے اعلیٰ صفاتی اسماء سے متصف ہے جس نے انسان کو بہترین فطرت پر پیدا فرمایا۔ اور زمین و آسمان جیسی عظیم مخلوق کو اپنی قدرت کاملہ سے وجود کا جامہ پہنایا۔ اور جس نے دونوں جہان کے امور کو احسن طریق پر چلایا۔ اور جن وانس کو صرف اپنی ہی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

لقائے الٰہی کا قصد کرنے والوں کے لیے اس تک پہنچنے کی راہیں کشادہ ہیں، اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس کی ہستی پر واضح دلائل موجود ہیں ——— لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت کی راہ دکھائے۔

اور قیامت تک حضور پُرنور سیّد انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل اور آپ کے اصحاب پر، جو ظاہر و باطن میں طیب و طاہر تھے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی طرف سے سلامتی نازل ہوتی

رہے۔ اور ہمیشہ آپ کی اور آپ کے متعلقین کی عظمت قائم رہے۔

امّا بعد! اے عزیز بھائیو! (اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اپنی رضا کا پابند بنائے، جو جنت فردوس کی راہ ہے) خداوند کریم کا ارشاد ہے:

وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۔ — میں ہی تمہارا رب ہوں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ فرمایا:

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۔ — (جنتیوں کو جنت میں داخل ہوتے وقت کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش (جو تم نے دنیا میں کی مقبول ہوئی۔

آیات مندرجہ بالا سے معلوم ہوا کہ جنت میں جانا اسی کو نصیب ہوگا جس نے دنیا میں کوشش کی اور کما حقہٗ خدا کی بندگی میں مصروف رہا۔ اس لیے ہم نے عبادات کی حقیقت میں نظر کی، اس کے طریقوں پر غور کیا، اس کے بنیادی امور اور ان مقاصد میں نظر دوڑائی جو سالک راہِ آخرت کو درپیش ہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ طریقِ عبادت نہایت دشوار اور مشکل ہے۔ اس راہ میں نہایت تنگ و تاریک گھاٹیاں عبور کرنا پڑتی ہیں۔ شدید مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بڑی بڑی آفات راستے میں پیش آتی ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے میں بہت موانع اور رکاوٹیں درپیش ہیں اور طول و طویل غیر مرئی مسافتوں کو طے کرنا پڑتا ہے۔

غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت کے راستے میں گوناگوں ہلاک اور تباہ کن چیزیں مخفی ہیں۔ اور یہ کہ یہ راستہ خطرناک دشمنوں اور ڈاکوؤں میں گھرا ہوا ہے۔ اور یہ کہ اس راستے کی شاخیں اور فروعات سخت پیچیدہ ہیں ــــ مگر اس راستے کا ایسا مشکل اور پیچیدہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ جنت کا راستہ ہے۔ اور جنت میں پہنچنا کوئی آسان نہیں۔

اور عبادت کا اتنا مشکل ہونا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے:

اَلَا وَاِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ وَاِنَّ النَّارَ حُفَّتْ بِالشَّهَوَاتِ ۔ — سُن لو! جنت خلافِ نفس کام کرنے سے حاصل ہوگی اور دوزخ میں لوگ شہوات کی پیروی کی وجہ جائیں گے۔

اسی بارے میں آپ کا دوسرا ارشاد یہ ہے :

اَلَا وَاِنَّ الْجَنَّةَ حَزْنٌ بِرَبْوَةٍ وَاِنَّ النَّارَ سَهْلٌ بِسَهْوَةٍ ۔	سن لو کہ جنت اونچے ٹیلے پر سنگلاخ زمین کی طرح ہے اور دوزخ صحن میں نرم ہموار زمین کے مانند ہے

یعنی اوّل الذکر زمین میں کاشت کر کے پھل حاصل کرنا نہایت محنت طلب ہے ۔

پھر عبادت سے متعلقہ مشکلات کے ساتھ ساتھ انسان ایک کمزور مخلوق ہے اور زمانہ طرح طرح کی صعوبتوں سے لبریز ہے اور دین کا معاملہ ترقی کے بجائے تنزل کی طرف رجوع کر رہا ہے ۔ پھر دُنیوی مشغولیتیں بہت ہیں اور عبادت کے واسطے وقت بہت مختصر ہے ۔ اُدھر انسان کی عمر بہت کم ہے اور مزید یہ کہ انسان اعمال صالحہ کی بجا آوری میں بہت لاپروائی کرتا ہے یعنی خشوع اور خضوع وغیرہ کا خیال بہت کم رکھتا ہے ۔ اور جس ذات نے اعمال کو پرکھنا ہے وہ انتہائی بصیر ہے —— ان تمام پریشانیوں کے ساتھ ساتھ موت ہر ثانیہ قریب آ رہی ہے، اور انسان کو جو سفر درپیش ہے وہ بہت طویل ہے ۔

مندرجہ بالا مشکلات میں گھرے ہوئے انسان کو پتہ ہونا چاہیے کہ اس خطرناک اور ضروری سفر کا توشہ صرف عبادت ہے ۔ اور سفر میں زادِ راہ کا ہونا ضروری ہے ۔ اور اس زادِ راہ کو فراہم کرنے کا وقت اس تیزی سے گزر رہا ہے کہ ہرگز واپس نہیں آئے گا ۔ تو جو شخص اس تھوڑے سے وقت میں زادِ آخرت تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا سمجھو وہ نجات پا گیا اور اس نے ہمیشہ کی سعادت حاصل کر لی ۔ لیکن جس احمق نے اس انتہائی قیمتی وقت کو لہو ولعب میں کھو دیا، اور زادِ آخرت مہیا نہ کر سکا تو وہ بلاشک ناکام نامراد رہا اور تباہ و برباد لوگوں میں سے ہو گیا ۔

مذکورہ وجوہات کے باعث یہ عبادت جس قدر مشکل ہے اس سے کہیں زیادہ اہم بھی ہے ۔ اسی لیے اس سفر پر کمر بستہ ہونے والے تھوڑے ہیں ۔ اور پھر عزم کر استقلال سے اس سفر کی منازل طے کرتے والے اس سے تھوڑے ہیں ۔ مگر منزل مقصود تک پہنچنے والے ہی خدا کو پیارے ہیں ۔ انہی کو اللہ نے اپنی محبت و معرفت کے لیے چنا اور منتخب کیا ۔ اور انہی لوگوں کو رب تعالیٰ توفیق و عصمت کے ساتھ مضبوط کرتا ہے ۔ پھر یہی لوگ جنت فردوس کے مستحق بنتے ہیں اور اس کی رضا کا مقام پاتے ہیں —— تو ہم اللہ تعالیٰ سے (جس کا ذکر بلند ہے) التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور تمہیں اپنی رحمت سے سعادت مند کرے اور کامیاب

لوگوں میں شامل کرے۔

جب ہم نے طریق عبادت و ریاضت کو مذکورہ نوعیت کا پایا، اور اس راہ کے قطع کرنے کے اسباب پر پورا پورا غور کیا، اور ان چیزوں پر غور کیا جن کا انسان فریضۂ عبادت ادا کرتے وقت محتاج ہے۔ مثلاً عبادت کی استعداد اور قوت ہونا، اسے عملی طور پر بجالانا، اس سے متعلق ضروری علم حاصل کرنا اور دیگر ضروری تدابیر اختیار کرنا جو اللہ کی توفیق واطاعت سے ہی عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ اور خدا کی رحمت سے ہی بندہ اس کی مشکل گھاٹیوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ تو ہم نے سفر آخرت کو طے کرنے کے متعلقہ امور واسباب پر کئی کتابیں لکھیں جیسے "احیاء علوم دین"، "القربۃ الی اللہ" وغیرہ، جن میں عبادت کے دقائق و غوامض پر بحث کی گئی ہے۔ ان کتابوں میں ایسی تحقیقات ہیں جن کو عامۃ الناس کے ذہن نہیں سمجھ سکتے۔ جب عوام ان نفیس بحثوں کو نہ سمجھ سکے تو انہوں نے اپنی کم فہمی سے ان پر نکتہ چینی شروع کردی۔ اور جو باتیں ان کے ناقص مذاق کے موافق نہ آئیں، انہیں فضول قیل وقال کا محل بنا لیا ـــــ لیکن اس قسم کی قیل وقال کوئی نئی شئے نہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رب العالمین کا کلام فصاحت و بلاغت اور اونچے مسائل اور معیاری مضامین کے اعتبار سے بے مثل و بے مثال ہے۔ مگر معترضین نے اس کے متعلق بھی کہہ دیا کہ:

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ یہ تو اگلے وقتوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

اور کیا آپ نے حضرت زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ اشعار نہیں سنے:

(۱) اِنِّیْ لَاَکْتُمُ مِنْ عِلْمِیْ جَوَاهِرَهٗ !	کَیْلَا یَرٰی ذَاکَ ذُوْ جَهْلٍ فَیَفْتَتِنَنَا
(۲) وَ تَقَدَّمَ فِیْ هٰذَا اَبُوْ حَسَنٍ	اِلَی الْحُسَیْنِ وَ وَصّٰی قَبْلَهُ الْحَسَنَا
(۳) یَا رُبَّ جَوْهَرِ عِلْمٍ لَوْ اَبُوْحُ بِهٖ	لَقِیْلَ لِیْ اَنْتَ مِمَّنْ یَّعْبُدُ الْوَثَنَا
(۴) وَ لَاسْتَحَلَّ رِجَالٌ مُّسْلِمُوْنَ دَمِیْ	یَرَوْنَ اَقْبَحَ مَا یَاْتُوْنَهٗ حَسَنًا

ترجمہ

(۱) مجھے اپنے کئی علمی جواہر پارے پوشیدہ رکھنے پڑتے ہیں، تاکہ جہلاء ان کی تہ تک نہ پہنچنے کے باعث کہیں فتنہ میں مبتلا نہ کردیں۔

(۲) اور مجھ سے پہلے میرے جدِ امجد (حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بھی امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما

کو فرما گئے ہیں کہ :

(۳) اے میرے اللہ! اگر میں اپنے علمی موتی لوگوں کے سامنے ظاہر کر دوں تو مجھے یہ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بُت پرست ہے۔

(۴) وہ ایسے پُراسرار علوم ہیں کہ ان کو سُن کر مسلمان بھی میرے قتل کے درپے ہو جائیں اور قتل کی اس بدترین حرکت کو درست خیال کریں۔

تو بزرگانِ دین نے جن کا درگاہِ ایزدی میں بلند مقام ہے، فضول اعتراضات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور تمام اُمت پر نظرِ کرم فرماتے ہوئے اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف فرمائیں ——— میں بھی اس ذاتِ اقدس کی طرف ملتجی ہوا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم خلق وامر کی چیزیں ہیں کہ مجھے ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کی توفیق دے جس پر سب متفق ہوں اور جس کو پڑھنے سے تمام کو فائدہ پہنچے تو اس رحیم وکریم ذات نے میری یہ التجا قبول فرمائی۔ اس نے اپنے فضل وکرم سے عبادت کے عجیب وغریب اسرار ورموز پر مطلع فرمایا، اور مجھے اس کتاب کی عجیب ترتیب وتدوین کا الہام فرمایا۔ ایسی ترتیب میں کسی اور کتاب کی تصنیف میں نہیں قائم کر سکا۔ یہ وہ تصنیف ہے جس کی میں خود صفت کرتا ہوں، (فَاَقُوْلُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْق)

سب سے پہلے بندے کو رب کی عبادت کی طرف جو چیز متوجہ کرتی ہے وہ اللہ کی طرف سے بندہ کے دل میں عبادت کا خیال اور اس کی طرف سے نیک اعمال کی توفیق ہے۔ رب تعالیٰ کے اس قول میں اسی توفیق وخیال کی طرف اشارہ ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ	خدا تعالیٰ نے جس کا سینہ اسلام کے لیے کھول
فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۔	دیا ہو اس میں خدا کا ایک نور پیدا ہو جاتا ہے۔

اور حضور پرنور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اپنے اس ارشاد میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

اِنَّ النُّوْرَ اِذَا دَخَلَ الْقَلْبَ اِنْفَسَحَ	جب بندہ کے دل میں خدا تعالیٰ کا نور داخل ہوتا
وَانْشَرَحَ ۔	ہے تو دل میں وسعت اور انشراح پیدا ہو جاتا ہے

صحابہ کرام نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! اس نور اور خیال کے بندہ میں آنے کی کیا علامت ہے؟ تو آپ نے جواب دیا :

اَلتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَۃُ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِ الْمَوْتِ۔	اس فانی دنیا سے کنارہ کشی، آخرت کی طرف رجوع، موت آنے سے پہلے موت کی تیاری۔

تو سب سے پہلے بندے کے دل میں جب یہ خیال اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوتا ہے کہ میں تو اللہ تعالیٰ کی قسم قسم نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہوں جیسے زندگی کی نعمت۔ قدرت عقل۔ بول چال، اور دیگر اعلیٰ صفات ولذات کی چیزیں اور اس نے میرے لیے ایسے اسباب بھی مہیا فرمائے جن کے ذریعہ میں اپنے آپ کو تکالیف اور نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رکھ سکتا ہوں، اور آفات سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہوں۔ اور پھر بندہ جب یہ بھی سوچتا ہے کہ جس منعم نے مجھے یہ نعمتیں عطا کی ہیں وہ مجھ سے ان نعمتوں کا شکر اور اپنی خدمت کا مطالبہ کرے گا۔ اور اگر میں نے نعمتوں پر شکر اور اس کی خدمت نہ کی تو وہ یہ نعمتیں مجھ سے چھین لے گا اور اس ناشکری کی وجہ سے وہ مجھ پر غصہ اور ناراض ہو گا اور ایک روز سزا دے گا۔

اور بندہ جب یہ بھی خیال کرتا ہے کہ اس منعم نے اپنی معرفت و خدمت کے آداب بتانے کے لیے ہماری طرف رسول بھیجے جن کو ایسے ایسے معجزات عطا کیے جو انسانی عقل وطاقت سے باہر تھے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ اے بندے! تیرا ایک پروردگار ہے، جو ہر شے پر قادر ہے، ہر شے کو جانتا ہے، ہمیشہ زندہ ہے، ہمیشہ سے متکلم ہے، جو چاہے ارادہ فرماتا ہے۔ اس نے تجھے بعض کام کرنے کا اور بعض نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسے یہ بھی طاقت ہے کہ اگر میں نے نافرمانی کی تو مجھے عذاب دے گا اور طاعت کا نیک صلہ دے گا۔ وہ میرے تمام پوشیدہ اسرار کو جانتا ہے، اور جو کچھ میری فکر میں آتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔ اور اس نے طاعت کرنے والوں سے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرایا ہے۔ اور اس نے احکامِ شرع کی بجا آوری مجھ پر لازم کی ہے۔

ان تمام مندرجہ بالا چیزوں کا خیال کرنے سے بندہ کے دل میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ میں ایک ممکن اور فانی چیز ہوں۔ میرے اندر خود کوئی کمال نہیں اور نہ ہی کوئی ذاتی خوبی ہے —— اپنے متعلق یہ رائے قائم کرنے میں عقل انسانی کو زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

تو ان تمام امور کا تصور کرنے سے بندے پر اپنے پروردگار کا خوف طاری ہوتا ہے اور وہ گھبرا اُٹھتا

ہے۔ یہی گھبراہٹ بندے کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے۔ اور یہی گھبرا دینے والا تصور اتمام حجت کرتا ہے اور انسان کے تمام بہانوں کو قطع کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی خیال اسے آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ اس خیال سے ایک سلیم الفطرت انسان چونک جاتا ہے اور اس میں قلق و اضطراب پیدا ہو جاتا ہے تو بندہ اپنی نجات کی راہ تلاش کرتا ہے اور حصولِ امن کے ذرائع ڈھونڈتا ہے۔ کچھ تو اپنے دماغ سے سوچتا ہے اور کچھ دوسروں سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو بندہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں پاتا کہ کائنات میں غور و فکر کرے تاکہ خالق کی معرفت اور پہچان حاصل ہو اور تاکہ ذاتِ خداوندی کے متعلق جو اس سے غائب ہے، علم یقین حاصل ہو اور یہ جانے کہ میرا ایک رب ہے جس نے اسے امر و نہی کا مکلف بنایا ہے۔

تو یہ غور و فکر کرنا اور اپنے خالق کے متعلق علم یقین حاصل کرنا پہلی گھاٹی ہے جو طریقِ عبادت میں پیش آتی ہے۔ اسے علم و معرفت کی گھاٹی سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ علم و معرفت اس لیے ضروری ہے تاکہ بندے کو عبادت کے معاملہ میں اہم معلومات کی واقفیت حاصل ہو اور تاکہ اس راہ کو سوچ بچار اور غور و فکر سے طے کرے۔ یہ سوچ و بچار اور غور و فکر علم و معرفت کی گھاٹی میں داخل ہے۔ بندے کو چاہیے کہ آخرت کی طرف راہ نمائی کرنے والے علمائے کرام سے بھی اس عقبہ (گھاٹی) سے متعلق معلومات حاصل کرے۔

ہم نے علمائے آخرت کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ ایسے علماء ہی صراطِ مستقیم کی راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ ایسے علماء ہی اُمت کے چشم و چراغ ہیں، اور یہی اُمت مرحومہ کی قیادت کے لائق ہیں۔ تو سفر آخرت کے مسافر کو چاہیے کہ ایسے ہی علماء سے استفادہ کرے اور انہی کی نیک دعائیں لے۔ کیونکہ ایسے پاکیزہ سیرت لوگوں کی دعا ہی دستگیر اور رحمت و توفیق خداوندی کا موجب ہوتی ہے۔ تاکہ بندہ ان کی نیک دُعاؤں اور رب تعالیٰ کی توفیق کے ذریعہ راہِ آخرت کو طے کر سکے۔

اس علم و معرفت کے ذریعہ ان امور کا یقین بھی ہو جائے گا کہ میرا ایک معبودِ برحق ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اُسی نے مجھے پیدا کیا اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا۔ بندے کو اس کا بھی یقین ہو جائے گا کہ اُس معبودِ برحق نے مجھے ان عطا کردہ نعمتوں کے شکر کا حکم دیا ہے، اور ظاہر و باطن میں خدمت و طاعت کا امر فرمایا ہے۔ اور کفر و دیگر معاصی سے روکا اور ان کی سزا سے ڈرایا ہے۔ اور یہ فیصلہ سُنا دیا ہے کہ اگر بندہ

اس کی خدمت وطاعت کرے گا تو وہ آخرت میں اسے غیر فانی صلہ اور بدلہ عنایت فرمائے گا' اور نافرمانی وسرکشی کرنے والے کو دائمی عذاب میں مبتلا کرے گا۔

تو یہ یقین ومعرفت بندے کو اپنے مالک ومولیٰ کی خدمت وطاعت پر ابھارتے ہیں اور اس آقا کی خدمت کی ترغیب دیتے ہیں جس نے اس کو ہر قسم کی نعمتیں عطا فرمائیں۔ اور بندہ اگر خلوص سے اس آقا کی تلاش کرے تو اسے پا بھی لے۔ اور اس کی پہچان ومعرفت ہو جائے باوجودیکہ پہلے اس سے جاہل ہوتا ہے۔

اگرچہ بندہ اس معرفت وپہچان سے رب تعالیٰ کی عبادت وخدمت کی طرف راغب ہوتا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی عبادت کیسے کی جاتی ہے۔ اور اس کے لیے بندہ کے ظاہر وباطن میں کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ اس لیے مذکورہ علم ویقین کے ساتھ ساتھ ان فرائض کو سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے جن کا تعلق بندہ کے ظاہر وباطن کے ساتھ ہے۔ پس بندہ جب فرائض کو اچھی طرح جان لیتا ہے اب انہیں عملی طور پر بجا لانے کا ارادہ کرتا ہے۔ جب شروع ہونے لگتا ہے تو اپنے آپ کو طرح طرح کے گناہوں اور معاصی سے ملوث پاتا ہے۔ اور یہ اکثر لوگوں کا حال ہے۔

تو جب بندہ اپنے گناہوں پر نظر کرتا ہے تو دل میں کہتا ہے کہ میں عبادت کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہوں؟ جبکہ میں گناہ کرنے پر اڑا ہوا ہوں' اور جبکہ میرا ظاہر وباطن گناہوں کی نجاست سے آلودہ ہے۔ عبادت کی طرف متوجہ ہونے سے قبل مجھ پر لازم ہے کہ گناہوں سے سچی توبہ کروں تاکہ گناہوں کی نجاست سے پاک ہو سکوں۔ اور معاصی کی منحوس قید وبند سے خلاصی پا سکوں: تاکہ طاعتِ خداوندی کے لائق ہو سکوں اور اس کی بندگی کی بساط بچھا سکوں۔ تو گناہوں سے پاک ہونے کے لیے عبادت کی طرف متوجہ ہونے سے قبل توبہ کی گھاٹی عبور کرنا پڑتی ہے۔ اس گھاٹی کو "عَقَبَةُ التَّوْبَةِ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تو اس بنا پر بندے کو ضروری طور پر اس گھاٹی کو عبور کرنا پڑتا ہے' تاکہ اصل مقصود کی طرف متوجہ ہونے کے لائق ہو سکے۔ اس لیے بندے پر لازم ہے کہ پورے ارکان وشرائط کے ساتھ توبہ کرے اور پوری احتیاط کے ساتھ اس گھاٹی کو عبور کرے۔ جب توبہ صادق نصیب ہو جائے اور یہ مرحلہ طے کر لے تو عبادت کی طرف متوجہ ہو۔

مگر جب بندہ توبہ سے فارغ ہو کر عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو عبادت کو بھی طرح طرح

کی رکاوٹوں اور مشکلات میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ ہر رکاوٹ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسے عبادت سے روکتی ہے۔ اور عبادت سے روکنے والی اصل میں چار چیزیں ہیں:

(۱) دنیا۔ (۲) لوگوں سے میل جول۔

(۳) شیطان۔ (۴) نفس

لہٰذا پہلے ان چار چیزوں کو راہ سے ہٹانا اور دور کرنا ضروری ہے۔ ورنہ بندہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تو ان چار چیزوں کو چار طریقوں سے دُور کرے:

(۱) دنیا سے قطع تعلق کرے۔ (۲) لوگوں سے میل جول ترک کرے۔

(۳) ابلیس سے محاربہ اور جنگ کرے۔ (۴) نفس پر سختی کرے۔

مگر نفس پر سختی کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ نہ تو بندہ اس سے بالکل بے نیاز ہو سکتا ہے، اور نہ ہی شیطان کی طرح اس پر حد سے زیادہ سختی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ عبادت کی منزل طے کرنے کے لیے یہ نفس ہی بندے کی سواری اور آلہ و ذریعہ ہے۔ اور اگرچہ نفس عبادت کا آلہ اور ذریعہ ہے مگر عبادات میں اس کی موافقت و مطابقت کی بھی امید نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ نیک کام کی مخالفت نفس کی جبلت میں داخل ہے۔ یہ تو لہو و لعب کا مشتاق ہے۔ اس لیے اس سے کام لینے کے لیے ضروری ہے کہ اسے تقویٰ کی لگام دی جائے۔ تاکہ یہ بندے میں رہے تو سہی، مگر مطیع و فرماں بردار ہو کر، نہ کہ سرکش و باغی ہو کر۔ تاکہ حسب ضرورت نیک کاموں میں اس سے کام لیا جائے اور فساد انگیز و ہلاکت خیز اُمور سے قید میں رکھا جائے۔

جب بندہ ان چار چیزوں کو راستے سے ہٹا دیتا ہے اور خدا کی امداد و اعانت سے اس مرحلے کو بھی طے کر لیتا ہے اور عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اب چند اور موانع اسے پیش آتے ہیں جو عبادت کے لیے فراغت، دل جمعی اور یکسوئی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اور یہ موانع بھی تعداد میں چار ہیں:

اوّل رزق۔ کیونکہ نفس اس کا مطالبہ کرتا ہے اور بندے کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیرے لیے رزق اور غذا ضروری ہے۔ اگر تو دنیا سے کنارہ کش ہو گیا اور مخلوق سے علیحدگی اختیار کر لی تو تیری غذا اور رزق کہاں سے مہیا ہو گا۔

دوسرا عارضہ، وہ خطرات و خیالات ہیں جو بندے کے دماغ میں ہر اس چیز کے متعلق پیدا ہوتے

ہیں جس سے انسان ڈرتا ہے یا جس چیز کی اُمید رکھتا ہے۔ جسے پسند یا ناپسند تصور کرتا ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ اس کام میں میرے لیے بھلائی ہے یا خرابی۔ کیونکہ اُمورِ دنیا کے نتائج پوشیدہ ہیں۔ تو بندہ انہی خیالات میں کھو جاتا ہے اور بسا اوقات پراگندہ خیالی کے باعث ہلاکت و تباہی میں جا پڑتا ہے۔

یکسوئی سے عبادت کرنے میں تیسرا عارضہ یہ ہے کہ بندہ جب خلوصِ قلب سے عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو چاروں طرف سے دُنیوی مصائب و تکالیف اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ بندہ خلق سے علیحدگی، شیطان سے جنگ اور نفس کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ تو ان مصائب و مشکلات کو برداشت کرتے وقت کس قدر غصہ پینا پڑتا ہے اور کیسی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں، اور کتنے حزن و ملال میں گھلنا پڑتا ہے، اور کیسی کیسی بھیانک مصیبتیں آتی ہیں۔

عبادت کے سلسلے میں چوتھا عارضہ قضائے خداوندی ہے۔ جو مختلف نوعیتوں میں بندے پر وارد ہوتی ہے یعنی کبھی آرام، کبھی تکلیف۔ اور بندے کا نفس طبعاً شرارت و فتنے کی طرف مائل ہے۔ غصہ میں جلدی آجاتا ہے۔ تو عبادت میں یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ان چار مندرجہ بالا عوارض کی گھاٹی بھی عبور کرنا پڑتی ہے۔

یہ عوارض اربعہ چار چیزوں کے ذریعہ دفع ہو سکتے ہیں:

(۱) رزق کے معاملہ میں خدا تعالیٰ پر توکل کرے۔

(۲) خیالات و تفکرات کے ہجوم کے وقت اپنے معاملے کو رب کے حوالے کرے۔

(۳) تکالیف و مصائب پیش آنے پر صبر کرے۔

(۴) قضائے الٰہی پر راضی رہے۔

جب بندہ اللہ تعالیٰ کے اذن، اس کی تائید اور نصرت سے ان عوارض اربعہ کو قطع کر کے عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اپنے اندر نظر کرنے سے محسوس کرتا ہے کہ میرا نفس نیک کام کرنے میں بے حس، بے رغبت اور بہت سُست ہے۔ نیک کام کرنے کی اس میں کبھی سچی چاہت پیدا نہیں ہوتی اور نیکیوں کی طرف جس طرح راغب ہونا چاہیے راغب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا زیادہ تر رجحان غفلت، نیکیوں سے نفرت، آرام طلبی، لغو، بیہودہ اور جاہلانہ باتوں کی طرف رہتا ہے۔ اس لیے ایک ایسی چیز کی ضرورت

پڑتی ہے جو نفس کو ان خرابیوں سے روکے۔ اور ایسی شے کی ضرورت پڑتی ہے جو اسے امورِ خیر کی طرف راغب کرے۔ اور عبادت کی محبت اور شوقِ عبادت اس میں پیدا کرے۔

تو خرابیوں سے روکنے والی اور نیکیوں کی طرف متوجہ کرنے والی دو چیزیں خوف و رجاء ہیں۔

رجاء تو یہ ہے کہ بندہ طاعت و عبادت کے سلسلے میں بہت بڑے ثواب کی امید رکھے اور اللہ تعالیٰ نے جو جنت کی عمدہ عمدہ نعمتیں عطا کرنے کے اس سے وعدے کیے ہیں ان پر اعتماد اور یقین کرے۔ ثوابِ عظیم کی امید اور جنت میں عمدہ عمدہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا یقین، بندے کے لیے نیک کام کرنے کا باعث و ذریعہ بنتا ہے۔ طاعات کی ترغیب دیتا ہے اور دل میں اعمالِ صالحہ کی تحریک پیدا کرتا ہے، اور عبادت کے جذبے کو بیدار کرتا ہے۔

اور خوف یہ ہے کہ انسان ہر وقت رب تعالیٰ کے دردناک عذابوں سے ڈرتا رہے اور ان سزاؤں اور عذابوں کا تصور ذہن میں رکھے جو نافرمانی اور گناہ کرنے والوں کو دیے جائیں گے۔ ایسا خوف جب بندے کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو بندہ اس خوف کے باعث گناہوں سے باز رہتا ہے۔ اور دل میں گناہوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ خوف و رجاء بندے کو عبادت پر اُبھارتے ہیں اس لیے اس گھاٹی کا نام عَقَبَۃُ الْبَوَاعِثْ رکھا گیا ہے۔

جب بندہ خوف و رجاء کی مندرجہ بالا گھاٹی اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی امداد و اعانت سے عبور کر لیتا ہے اور اصل مقصود یعنی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اب اسے یکسوئی اور دل جمعی سے عبادت کرنے میں کوئی چیز مانع اور عارض نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنے اندر ایسے اوصاف پاتا ہے اور ایسے جذبات محسوس کرتا ہے جو اسے عبادت کی طرف ترغیب اور طاعت و اعمالِ صالحہ کی دعوت دیتے ہیں۔ تو اب اسے عبادت کرتے وقت نشاط و سرور اور لذت و راحت حاصل ہوتی ہے اور عبادت پر دوام نصیب ہوتا ہے۔ مگر یکایک دورانِ عبادت دو اور بڑی آفتیں سر نکالتی ہیں۔ ایک ریا، دوسری عُجب۔ یعنی اپنے متعلق نیک اور پارسا ہونے کا خیال۔ چنانچہ کبھی تو اپنی عبادت کو اس طرح خراب اور تباہ کرتا ہے کہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ اور کبھی اپنے آپ کو نیک اور پاکیزہ خیال کر کے اپنی نیکیاں ضائع کر دیتا ہے۔ اس لیے اب اسے یہ گھاٹی عبور کرنی پڑتی ہے اور اسے عَقَبَۃُ الْقَوَادِحِ کہتے ہیں۔ چنانچہ عبادت میں اخلاص اور رب تعالیٰ کے گوناگوں احسانات کو ذہن میں ملحوظ رکھتے ہوئے بندہ اس مشکل گھاٹی کو بھی خدا

کے فضل وکرم، اس کے اذن اور اس کی رحمت سے پوری احتیاط اور دانش مندی کے ساتھ عبور کرتا ہے تاکہ اس کی نیکیاں ریا و عُجب وغیرہ جیسی آفتوں سے سالم و محفوظ رہیں۔

جب ان مندرجہ بالا دشوار گزار گھاٹیوں سے گزر جاتا ہے تو اب کما حقہٗ عبادت بجا لانے کے قابل ہوتا ہے، اور اب اس کی بندگی تمام عیوب و نقائص سے پاک ہوتی ہے۔ لیکن پھر جب بندہ اپنے حالاتِ زندگی پر نظر کرتا ہے تو اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے بے شمار احسانات، بے شمار عطاؤں اور قسم قسم کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔ مثلاً عبادت اور ان مشکل گھاٹیوں کو عبور کرنے کی توفیق، مضرت رساں چیزوں سے حفاظت، دوسری مخلوقات پر عظمت و بزرگی وغیرہ وغیرہ۔ تو ان احسانات اور نعمتوں کو یاد کر کے اس کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے کہ کہیں میں ان کے شکر سے غافل نہ ہو جاؤں، اور کفرانِ نعمت کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں، اور کفرانِ نعمت کے باعث کہیں اس کے مخلص خُدام کے بلند رتبہ سے گر نہ جاؤں، اور ناشکری کرنے سے یہ نعمتیں مجھ سے کہیں چھن نہ جائیں، اور میں اللہ تعالیٰ کی نظرِ کرم اور اس کے الطافِ کریمانہ سے محروم نہ ہو جاؤں۔ تو اس لیے حمد و شکر کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور کثرتِ ذکر و شکر کے ذریعہ اس عَقَبَۃُ الْحَمْدِ وَالشُّکْرِ کو عبور کرتا ہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے آپ کو مقصود کے قریب اور اپنے مطلوب کو سامنے پاتا ہے۔

چنانچہ اس کے بعد مسافت طے کرنے سے بندہ اللہ تعالیٰ کے الطاف کی نرم زمین اور شوق و محبت کے میدان میں جا پہنچتا ہے۔ پھر رضاء کے باغات، اُنس کے گلستان اور روحانی فرحتوں کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اب اسے خدا کا قربِ خاص عطا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنے والوں کی مجلس میں جگہ پا لیتا ہے، اور اس کی طرف سے خاص انعامات و اکرامات سے مشرف ہوتا ہے تو بندہ ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اور اپنی عمر کے بقیہ ایام روحانی راحت و سرور میں بسر کرتا ہے۔ یہاں تو ظاہری جسم کے اعتبار سے آرام پاتا ہے اور آخرت میں روحانی اعتبار سے۔

ایسا انسان ہر وقت پیغامِ الٰہی یعنی اس دنیا سے کوچ کرنے کا منتظر رہتا ہے۔ اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ موت کا مشتاق رہتا ہے اور ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ ملحق ہونے کا خواہشمند رہتا ہے۔ چنانچہ خدا کے قاصد اچانک اس کے پاس جنت کی خوشخبری اور جنت کے فرشتے جنت کی خوشبوئیں لے کر آنا شروع ہو جاتے ہیں، اور اس کی پاک رُوح

مسرت انگیز بشارت اور کامل اُنس و پیار کے ساتھ اس دار فانی سے جنت کے باغات کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ وہاں یہ مومن اپنی ضعیف وحقیر جان کے لیے دائمی نعمتیں اور بہت بڑا ملک پاتا ہے اور فضل وکرم کرنے والا مہربان رب اسے مرحبا کہتا ہے۔ اپنا قرب خاص عطا کرتا ہے، اور انعام و اکرام کرتے ہوئے اس سے ملاقات کرتا ہے۔ یہ مومن بندہ وہاں ایسے انعامات سے نوازا جاتا ہے جن کے بیان سے بیان کرنے والے عاجز ہیں۔ اور صفت کرنے والے جن کی صفت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس کو ہمیشہ نئی نئی اور اعلیٰ اعلیٰ اور عمدہ عمدہ نعمتیں عطا ہوتی رہیں گی۔

تو ایسے انسان کو کتنی بڑی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اور یہ مومن کتنی بڑی دولت کا مالک بن جاتا ہے اور کتنی عظیم کامیابی حاصل کر لیتا ہے، اور کیسی بلند شان کا حامل بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کو ہزار ہزار مبارک۔ کیونکہ اس کا انجام بہت اچھا ہے —— ہم بھی دربار ایزدی میں التجا کرتے ہیں کہ ہم پر بھی یہ احسان عظیم فرمائے، اور ہمیں بھی اس نعمت عظمیٰ سے نوازے —— اور رب تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں۔

ہم دربارِ خداوندی میں یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے نہ کرے جن کو اس احسانِ عظیم سے زبانی بیان، صرف سننے، سرسری علم اور وقتی آرزو کے سوا حالی طور پر کوئی حصہ نہیں ملا۔ ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ قیامت کے روز ہمارا علم ہم پر حجت نہ بنے۔ اور اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق دے اور پھر عمل میں استقامت دے۔ وہی سب سے بہتر رحم و کرم کرنے والا ہے —— اور ہمارے حضور، دونوں جہان کے سردار محمد رسول اللہ پر لاتعداد صلوٰۃ وسلام نازل ہو، اور آپ کے اصحاب اور آپ کی آل پر بھی۔ اور اللہ تعالیٰ انہیں زیادہ سے زیادہ شرف وعزت عطا فرمائے۔

یہ ہے اس کتاب کی ترتیب، جو میرے مولیٰ نے عبادت کے سلسلے میں مجھے الہام فرمائی۔

اے عزیز از جان! اب تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ جان کہ کل سات گھاٹیاں بنتی ہیں۔ پہلی علم کی۔ دوسری توبہ کی۔ تیسری عوائق و موانع کی۔ چوتھی عوارض کی۔ پانچویں بواعث یعنی عبادت پر ابھارنے والی چیزوں کی۔ چھٹی قوادح یعنی ان چیزوں کی جو عبادت میں خرابی پیدا کرتی ہیں۔ ساتویں حمد وشکر کی۔ اس کتاب منہاج العابدین میں انہی سات عقبات کا ذکر ہے۔

اب ہم ہر ایک کی اس طرح شرح کرتے ہیں کہ الفاظ تو مختصر ہوں مگر تمام ضروری نکتے بیان بھی ہو جائیں۔ ہم ہر ایک کی شرح علیحدہ علیحدہ باب میں کریں گے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی توفیق کا دینے والا ہے، اور اس کے کرم سے ہی بیان وعمل میں درستی برقرار رہ سکتی ہے ——— وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

پہلی گھاٹی علم کے بیان میں

میں اللہ کی توفیق سے کہتا ہوں کہ اے اخلاص کی آرزو کرنے والے، اور اے سچی عبادت کی طلب کرنے والے! اللہ تعالیٰ تجھے امورِ خیر کی توفیق دے۔ سب سے اول تجھ پر یہ لازم ہے کہ علم شریعت حاصل کرے کیونکہ یہ عبادت کا موقوف علیہ ہے اور اسی پر اس کا دارومدار ہے۔ اور تو جان لے کہ علم اور اس کے مطابق عبادت دو ایسے کمال ہیں کہ مصنفین کی تصنیفات، معلمین کی تعلیمیں، واعظین کے وعظ، مفکرین کی نظر وفکر وغیرہ، جو بھی تم دیکھ یا سن رہے ہو، سب کچھ اس علم وعمل میں کمال حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ بلکہ انزالِ کتب، بعثتِ انبیاء، ساتوں آسمانوں اور زمینوں اور ان کی درمیانی مخلوق کی پیدائش بھی اسی لیے ہے۔ تم قرآن مجید کی ان دو آیتوں پر تو ذرا غور کرو:

(۱) اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہی کے برابر زمینیں۔ اللہ کا حکم ان کے درمیان اترتا ہے تاکہ جان لو کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

صرف یہی ایک آیت فضیلتِ علم کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ خاصکر علم توحید کے لیے:

(۲) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہ آیۂ کریمہ شرافتِ عبادت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ بندے

پر اپنے رب کی بندگی لازم ہے۔ تو اس علم و عبادت کو ہی سب سے زیادہ عظمت والی چیز تصور کرنا چاہیے کیونکہ پیدائش کائنات سے مقصود انہی دو چیزوں میں کمال حاصل کرنا ہے۔ اس لیے بندے کو چاہیے کہ انہی دو کے ساتھ مشغول رہے۔ انہی دو کے حصول کے لیے مشقتیں برداشت کرے، اور انہی دو میں غور و فکر کرتا رہے۔

اے عزیز! تو یقین کر کہ ان دو کے سوا جو کچھ دنیا میں ہے سب باطل ہے کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور ان کے علاوہ جو کچھ ہے لغویات ہے جس سے کچھ حاصل نہیں۔ جب تیرے ذہن میں علم و عبادت کی اہمیت آگئی تو اب یہ بات سمجھ کہ علم عبادت سے افضل و اشرف ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنٰى رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِيْ۔

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری اپنے ادنیٰ اُمتی پر۔

ایک جگہ آپ نے فرمایا:

نَظْرَةٌ اِلَى الْعَالِمِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا۔

عالم کی طرف ایک بار نظر میرے نزدیک سو برس روزے رکھنے اور سو برس رات کو نوافل پڑھنے سے بہتر ہے۔

ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

اَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى اَشْرَفِ اَهْلِ الْجَنَّةِ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ هُمْ عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ۔

کیا میں تمہیں سب سے زیادہ بلند مرتبہ والے جنتی نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ بتائیے تو آپ نے فرمایا کہ وہ میری اُمت کے علماء ہیں۔

مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ عبادت سے علم افضل ہے۔ لیکن علم کے ساتھ ساتھ عبادت بھی ضروری ہے۔ بغیر عبادت علم کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ علم درخت کی مانند ہے اور عبادت پھل کی طرح۔ اور درخت کی قدر پھل سے ہوتی ہے، اگرچہ درخت اصل ہے۔ لہٰذا بندے کے لیے علم و عبادت دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "علم کو اس طرح حاصل کرو کہ عبادت کو نقصان نہ دے۔ اور عبادت اس طرح کرو کہ علم کو نقصان نہ ہو۔" اور یہ بڑی پختہ

بات ہے کہ علم و عبادت دونوں ضروری ہیں۔ مگر پہلے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ علم عبادت کی بنیاد اور اس کا رہنما ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْعِلْمُ اِمَامُ الْعَمَلِ وَالْعَمَلُ تَابِعُهٗ۔ علم عمل کی بنیاد ہے اور عمل اس کے تابع ہے۔

علم کا عبادت کی اصل ہونا اور اسے عبادت سے پہلے حاصل کرنا دو وجہ سے ضروری ہے:

ایک اس لیے تاکہ بندہ رب کی عبادت کر سکے اور اس عبادت کو تمام عیوب و نقائص سے محفوظ رکھ سکے۔ کیونکہ بندے پر لازم ہے کہ پہلے اپنے معبود کو پہچانے اور پھر اس کی عبادت میں مصروف ہو۔ اور بندہ اپنے معبودِ برحق کی عبادت کر ہی کیسے سکتا ہے جبکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس معبود کے نام کیا ہیں۔ اس کی صفتیں کیا ہیں، اور کون سی چیزیں اس کی شان کے لائق ہیں اور کون سی باتیں اس کی شان کے خلاف ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جہالت کی بنا پر بندہ اپنے معبودِ برحق کے لیے ایسی صفتوں پر اعتقاد رکھتا ہے جو قطعاً اس کی شان کے لائق نہیں ہوتیں۔ اور اس سوءِ اعتقادی کے باعث عبادت ضائع ہو جاتی ہے۔ ہم نے اس عظیم خطرے کی پوری طرح شرح اپنی کتاب احیاء العلوم کے باب سُوءِ خاتمہ میں کر دی ہے۔

پھر اے عزیز! تجھ پر لازم ہے کہ ان تمام فرائض و واجبات شرعیہ کا علم حاصل کرے جن کا تجھے حکم دیا گیا ہے تاکہ انہیں صحیح طور پر ادا کر سکے۔ اور ان تمام امور کا بھی علم حاصل کرے جو نا جائز اور خلاف شرع ہیں، تاکہ ان سے بچ سکے۔ ورنہ جب تک طاعت و عبادت کی حقیقت، نوعیت اور کیفیتِ ادا معلوم نہ ہو، اس کی صحیح بجا آوری کیسے ہو سکتی ہے۔ اور جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ یہ چیزیں گناہ ہیں اس وقت تک کیسے ان سے پرہیز ہو سکتا ہے؟

اس لیے پہلے عبادات شرعیہ جیسے طہارت، نماز، روزہ وغیرہ کی حقیقت، ان کے جملہ احکام اور ان کی تمام شرائط معلوم کرنا ضروری ہیں۔ اور پھر ہی درست طریقہ سے ان کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ بے علمی کے سبب بہت ممکن ہے کہ انسان برسوں اور مدتوں ایک ایسے عمل کو نیک خیال کر کے کرتا رہے، جو درحقیقت اس کی طہارت اور اس کی نمازوں کو خراب کر رہا ہو۔ بلکہ طہارت اور نمازیں خلاف سنت طریقہ پر ادا ہوتی رہیں۔ اور کرنے والے کو بالکل علم نہ ہو۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش آئے تو نہ تو وہ خود دیکھا ہو اور نہ ہی بروقت اسے حل کرنے والا کوئی ملے تو وقت

ہو گی۔

پھر ظاہری عبادات وطاعات کی قبولیت کا دارو مدار باطنی اخلاق فاضلہ پر ہے جو دل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔ جیسے توکل کی حقیقت، تفویض، رضا، صبر، توبہ اور اخلاص وغیرہ کے معانی، جن کا مفصل ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ ابھی آئے گا۔ ان کے ساتھ ساتھ ان امور کے معانی کا جاننا بھی ضروری ہے جو باطن کے عیوب ہیں اور جو توکل، صبر اور رضا وغیرہ کی ضد ہیں۔ جیسے غصہ، طول اَمَل، ریا اور تکبر وغیرہ۔ کیونکہ ان خصائل رذیلہ سے بچنا بھی لازم اور ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اخلاق فاضلہ پیدا کرنے اور خصائل رذیلہ کو دور کرنے کا حکم اپنی کتاب میں واضح طور پر دیا ہے۔ توکل کے متعلق فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ — اور اللہ پر ہی بھروسہ کرو اگر تم ایماندار ہو۔

شکر کے متعلق فرمایا:

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ — اور اپنے رب کا شکر کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

صبر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۝ — صبر کرو، اور تم اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے صبر کر سکتے ہو

تفویض کے متعلق یوں ارشاد فرمایا:

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ — تمام سے علیحدہ ہو کر صرف اسی کے لیے ہو جاؤ۔

اسی طرح اور بھی کئی آیات ہیں جن میں اخلاق فاضلہ سے متصف ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ تو جس طرح نماز، روزہ وغیرہ ظاہری احکام وفرائض آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہیں، اسی طرح توکل، رضا اور صبر وغیرہ بھی قرآن پاک کی آیات سے ثابت ہیں۔

تو جب توکل وغیرہ بھی لازم وضروری ہیں تو صرف نماز روزہ وغیرہ پر ہی سارا زور دینا اور عمدہ اخلاق کا حامل نہ بننا درست نہیں۔ کیونکہ دونوں قسم کے ظاہری وباطنی احکام کے متعلق ایک ہی رب نے ایک ہی کتاب میں حکم دیا ہے۔ مگر تم باطنی اوصاف سے مطلقاً بے خبر ہو چکے ہو اور ایسے لوگوں کے لیے فتوے لکھنے میں مصروف ہو جنہوں نے دنیا کو ہی کعبۂ مقصود ٹھہرا لیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے نیکی

کو بُرائی کا اور بُرائی کو نیکی کا درجہ دے دیا ہے۔ افسوس! تم ایسے لوگوں کے لیے فتویٰ نویسی میں مشغول ہو کر ان پاکیزہ علوم سے بے پرواہ ہو گئے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں نور، حکمت، اور ہدایت وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تم ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کہتے جنہوں نے کسب حرام کو پیشہ بنا لیا ہے اور جو رات دن ذلیل دنیا جمع کرنے میں مصروف ہیں۔

اے بھلائی کے دعویدارو! تمہیں اس کا خوف نہیں کہ بڑے بڑے فرائض کو تو پس پشت ڈال رہے ہو اور نفل نماز روزہ وغیرہ میں مشغول ہو۔ فرائض سے تارک ہو کر نوافل ادا کرنے والو! ان نوافل کی کوئی وقعت نہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم ایسے گناہ پر قائم ہوتے ہو جو تمہیں دوزخ میں ڈال دے مگر مباح کھانے پینے اور نیند وغیرہ سے بچتے رہتے ہو، جو عبادت میں تم کو تقویت دیتے ہیں۔ تو تمہارا ایسا پرہیز بے معنی اور فضول ہے۔ اور ان تمام سے بدتر یہ ہے کہ تم دنیوی امیدوں میں مبتلا ہو حالانکہ دنیا کی امیدیں محض گناہ ہیں۔ اور جہالت کی بنا پر تم ان امیدوں کو نیتِ خیر گمان کرتے ہو، کیونکہ تم ان دونوں کے فرق سے جاہل ہو۔ تم دنیوی اُمیدوں اور نیتِ خیر میں اس لیے بھی فرق نہیں کر سکتے کیونکہ یہ دونوں بظاہر ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

بعض اوقات تم بے چین ہوتے ہو اور جزع فزع وغیرہ کرتے ہو، اور اسے اللہ تعالیٰ کے دربار میں گڑگڑانا اور عاجزی کرنا خیال کرتے ہو۔ اور کبھی تم محض ریا کر رہے ہوتے ہو مگر تمہارا گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم اللہ کی حمد کر رہے ہیں اور لوگوں کو نیکی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس طرح تم گناہوں کو نیکیاں اور عذاب کو ثواب سمجھنے لگ جاتے ہو اور ایک بہت بڑے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہو اور سخت خرابی میں پڑ جاتے ہو۔ تو خدا کی قسم بغیر علم عمل کرنے والوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہی ہے۔

اور پھر ظاہری اعمال کا باطنی اوصاف کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ اگر باطن خراب ہو تو ظاہری اعمال بھی خراب ہوں گے۔ اور اگر باطن حسد، ریا اور تکبر وغیرہ عیوب سے پاک ہو تو ظاہری اعمال بھی درست ہوتے ہیں۔ اگر دل میں اخلاص ہو گا تو ظاہری عمل بھی ٹھیک ہو گا۔ اور اگر باطن میں ریا ہو تو ظاہری عمل بھی نادرست ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی اپنے اعمالِ صالحہ کو رب تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر انہیں اپنا ذاتی کمال تصور کرے تو خودستائی کے باعث وہ اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب تک باطنی امور کا ظاہری اعمال سے تعلق، باطنی اوصاف کی ظاہری

اعمال میں تاثیر اور اوصاف باطنی کے ذریعہ ظاہری اعمال کی حفاظت کی کیفیت وغیرہ کا پتہ نہ چلے ظاہری اعمال بھی درست نہیں ہو سکتے۔ اور جہالت و بے علمی کے باعث نہ تو ظاہری اعمال میں درستی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی باطنی اخلاق فاضلہ یا خصائل رذیلہ کا پتہ چل سکتا ہے۔ اور عمل کرنے والے کے ہاتھ میں سوائے مشقت اور میل کچیل کے کچھ نہیں آتا۔ اور یہی سب سے بڑا خسارہ اور نقصان ہے۔

اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے علم کی شان میں فرمایا:

اِنَّ نَوْمًا عَلٰی عِلْمٍ خَیْرٌ مِّنْ صَلٰوۃٍ عَلٰی جَھْلٍ۔ — عالم کا سونا جاہل کی نماز سے بہتر ہے۔

کیونکہ علم کے بغیر عمل کرنے والے کے اعمال اکثر اوقات بجائے درستی اور ثواب کے خراب اور باعث عذاب بن جاتے ہیں۔ علم کی شان میں حضور نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا

اِنَّہٗ یُلْھِمُہُ السُّعَدَآءَ وَیُحْرَمُہُ الْاَشْقِیَآءُ۔ — علم سعادت مندوں کو نصیب ہوتا ہے اور شقی لوگ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بے علم کی شقاوت یہ ہے کہ اس نے علم تو سیکھا نہیں ہوتا خالی عبادت کی مشقت اور وقت اُٹھاتا ہے۔ تو ایسی عبادت سے سوائے جسمانی مشقت کے کچھ ثواب وغیرہ نہیں ملتا۔ باعمل اور زاہد علماء چونکہ علم و عمل کے جامع ہوتے ہیں اس لیے ان کا درجہ خدا تعالیٰ کے ہاں باقی تمام لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے' اور علم ہی اس بلندئ مرتبہ کی اصل ہے۔ کیونکہ علم طاعت و عبادت کا موقوف علیہ ہے' اور اسی پر اعمال کا دارومدار ہے۔ اہل بصیرت اور اصحاب توفیق و تائید نے یوں ہی اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اور وہ پوری طرح اس معاملہ کی تہ کو پہنچے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عبادت نہ تو علم کے بغیر کی جا سکتی ہے' اور نہ ہی سالم رہ سکتی ہے۔ تو ثابت ہو گیا کہ صحیح طریقہ سے عبادت بجالانے کے لیے پہلے علم حاصل کرنا لازم اور ضروری ہے۔

عبادت سے علم کے مقدم ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ علم سے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی ہیبت پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ — اللہ کا خوف علماء کے دلوں میں ہی ہے۔

یہ اس لیے کہ جس کو خدا تعالیٰ کی معرفت نہیں ہوتی اس کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا شخص صحیح معنوں میں رب تعالیٰ کی تعظیم و طاعت بجالا سکتا ہے۔ تو علم سے ہی رب کی معرفت اور پہچان ہوگی اور علم کے ذریعہ ہی اس کی عظمت و ہیبت دل میں بیٹھے گی پس علم سے ہی تمام طاعات و عبادات کا پھل ملتا ہے۔ اور علم کے باعث ہی انسان ہر قسم کی معصیت سے بچ سکتا ہے۔ اور یا پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے۔ اور عبادت سے مقصود بھی تو یہ دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک اس کی معرفت اور دوسری دل میں اس کا خوف اور ہیبت۔ اس لیے اسے راہ آخرت کے سالک! سب سے اول تیرے لیے علم حاصل کرنا لازم اور ضروری ہے۔ اور اللہ ہی توفیق کا مالک ہے۔ ہر وقت یہ دُعا کرتی چاہیے کہ اس کا فضل اور اس کی رحمت سب کے شامل حال رہے۔

شاید تم کہو کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ۔ علم کی تلاش ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

تو وہ کون سا علم ہے جس کی تلاش لازم اور ضروری ہے، اور درستی عبادت کے لیے کتنے علم کی ضرورت ہے؟ تمہارے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن علوم کی طلب فرض ہے وہ تین علم ہیں:

(۱) علم توحید (۲) علم سر یعنی جس علم کا تعلق دل اور دل کے متعلقات سے ہے۔ (۳) علم شریعت لیکن ان تین علوم سے اتنی مقدار لازم اور ضروری ہے جس سے لازم و ضروری امور کی پوری پوری معرفت و یقین ہو جائے۔

علم توحید سے اتنا ضروری ہے جس سے دین کے اصول معلوم ہو جائیں۔ وہ اصول یہ ہیں کہ:۔

تمہیں یہ معلوم ہو کہ ہمارا ایک معبود برحق ہے، جو ہر شے کو جانتا ہے۔ اور تمام ممکنات پر اس کی قدرت حاوی ہے۔ جو چاہے ارادہ کرتا ہے۔ ہمیشہ زندہ ہے۔ ازل سے متکلم ہے۔ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ تمام صفات کمالیہ سے ازلاً ابداً متصف ہے۔ ہر عیب و نقص سے منزہ و پاک ہے۔ اس پر کبھی زوال نہیں آسکتا۔ امکان کے شائبے سے پاک ہے۔ اور قدیم بھی صرف وہی ہے۔

اور یہ بھی یقین کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اور رسول

ہیں، اور جو احکام آپ خدا کی طرف سے لائے سب حق ہیں۔ اور آخرت کے بارے میں جو خبریں آپ نے دی ہیں سب حق ہیں۔ پھر ان تمام احکام و مسائل کو بھی معلوم کرے جو سنت ہیں۔ تاکہ خلاف شرع کاموں اور بدعات سے محفوظ رہے۔ اس لیے کہ بدعت میں مبتلا ہو کر انسان سنت کی پیروی سے محروم ہو جاتا ہے اور دین خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

دلائل توحید کے اصول و کلیات کتاب اللہ میں موجود ہیں، اور ہمارے مشائخ نے اصول دیانات کی کتابوں میں ان دلائل کو وضاحت سے لکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز سے جاہل رہ کر گمراہی میں پڑنے کا خطرہ ہو اس کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ علم کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرو۔ اور توفیق اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اور علم سِر سے اس قدر جاننا ضروری ہے جس سے صفائی قلب کے اسباب معلوم ہو جائیں۔ اور یہ معلوم ہو جائے کہ کس کس چیز سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے تاکہ دل میں اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور تعظیم اور اعمال میں اخلاص پیدا ہو۔ نیز ان امور کو جاننا بھی ضروری ہے جن سے نیت درست رہ سکے۔ اور ظاہری و باطنی اعمال و عبادات، ظاہری و باطنی آفات سے محفوظ رہ سکیں۔ اور ان سب امور کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری اس کتاب میں آئندہ آئے گا۔

اور علم شریعت سے اس قدر جاننا ضروری ہے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ امور ضروری ہیں۔ تاکہ انہیں ادا کیا جا سکے۔ جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ مگر حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ کے احکام و مسائل ان کو جاننے لازم ہیں جن پر یہ فرض ہوں۔ اور جن پر یہ چیزیں فرض نہیں ان پر ان کی جزئیات اور ان کی تفصیلات جاننا لازم نہیں —— ان تین علموں سے بس اتنا جاننا لازم و ضروری ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے

سوال:

کیا علم توحید میں ان تفصیلات و دلائل کا معلوم کرنا بھی ضروری ہے جن سے مذاہب باطلہ کی تردید ہو سکے، اور جن سے حقانیت اسلام ان پر ثابت کی جا سکے، اور جن دلائل سے تمام بدعات کو باطل ثابت کیا جا سکے، اور سُنن نبویہ کی حقانیت واضح کی جا سکے؟

جواب:

اے عزیز! ان تمام تفاصیل کا جاننا فرض کفایہ ہے یعنی تمام پر لازم نہیں۔ ہاں تم پر اتنا

جاننا ضروری ہے جس سے تمہارے عقائد درست رہ سکیں اور بس۔ تم پر یہ لازم نہیں کہ علم توحید کی تمام فروعات اور اس کی باریکیاں اور دیگر متعلقہ امور کو جانو۔ ہاں اگر کہیں دین کے بنیادی مسائل میں تمہیں شبہ لاحق ہو یا لاحق ہونے کا خوف ہو تو مختصر گفتگو سے کسی دوسرے شخص سے یہ شبہ حل کرا سکتے ہو۔ مگر جھگڑے و جدال وغیرہ سے ہمیشہ پرہیز کرو۔ کیونکہ جھگڑا و جدال ایک مہلک مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں اس لیے ہمیشہ اس سے بچو۔ کیونکہ جو شخص اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی شامل حال نہ ہو تو اس کا محفوظ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پھر اے عزیز! یہ بھی جان لے کہ جب دنیا کے ہر علاقے میں اہل سنت وجماعت کے مبلغین علماء موجود ہیں جو گمراہ فرقوں کے رد میں مصروف ہیں اور وہ اس فن تردید میں ٹھوس معلومات کے مالک بھی ہیں اور گمراہوں کے وساوس و شبہات سے اہل حق کے سینوں کو پاک کرتے رہتے ہیں۔ تو تمہارے ذمے سے ان تفصیلات میں پڑنا ساقط ہو گیا۔

اسی طرح علم سِر کے دقائق معلوم کرنا بھی ضروری نہیں۔ اور نہ ہی تمام عجائب قلب کی تہ تک پہنچنا لازم ہے۔ صرف اس قدر معلومات ضروری ہیں جن سے عبادت کو ہر قسم کے عیوب و نقائص سے محفوظ رکھا جا سکے، اور جن کے ذریعہ عبادات کو مکمل طریقہ سے ادا کیا جا سکے۔ جیسے اخلاص، حمد، شکر اور توکل وغیرہ کی حقیقت۔ اس کے علاوہ زائد معلومات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح علم شریعت کے اندر تمام بیع، شراء، اجارہ، نکاح، طلاق اور جنایات وغیرہ کے مسائل سیکھنے بھی تمام پر لازم نہیں۔ بلکہ ان تفصیلات کا علم بھی فرض کفایہ ہے۔

سوال:

کیا علم توحید کی ضروری معلومات استاد سے سیکھے بغیر صرف اپنی نظر و فکر سے حاصل ہو سکتی ہیں؟

جواب:

اس سلسلے میں اُستاد سے استعانت ضروری ہے۔ کیونکہ وہ مشکل مقامات کو واضح کرتا ہے اور علمی پیچیدگیوں کو آسان کرتا ہے۔ اس کی رہنمائی میں انسان علوم کی تحصیل آسانی و سہولت سے کر سکتا ہے۔ اور جس شخص پر خدا کا خاص احسان ہوتا ہے اُسے ہی دین کے معلم بننے کا شرف عطا ہوتا ہے۔

پھر اے عزیز! تو یہ بھی جان لے کہ علم کی گھاٹی اگرچہ بہت سخت گھاٹی ہے مگر اس کے بغیر مطلوب و مقصود کا حصول بھی ناممکن ہے۔ اور اگرچہ اس کا نفع بہت ہے مگر اس گھاٹی سے گزرنا بھی دشوار ہے اور اس میں بڑے بڑے خطرات ہیں۔ کتنے ہی ایسے ہیں جنہوں نے علم حاصل نہ کیا تو گمراہ ہو گئے۔ اور کتنے ہی ایسے ہیں جو اس راہ پر چلے مگر راستے میں پھسل گئے۔ اور اس میں کتنے ہی گھومنے والے حیرانی کا شکار اور ہزاروں اس راستے پر چلنے والے لاپتہ ہو گئے۔ اور کتنے ہی ایسے ہیں جو اس گھاٹی کو طے کرنے کے درپے ہوئے تو اللہ کی امداد سے تھوڑے ہی وقت میں منزل مقصود پر جا پہنچے۔ اور بعض وہ ہیں جو ستر سال سے اس منزل کو طے کرنے میں مصروف ہیں ——— اور ہر چیز کا اختیار درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے علم کا نفع بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ بندہ عبادت کے معاملہ میں علم کا سخت محتاج ہے۔ اور عبادت کی دیوار علم پر ہی قائم ہوتی ہے۔ خاص کر علم توحید و علم سِر پر۔ علم کے متعلق یہ روایت آئی ہے کہ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی فرمائی کہ:

يَا دَاوُدُ تَعَلَّمِ الْعِلْمَ النَّافِعَ فَقَالَ دَاوُدُ وَمَا الْعِلْمُ النَّافِعُ فَقَالَ اَنْ تَعْرِفَ جَلَالِي وَعَظَمَتِي وَكِبْرِيَائِي وَكَمَالَ قُدْرَتِي عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاِنَّ هٰذَا الَّذِي يُقَرِّبُكَ اِلَيَّ۔	اے داؤد! علم نافع حاصل کر۔ آپ نے عرض کیا نافع علم کونسا ہے؟ تو رب تعالیٰ نے فرمایا علم نافع وہ ہے جس سے تجھے میرے جلال، میری عظمت، میری بڑائی اور ہر شے پر میری کمال قدرت کا پتہ چلے کیونکہ ایسا علم ہی تجھے میرے قریب کر سکتا ہے۔

اور سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میں نابالغی میں ہی فوت ہو جاتا اور جنت میں داخل کر دیا جاتا اور بڑا ہو کر خدا کی معرفت حاصل نہ کرتا۔ اور یہ اس لیے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت زیادہ ہو گی اس میں خدا کا خوف بھی زیادہ ہو گا۔ اور جس کو خوف زیادہ ہو گا وہ عبادت زیادہ کرے گا۔ اور جو عبادت زیادہ کرے گا اس کا تعلق بھی اللہ کے ساتھ زیادہ خالص ہو گا۔

لیکن علم حاصل کرتے وقت سب سے زیادہ خلوص کو نگاہ رکھنا چاہیے۔ اور روایت کی نسبت درایت کو زیادہ طلب کرنا چاہیے۔ کیونکہ علم میں خطرات بھی بہت ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص اس غرض سے علم حاصل کرے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں اور علم کے ذریعہ اُمراء کی ہمنشینی حاصل ہو۔ اور تا کہ علم کے سبب بحث و مناظرہ کرنے والوں کے سامنے فخر و شیخی کرے اور ذلیل دنیا کو جمع کرے تو ایسے شخص کی نیت فاسد ہے اور اس کی یہ تجارت تباہ اور اس کا یہ دین نقصان دہ ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُفَاخِرَ الْعُلَمَاءَ اَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ لِيَصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ۔ (مشکوٰۃ)	جو شخص اس لیے علم حاصل کرے تا کہ علماء کے سامنے فخر کرے، یا بیوقوفوں کے ساتھ علم کے ذریعہ جھگڑے، یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیرے۔ تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ میں ڈالے گا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

عَمِلْتُ فِي الْمُجَاهَدَةِ ثَلَاثِيْنَ سَنَةً فَمَا وَجَدْتُ شَيْئًا اَشَدَّ عَلَيَّ مِنَ الْعِلْمِ وَخَطَرِهٖ۔	میں نے تیس سال مجاہدہ کیا تو علم اور اس کے خطرات سے زیادہ سخت کسی چیز کو نہ پایا۔

اور اس بات سے بھی بچنا کہ شیطان کہیں تمہارے ذہن میں یہ وہم نہ ڈال دے کہ جب علم میں اتنے خطرات ہیں تو اسے حاصل ہی نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا وہم درست نہیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اطلعت ليلة المعراج على النار فرأيت اكثر اهلها الفقراء قالوا يارسول الله من المال؟ قال لا بل من العلم۔	معراج کی رات میں نے اہل دوزخ کو دیکھا تو مجھے ان میں فقیر و محتاج زیادہ نظر آئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ کیا مال و دولت کے محتاج؟ تو آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ علم کے محتاج۔

تو جو شخص علم نہ سیکھے وہ عبادات اور ان کے ارکان ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں کر سکتا۔ بالفرض اگر کوئی شخص تمام آسمانوں کے فرشتوں جتنی عبادت کرے، مگر علم نہ ہو، تو وہ خسارے میں ہی رہے گا۔

اس لیے جس طرح بھی ہو علم ضرور حاصل کرو۔ اور اس کے حاصل کرنے میں پریشان اور سست نہ ہو۔ ورنہ گمراہی کے خطرات سے دوچار ہو جاؤ گے۔ ہر قسم کی گمراہی سے اللہ کی پناہ۔

پھر جب تم اللہ تعالیٰ کی کاریگری میں غور کرو گے، اور خوب گہری نظر سے دیکھو گے تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ہمارا ایک معبود ہے جو سب کچھ کر سکتا ہے جسے ہر چیز کا علم ہے، جو ہمیشہ زندہ ہے، اور جو چاہے کرتا ہے۔ جو ہر بات کو سنتا اور دیکھتا ہے، جو ازل سے متکلم ہے۔ جس کا علم، ارادہ اور کلام فنا و زوال سے منزہ ہے۔ جو ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ جو ممکنات کی صفات سے موصوف نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی مخلوق اشیاء کی خصوصیات اس میں پائی جا سکتی ہیں۔ نہ وہ مخلوق میں سے کسی بات میں مشابہ ہے۔ اور نہ مخلوق ہی کسی امر میں اس سے مشابہ ہے۔ وہ مکان اور جہت کی قید سے پاک ہے۔ اور آفات و حوادث اس پر نہیں آ سکتے۔ اسی طرح جب تم سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات، آپ کے خصائل اور علامات نبوت پر غور کرو گے تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ آپ اللہ کے رسول اور اس کی وحی پہنچانے میں امین ہیں۔ غور کرنے سے تم پر اس امر کی حقانیت بھی واضح ہو جائے گی کہ سلف صالحین کا یہ عقیدہ کہ جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار بغیر جہت اور مکان کے ہو گا، حق ہے۔ اور یہ کہ وہ ہمیشہ سے موجود ہے، مگر کسی حد میں محدود نہیں۔ اور تم پر اس امر کی حقانیت بھی روشن ہو جائے گی کہ اس کا کلام غیر مخلوق ہے۔ اور یہ کہ وہ حروف و اصوات سے مرکب نہیں۔ کیونکہ حروف و اصوات سے ترکیب حادث ہے، اور حادث چیز قدیم کی صفت نہیں ہو سکتی۔

غور کرنے سے تم پر یہ بھی عیاں ہو جائے گا کہ ملک و ملکوت میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے وہ خدا کی تقدیر اور قضا سے ہوتا ہے۔ اور ہر چیز کا عالم وجود میں ظہور بھی اس کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے۔ خیر و شر بھی اسی کی طرف سے ہیں۔ اور نفع و نقصان کا مالک بھی درحقیقت وہی ہے اور کفر و ایمان بھی اسی کی جانب سے ہیں۔ اور مخلوق کے لیے اس پر کوئی چیز لازم نہیں۔ وہ اگر کسی کو ثواب عطا فرمائے تو یہ اس کا فضل ہے۔ اور اگر کسی کو عذاب دے تو یہ اس کا عدل ہے۔

اور جب تمہیں اس کا بھی یقین ہو جائے کہ جو ارشادات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان سے صادر ہوئے ہیں سب حق اور درست ہیں۔ اور حشر نشر، عذاب قبر، سوال منکر نکیر،

وغیرہ کے متعلق آپ نے جو خبریں بھی دی ہیں، سب سچی اور حق ہیں۔ اور سلف صالحین کا ان سب باتوں پر اعتقاد تھا۔ وہ سب ان پر مضبوطی سے قائم تھے۔ اور ان سب امور پر اغراض نفسانی و بدعات پیدا ہونے سے پہلے ہی اتفاق و اجماع ہو چکا ہے ——— (اللہ تعالیٰ خواہشات کی پیروی اور خلاف شرع امور کی پیروی کرنے سے ہم سب کو بچائے)۔

پھر جب دل کے اعمال، باطنی اسباب اور ان اشیاء پر غور کرو گے جن کا جائز یا ناجائز ہونا اس کتاب میں مذکور ہے۔ پھر تمہیں ان امور کی پہچان بھی ہو جائے جن کی تمہیں عبادت میں ضرورت ہے۔ جیسے طہارت، نماز اور روزہ وغیرہ کا علم۔ خلاصہ یہ کہ جب تمہیں تمام مندرجہ بالا چیزوں کا پوری طرح علم و یقین ہو گیا۔ تو اب تم اُمتِ محمدیہ کے راسخین علماء کے زمرہ میں شامل ہو گئے ——— اب اگر تم نے علم کے مطابق پوری طرح عمل بھی کیا۔ اور اپنی آخرت درست اور آباد کرنے میں لگ گئے تو تم عابد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب بصیرت عالم بھی بن گئے۔ اور دین کے بارے میں اب تم بفضل خدا جاہل یا غافل نہیں رہے، اور نہ ہی کسی کے مقلد رہے۔ تمہیں ایسے شرف پر مبارک دینی چاہیے۔ تمہارے علم کی بہت زیادہ قیمت ہے۔ اور تمہیں اس پر بہت زیادہ ثواب ملے گا۔ اور تم نے علم کی گھاٹی کو عبور کر لیا۔ اور تحصیلِ علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا جو تم پر حق تھا، اسے تم نے بعونِ الٰہی ادا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ ہمیں اور تمہیں دین پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

دُوسری گھاٹی توبہ کے بیان میں

پھر اے عبادت کے طالب! تجھ پر عبادت میں مشغول ہونے سے قبل اپنے گناہوں سے توبہ کرنا لازم ہے۔ اور یہ دو وجہ سے لازم ہے:

ایک تو اس لیے تاکہ توبہ کے باعث تمہیں طاعت و عبادت کی توفیق نصیب ہو۔ کیونکہ گناہوں کی نحوست بندے کو طاعات و عبادات بجالانے سے محروم کر دیتی ہے، اور اس پہ ذلت و رسوائی مسلط کر دیتی ہے۔ یقین جانو کہ گناہ ایک ایسی زنجیر ہے جو بندے کو طاعات و نیکی کی طرف چلنے سے روک دیتی ہے، اور گناہوں کے ہوتے ہوئے امورِ خیر میں جلدی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ گناہوں کا ثقل اور بوجھ نیکیوں کے سکون کو پیدا نہیں ہوتے دیتا۔ اور نہ ہی طاعات میں نشاط و خوشی پیدا ہونے دیتا ہے۔ اور گناہوں پر اصرار اور اَڑے رہنا دل کو سیاہ کر دیتا ہے۔ اس طرح انسان قساوتِ قلبی، اور گناہوں کی تاریکی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نہ اس میں خلوص پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی دل کا تزکیہ۔ اور نہ ہی عبادت میں لذت و حلاوت پیدا ہو سکتی ہے۔ جو شخص گناہوں سے تائب نہیں ہوگا، اگر خدا کا فضل اس کے شامل حال نہ ہوا تو رفتہ رفتہ یہ گناہ اُسے کفر تک پہنچا دیں گے۔ ایسے شخص پر شقاوت اور بدبختی غالب آجائے گی۔ تو ایسے شخص پر تعجب ہے کہ اس نحوست و قساوت کے ہوتے ہوئے اسے طاعاتِ الٰہی کی توفیق کس طرح مل سکتی ہے اور گناہوں پر اَڑنے والا شخص طاعاتِ خداوندی کا دعوٰی کیسے کر سکتا ہے، اور خلاف شرع امور کو اپناتے ہوئے وہ عبادتِ خداوندی کیسے بجا لا سکتا ہے؟ اسی طرح جو شخص گناہوں کی گندگی اور پلیدی سے آلودہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی مناجات کا قُرب کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اذا کذب العبد تنحا عنه الملکان من نتن ما یخرج من فیه۔	جب انسان جھوٹ بولتا ہے تو دونوں کراماً کاتبین جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

اور جھوٹ و غیبت کے ہوتے ہوئے زبان ذکر الٰہی کے لائق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس لیے گناہوں پر اصرار کرنے والے آدمی کو نیک کام کی توفیق ملنا بہت مشکل ہے۔ اور نہ ہی عبادت کرتے وقت ایسے شخص کے اعضاء میں چستی اور سکون پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص اگر کچھ ٹوٹی پھوٹی عبادت کرے گا تو وہ بھی مشقت کے ساتھ۔ پھر ایسی عبادت میں لذت و صفائی وغیرہ کچھ نہ ہو گی۔ یہ سب کچھ گناہوں کی نحوست اور ترکِ توبہ سے ہو گا۔ اس شخص نے سچ فرمایا ہے جس نے کہا ہے کہ اگر تو رات کو نماز تہجد پڑھنے کی اور دن کو روزہ رکھنے کی قوت نہیں رکھتا تو سمجھ لے کہ تو منحوس ہو چکا ہے اور معاصی کی نحوست تجھ پر مسلط ہو چکی ہے۔

توبہ کے ضروری ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بغیر توبہ کے عبادات قبول نہیں ہوتیں۔ جس طرح قرض خواہ کا قرض ادا کرنے سے پہلے اس کے سامنے ہدیے اور تحفے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور نہ وہ انہیں قبول کرتا ہے۔ اسی طرح پہلے گناہوں سے توبہ لازم ہے اس کے بعد عام عباداتِ نافلہ۔ اسی طرح جب فرائض کسی کے ذمے لازم ہوں تو اس کے نوافل وغیرہ کیسے قبول ہو سکتے ہیں۔ یوں ہی اگر کوئی شخص حرام و ممنوع کام تو ترک نہ کرے مگر مباح و حلال اشیاء میں پرہیز و احتیاط کرے۔ تو اس کا ایسا پرہیز کیا وقعت رکھ سکتا ہے۔ اور وہ شخص خدا تعالیٰ سے مناجات، اس کی درگاہ میں پسندیدہ اور اس کی ثنا کرنے کے لائق کیسے ہو سکتا ہے جس پر خدا تعالیٰ ناراض اور غصے ہو۔ گناہوں پر اصرار کرنے والوں کا اکثر یہی حال ہے۔

سوال:

توبۃ النصوح کے کیا معنی ہیں، اس کی تعریف کیا ہے، اور بندے کو کیا کرنا چاہیے جس سے اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں؟

جواب:

دل کے کاموں میں سے ایک کام توبہ ہے، اور عام علماء نے اس کی تعریف یہ کی ہے:

تَنْزِيْهُ الْقَلْبِ عَنِ الذَّنْبِ۔ — دل کو گناہوں سے پاک کرنا

اور ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تعریف کی ہے:

اِنَّهٗ تَرْكُ اخْتِيَارِ ذَنْبٍ سَبَقَ مِثْلُهٗ — آئندہ کے لیے ایسے گناہ کو ترک کر دینے کا

عَنْهُ مَنْزِلَةً لَاصُوْرَةً تَعْظِيْمًا لِلّٰهِ تَعَالٰى وَحَذَرًا مِّنْ سَخَطِهٖ۔

قصد کرنا جس درجے کا پہلے گناہ ہو چکا ہو۔ اور یہ ترک محض خدا کی تعظیم اور اس کی ناراضگی کے ڈر کے باعث ہو۔

شیخ کی تعریف کے مطابق توبہ کی چار شرطیں ہیں :

(۱) گناہ ترک کر دینے کا ارادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے دل کو اس بات پر پختہ اور مضبوط کرے کہ آئندہ کبھی گناہوں کی طرف رجوع نہیں کروں گا۔ لیکن اگر کوئی شخص بالفعل گناہ چھوڑ دے مگر دل میں خیال ہو کہ پھر کبھی کروں گا۔ یا ابتداً ہی سے گناہ چھوڑنے کا ارادہ ہی متردد ہو۔ تو ایسا شخص بعض اوقات پھر گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگرچہ وقتی طور پر گناہوں سے رُک جاتا ہے مگر اسے تائب نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کر رہا ہو اس مرتبے کا گناہ پہلے کبھی اس سے صادر ہو چکا ہو۔ کیونکہ اگر پہلے اس سے ایسا گناہ صادر نہیں ہوا صرف آئندہ کے لیے اس سے بچتا ہے تو ایسے شخص کو تائب نہیں کہیں گے بلکہ متقی کہیں گے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کفر سے بچنے والا تو کہہ سکتے ہیں مگر کفر سے توبہ کرنے والا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کفر تو معاذ اللہ کبھی بھی آپ سے صادر نہیں ہوا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کفر سے تائب کہیں گے۔ کیوں کہ آپ پہلے حالتِ کفر میں رہ چکے تھے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ وہ گناہ رتبہ میں پہلے گناہ کی طرح ہو نہ کہ صورت میں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جس پرانے بوڑھے نے جوانی کے زمانے میں زنا یا ڈاکہ زنی کا ارتکاب کیا ہو وہ اب بڑھاپے میں توبہ تو کر سکتا ہے کیونکہ توبہ کا دروازہ بند نہیں۔ مگر اب اسے زنا یا ڈاکہ زنی کے ترک کا اختیار نہیں کیونکہ اب وہ عملی طور پر یہ گناہ نہیں کر سکتا۔ تو چونکہ اب وہ زنا یا ڈاکہ زنی پر قادر نہیں، اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے اختیار سے انہیں چھوڑ رہا ہے یا ان سے رُک رہا ہے۔ کیونکہ اب وہ عاجز ہو چکا ہے اور اسے اب ان پر قدرت نہیں رہی۔ مگر وہ اس وقت بھی زنا یا ڈاکہ زنی جیسے دوسرے حرام و ممنوع افعال پر قادر ہے۔ جیسے جھوٹ بولنا، کسی پر زنا کی تہمت لگانا، کسی کی غیبت یا چغلی کرنا وغیرہ امور یہ سب گناہ ہیں۔ اگرچہ ہر ایک میں اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے فرق ہے۔ لیکن یہ تمام گناہ ایک ہی رتبہ کے شمار

ہوتے ہیں مگر یہ گناہ بدعت کی پیروی سے کم ہیں، اور بدعت کی پیروی کفر سے کم ہے۔ تو بہ تو یہ جو زنا یا ڈاکہ زنی سے ہوگی صورۃً توبہ ہوگی۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے اور اس کے دردناک عذاب سے ڈر کر ہو کسی دُنیوی غرض یا لوگوں سے ڈر کر یا طلب ثنا کے لیے یا اپنی مشہوری یا جسمانی لاغری کی وجہ سے یا محتاجی اور کسی اور رکاوٹ کی وجہ سے نہ ہو۔

جب توبہ کے یہ ارکان و شرائط پائے جائیں گے تو توبہ مکمل طور پر ہوگی اور اسے توبہ صادقہ کہا جائے گا۔

توبہ کے مقدمات تین امر ہیں یعنی جن چیزوں کا توبہ سے پہلے ہونا ضروری ہے۔

اوّل: یہ کہ اپنے گناہوں کو نہایت قبیح افعال تصور کرے۔

دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شدت اور اس کے غضب کی سختی کو دل میں حاضر کرے۔

سوم: یہ کہ اپنی کمزوری اور گناہ کے بارہ میں اپنی بے حیائی کو محسوس کرے اور اس کا اعتراف کرے

کیونکہ جو شخص سُورج کی تیز دھوپ، چوکیدار کے دھپڑ اور چیونٹی کے ڈنگ کو برداشت نہیں کرسکتا وہ دوزخ کی شدید گرمی، جہنم کے فرشتوں کی مار اور انتہائی زہریلے سانپوں کے ڈنگ کیسے برداشت کرسکتا ہے۔ دوزخ میں بچھو خچر جتنے بڑے اور وہاں کے سانپ اونٹ کی گردن جتنے موٹے ہوں گے۔ اور یہ سانپ اور بچھو وغیرہ دوزخ کی آگ کے ہوں گے۔ اس وقت وہ غضب اور غصے کے مکان میں رکھے ہوئے ہیں ——— ہم بار بار خدا کے غضب اور عذاب سے پناہ مانگتے ہیں۔

تم اگر ان دہشت ناک امور کو یاد رکھو گے، اور ہر دن رات میں کسی وقت ان کی یاد تازہ کرتے رہو گے، تو ضرور تمہیں گناہوں سے خالص توبہ نصیب ہو جائے گی ——— اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنے فضل سے توبہ کی توفیق دے۔

سوال:

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے تو توبہ کے متعلق صرف یہ فرمایا ہے کہ "اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ" یعنی گناہوں پر پشیمان ہونے کا نام توبہ ہے۔ توبہ کے جو ارکان و شرائط تم نے بیان

کیسے ہیں ان کا حضورؐ نے تو کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

جواب :

صرف ندامت کو توبہ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ گناہوں پر پشیمانی بندہ کے اختیار و قدرت میں نہیں ۔ تم اس چیز کو محسوس کرتے ہو کہ بسا اوقات بندہ ایک فعل پر نادم و پشیمان ہو رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ دل سے وہ اس ندامت و پشیمانی کو پسند نہیں کر رہا ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ ندامت و پشیمانی بندہ کے اختیار میں نہیں۔ اور توبہ تو اختیاری چیز ہے۔ اسی لیے توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ تو اس تشریح سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ ندامت و پشیمانی یقیناً عین توبہ نہیں۔ اس لیے مذکورہ حدیث کے وہ معنی نہیں جو ظاہراً سمجھ میں آتے ہیں۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کا تصور کرکے اور اس کے دردناک عذاب کے خوف سے جو ندامت اور پشیمانی بندہ کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ بندے کو خالص توبہ کرنے پر ابھارتی ہے ۔ اور ایسی ندامت و پشیمانی صحیح تائبین کا حال اور ان کی صفت ہے۔ کیونکہ بندہ جب مندرجہ بالا توبہ کے مقدمات کو بار بار خیال میں لائے گا تو اسے اپنے گناہوں پر ندامت محسوس ہوگی، اور یہی ندامت اس کو ترکِ معاصی پر اُبھارے گی، اور ایسی ندامت آئندہ کے لیے بھی تائب کے دل میں قائم رہے گی اور خداوند تعالیٰ کے دربار میں عاجزی اور زاری پر برانگیختہ کرے گی ۔ تو چونکہ ایسی ندامت توبہ کا سبب اور تائب کی صفتوں میں سے ہے، اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسی ندامت کو توبہ فرما دیا۔ اس معنی کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں سمجھنے کی توفیق دے ۔

سوال :

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان ایسا ہو جائے کہ اس سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ صادر ہی نہ ہو ؟ حالانکہ انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ علیہم و سلامہ جو تمام مخلوقات سے قطعی طور پر اشرف و اعلیٰ تھے، ان کے متعلق بھی اہل علم میں اختلاف ہے کہ وہ اس مرتبہ پر پہنچے یا نہیں۔

جواب

ایسے درجہ پر پہنچ جانا کہ کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ صادر نہ ہو، ممکن ہے، محال نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق جس کے شامل حال ہو جائے اس کے لیے آسان ہے ۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے ۔

پھر یہ بھی توبہ کے شرائط میں سے ہے کہ قصداً گناہ صادر نہ ہو۔ ہاں اگر بھول چوک سے کوئی لغزش ہو جائے تو خدا تعالیٰ رؤف و رحیم اُسے معاف کر دے گا۔ اور جسے خدا کی توفیق حاصل ہو گئی ہو وہ گناہوں سے بآسانی محفوظ رہ سکتا ہے۔

اگر تم توبہ نہ کرنے کا یہ بہانہ کرو کہ ہمیں اپنے نفس پر اعتماد نہیں، شاید توبہ کے بعد گناہوں سے باز رہے یا نہ رہے۔ اور شاید ہم توبہ پر ثابت و مضبوط رہیں یا نہ رہیں اس لیے توبہ کرنے سے کیا فائدہ۔ تو اس تاویل کا جواب سُن لو کہ ایسا خیال شیطان کا سراسر دھوکا اور فریب ہے۔ کیونکہ تمہیں کیسے معلوم ہے کہ توبہ کے بعد ضرور تم سے گناہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے توبہ کے بعد متصل ہی تم پر موت آ جائے اور گناہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ باقی یہ وہم کہ شاید گناہ ہو جائے تو ایسے وہم کا کوئی اعتبار نہیں۔ تم پر صرف یہ لازم ہے کہ توبہ کے وقت آئندہ گناہ ترک کر دینے کا ارادہ پکا اور سچا ہو۔ باقی اس ارادے پر تمہیں استقامت دینا خدا کا کام ہے۔ پس اگر اس ارادے پر تم خدا کے فضل سے قائم رہے تو یہی مقصود ہے۔ اور اگر خدانخواستہ تم اس ارادے پر قائم نہ رہے تو بھی تمہارے گزشتہ گناہ تو معاف ہو گئے۔ گزشتہ گناہوں کے عذاب سے تو تمہیں خلاصی مل گئی اور گزشتہ گناہوں کی آلودگی سے تم پاک ہو گئے۔ توبہ کے بعد اگر کوئی گناہ ہوا ہو تو بس وہی تمہارے ذمے ہے۔ تو سابقہ گناہوں کا معاف ہو جانا کوئی کم نفع ہے؟ اس لیے صرف اس وسوسہ سے توبہ کرنے سے نہ رکو کہ مبادا پھر گناہ ہو جائے۔ کیونکہ خالص توبہ کرنے سے تمہیں دو بڑے فائدوں سے ایک فائدہ تو یقیناً ہو گا کہ یا تو ہمیشہ کے لیے توبۃ النصوح میسر آ جائے گی، یا سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے ——— اللہ تعالیٰ ہی توفیق و ہدایت کا مالک ہے۔

گناہوں کے متعلق یہ یاد رکھو کہ گناہوں کی نوعیت مختلف ہے۔ کیونکہ گناہ تین قسم کے ہیں:

ایک یہ کہ تم نے خدا کے فرض کردہ احکام کو ادا نہ کیا ہو، اور ان کی ادائیگی تمہارے ذمہ ہو۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور کفارہ وغیرہ۔ تو یہ محض زبانی توبہ سے معاف نہیں ہوں گے۔ بلکہ حتی الامکان ان کی قضا لازم ہے۔

دوسری قسم وہ گناہ جن کی اب قضا تو نہیں ہو سکتی مگر ہوں وہ بھی تمہارے اور خدا کے درمیان ہی۔ جیسے کہیں شراب نوشی کی ہو، یا راگ رنگ کی محفل سجائی ہو، یا سُود کھایا ہو۔ تو اس قسم کے گناہوں کی معافی کی صورت یہ ہے کہ گزشتہ گناہوں پر ندامت و پشیمانی کی جائے اور آئندہ کے لیے انہیں

ترک کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا جائے۔

تیسری قسم وہ گناہ ہیں جو تمہارے اور مخلوق کے درمیان ہیں۔ تمام گناہوں سے زیادہ سنگین گناہ یہ تیسری قسم کے گناہ ہیں۔ ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ بعض کسی کے مال سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض کسی کی ذات سے۔ اسی طرح بعض وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق کسی کی عزت و حرمت سے ہوتا ہے۔ اور بعض وہ ہوتے ہیں جو کسی کو دینی طور پر نقصان پہنچایا ہوتا ہے۔

تو جن کا تعلق مال سے ہے، ان کے متعلق ضروری ہے کہ اگر ہو سکے تو وہ مال واپس کر دیا جائے اگر غربت و افلاس کے باعث واپس کرنے سے معذور ہے تو صاحب مال سے جائز و حلال کروائے اگر صاحب مال مر چکا ہے، یا وہاں موجود نہیں، تو مال کی مقدار کے مطابق کوئی چیز صدقہ کر دے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اعمال صالحہ کی کثرت کرے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں گریہ وزاری کرے۔ تاکہ روز قیامت خدا تعالیٰ اس صاحب مال کو راضی کر دے۔

اور وہ گناہ جن کا تعلق کسی کی جان یا ذات سے ہو جیسے کسی کو قتل کیا ہو۔ تو اس کے عوض قصاص دینا لازم ہے۔ یا مقتول کے وارثوں سے معاف کرانا ضروری ہے۔ اور اگر وارث موجود نہیں تو دربار ایزدی میں گریہ وزاری ضروری ہے۔ اور خدا سے اس کی معافی چاہنا لازم ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس مقتول کو تم سے راضی کر دے۔

اور کسی کی عزت و آبرو سے متعلق یہ گناہ ہے کہ کسی کی غیبت کی جائے۔ یا کسی پر بہتان لگایا جائے، یا کسی کو گالیاں دی جائیں۔ تو اس قسم کے گناہ کی معافی کی صورت یہ ہے کہ اس کے سامنے اپنے آپ کو جھوٹا کہا جائے، اور اپنی زیادتی اور خطا کا اعتراف کیا جائے۔ اور اگر یہ خطرہ ہو کہ اس کے سامنے بجائے اعترافِ گناہ کے اور زیادتی اور تعدی ہو جائے گی، اور درستی و صلح کی بجائے اور فتنہ پیدا ہو جائے گا تو اس صورت میں بھی معافی کے لیے خدا کے دربار میں ہی گریہ وزاری کرے، تاکہ معافی ہو جائے۔ اور کسی کی آبرو سے متعلق یہ گناہ ہے کہ کسی کے اہل و عیال سے خیانت کی جائے یا کوئی اور حرکتِ بد کی جائے، تو ایسے گناہ کو نہ تو اس کے سامنے ظاہر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بخشوایا جا سکتا ہے تو اس کی معافی کے لیے بھی دربار ایزدی میں ہی گریہ وزاری کرنی چاہیے۔ ہاں اگر فتنہ کا خوف نہ ہو، اگرچہ یہ نادر ہے، تو اس کے سامنے ظاہر کر کے معاف کرا لیا جائے۔

لیکن وہ گناہ جن کا تعلق کسی کے دین سے ہو۔ یہ ہیں کہ کسی کو کافر یا بدعتی یا گمراہ کہا جائے تو یہ بھی سخت گناہ ہے۔ ایسے گناہوں کی معافی بھی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس کے سامنے اپنی خطا اور غلطی کا اعتراف کیا جائے۔ اور اگر وہ موجود نہ ہو تو دربار الٰہی میں گڑگڑائے اور استغفار کرے' اور اپنے آپ پر ملامت کرے۔ تاکہ روز قیامت خدا تعالیٰ اس شخص کو راضی کر دے۔

خلاصہ یہ کہ جہاں تم گناہ کے ساتھ تکلیف دینے والوں کو راضی بھی کر سکو وہاں ان کو راضی بھی کرو' ورنہ معافی اور بخشش کے لیے خدا تعالیٰ کیطرف رجوع کرو، اس کے دربار میں گریہ وزاری کرو اور صدقہ وخیرات کرو۔ تاکہ روز قیامت اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان رضامندی کرا دے۔ اس لیے کہ خدا کے فضل وکرم سے یہ امید ہے کہ وہ تمہاری صادق گریہ وزاری دیکھ کر تمہارے خصم کو اپنے خزانوں سے عطا کر کے تمہاری طرف سے راضی کر دے۔

توبہ کے ارکان وشرائط جو ہم نے بیان کیے ہیں، جب تم ان پر پوری طرح عمل پیرا ہو جاؤ گے اور آئندہ کے لیے اپنے دل کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک رکھنے کا عہد کر لو گے تو تمہارے گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اب آئندہ اگر اس عہد پر تو تم قائم رہے مگر گزشتہ قضائیں ادا نہ کر سکے' یا ناراض لوگوں کو راضی نہ کر سکے' تو یہ سابقہ گناہ ہی تمہارے ذمہ رہے۔ باقی تمام بخش دیے جائیں گے۔

اور اس باب التوبہ کی شرح بہت طویل ہے جس کی گنجائش یہ مختصر کتاب نہیں رکھتی۔ اگر اس کی زیادہ شرح مطلوب ہو تو کتاب احیاء العلوم کے باب التوبہ یا القربۃ الی اللہ یا کتاب الغایۃ القصویٰ کا مطالعہ کرو۔ یہاں صرف اسی قدر بیان کیا ہے جس کی اشد ضرورت تھی۔

پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ توبہ کی گھاٹی بہت سخت گھاٹی ہے۔ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اس سے غفلت شدید نقصان کی موجب ہے۔ توبہ کی اہمیت وضرورت اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے جو استاد ابو اسحاق اسفرائنی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ استاد موصوف باعمل اور راسخ فی العلم علماء میں سے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

"میں نے تیس برس اللہ تعالیٰ سے توبہ النصوح نصیب ہونے کی التجا کی۔ تیس برس کے بعد میں اپنے دل میں متعجب ہوا اور دربار خداوندی میں عرض کیا "اے پروردگار! مجھے تیس برس ہونے ہیں تجھ سے صرف ایک حاجت کے لیے التجا کرتے۔ لیکن تو نے اب تک وہ بھی پوری نہ کی جب میں

سویا تو خواب میں ایک شخص دیکھا جو مجھے کہہ رہا تھا "تو اپنی تیس سالہ دُعا پر تعجب کرتا ہے۔ تجھے یہ معلوم نہیں کہ تو کتنی بڑی چیز کا مطالبہ کر رہا ہے؟ تو اس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے اپنا دوست بنا لے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سُنا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ ۝	بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور ستھرا رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تو کیا تو توبہ کو معمولی شئے خیال کرتا ہے"؟

اے غافل مسلمان! ذرا ان ائمۂ دین کے حالات پر تو نظر کر دکہ وہ توبہ کے لیے کتنا اہتمام کرتے تھے اور اصلاحِ قلوب کے لیے کس طرح مسلسل تگ ودو میں لگے رہتے تھے اور توشۂ آخرت تیار کرنے کی خاطر کس طرح جانفشانی سے مصروف رہتے تھے۔

توبہ میں تاخیر کرنا سخت نقصان دہ ہے۔ کیونکہ گناہ سے ابتداءً قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ انسان کفر و گمراہی تک جا پہنچتا ہے۔ کیا تمہیں ابلیس اور بلعم باعور کا واقعہ یاد نہیں؟ ان سے ابتدا میں ایک ہی گناہ صادر ہوا مگر وہ بعد میں کفر و گمراہی تک پہنچ گئے اور ہمیشہ کے لیے تباہ حال لوگوں میں شامل ہو گئے۔ اس لیے توبہ کے بارہ میں تم پر بیداری و کوشش لازم ہے۔ اگر تم جلد توبہ کر دگے تو امید ہے کہ عنقریب گناہوں پر اصرار کرنے کے مرض کا تمہارے دل سے قلع قمع ہو جائے اور گناہوں کی نحوست کا بوجھ تمہاری گردن سے اُتر جائے اور گناہوں کی وجہ سے جو قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے اس سے ہرگز بے خوف نہ ہو۔ بلکہ ہر وقت اپنے دل پر نگاہ رکھو۔ کیونکہ بعض صالحین نے فرمایا ہے:

اِنَّ سَوَادَ الْقَلْبِ مِنَ الذُّنُوْبِ	بیشک گناہ کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے،
وَعَلَامَةُ سَوَادِ الْقَلْبِ اَنْ لَّا تَجِدَ	اور دل کی سیاہی کی علامت یہ ہوتی ہے کہ
مِنَ الذُّنُوْبِ مَفْزَعًا وَّلَا لِلطَّاعَةِ	گناہوں سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ طاعت
مَوْقِعًا وَّلَا لِلْمَوْعِظَةِ مُنْجَعًا وَّلَا	کے لیے موقع نہیں ملتا۔ نصیحت سے کوئی
تَسْتَحْقِرَنَّ مِنَ الذُّنُوْبِ شَیْئًا	فائدہ نہیں ہوتا۔ اے عزیز کسی گناہ کو معمولی
فَتَحْسِبَ نَفْسَكَ تَآئِبًا وَّاَنْتَ	نہ خیال کر۔ اور کبیرہ گناہوں پر اصرار کرنے کے

مُصِرًّا عَلَى الْكَبَائِرِ۔ باوجود اپنے آپ کو تائب گمان نہ کر۔

حضرت کہمس بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا. تو میں اس پر چالیس برس روتا رہا۔ لوگوں نے پوچھا "اے ابو عبداللہ! وہ کونسا گناہ تھا" تو آپ نے فرمایا" ایک دفعہ میرا ایک دوست میری ملاقات کو آیا تو میں نے اس کے لیے مچھلی پکائی۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو میں نے اُٹھ کر اپنے پڑوسی کی دیوار سے مٹی لے کر اپنے مہمان کے ہاتھ دھلائے"۔

پس اے لوگو! نفس کو گناہوں پر ٹوکتے رہو، اس کا محاسبہ کرتے رہو اور توبہ کرنے میں سستی اور تاخیر نہ کرو۔ کیونکہ موت کا وقت پوشیدہ ہے اور دنیا دھوکے وفریب میں ڈال رہی ہے، اور نفس و شیطان دو خطرناک دشمن تمہیں گمراہ کرنے کی تاک میں ہیں۔ اس لیے ہر وقت دربارِ ایزدی میں تضرع و زاری کرتے رہو۔ اور اپنے والد ماجد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حال اکثر اوقات ذہن میں دوہراتے رہو۔ جن کو رب تعالیٰ نے خود اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا، اور ان میں اپنی روح پھونکی۔ اور پھر فرشتے انہیں اُٹھا کر جنت میں لے گئے۔ آپ سے صرف ایک لغزش سرزد ہوئی تو اپنے مقامِ عالی سے گر گئے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ لغزش ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ سے پوچھا:

يَا آدَمُ أَيُّ جَارٍ كُنْتُ لَكَ؟ قَالَ نِعْمَ الْجَارُ يَا رَبِّ۔ قَالَ يَا آدَمُ أُخْرُجْ مِنْ جِوَارِي وَضَعْ عَنْ رَأْسِكَ تَاجَ كَرَامَتِي۔ فَإِنَّهُ لَا يُجَاوِرُنِي مَنْ عَصَانِي۔

اے آدم! میں تیرا کیسا پڑوسی تھا۔ آپ نے عرض کیا بہت اچھا پڑوسی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے پڑوس سے دُور چلا جا۔ اور میری عطا کردہ عزت کا تاج سر سے اتار دے کیونکہ میری نافرمانی کرنے والا میرے پڑوس میں رہنے کا اہل نہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام دو سو برس اس لغزش پر روتے رہے۔ تب جا کر اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی اور اس لغزش کو معاف فرمایا۔ یہ اس کامل بزرگ کا حال ہے جو اس کا نبی اور دوست تھا، تو عام لوگوں کا کیا حال ہوگا جو بے شمار گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ دو سو برس وہ اخلاص کا پیکر رویا جو واقعی تائب اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ تو گناہوں پر اصرار کرنے والے غافل کو کس قدر زیادہ گریہ وزاری کی ضرورت ہوگی؟ ایک شاعر نے اسی چیز کو کتنے اچھے انداز میں ادا

کیا ہے۔ شعر

يَخَافُ عَلٰى نَفْسِهٖ مَنْ يَتُوْبُ　　　فَكَيْفَ تَرٰى حَالَ مَنْ لَّا يَتُوْبُ

وہ ڈر رہے ہیں جو ہر وقت توبہ و استغفار میں مصروف رہتے ہیں، تو ان کا کیا حال ہوگا جو سرے سے توبہ ہی سے غافل ہیں۔

اور توبہ کرنے کے بعد اگر توبہ توڑ ڈالو اور پھر گناہ شروع کر دو تو جلد توبہ کی طرف لوٹو۔ اور نفس کو توبہ پر راغب کرنے کے لیے یہ کہو: "اے نفس! اب دوبارہ خلوص سے توبہ کرلے۔ شاید یہ تیری آخری توبہ ہو اور اس کے بعد ارتکاب گناہ کے بغیر ہی تو مر جائے"۔ اسی طرح گناہ کے بعد توبہ کرتے رہو۔ اور جس طرح تم نے گناہ کرنا دستور بنا لیا ہے، گناہ کے بعد توبہ کو بھی پیشہ بنا لو۔ اور گناہ کر کے توبہ سے عاجز نہ ہو جاؤ، اور کبھی توبہ سے منہ نہ موڑو۔ اور شیطانی دھوکہ میں آکر توبہ سے ہرگز نہ رکو۔ کیونکہ توبہ کرنا نیک ہونے کی علامت ہے۔ کیا تم نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا؟ آپ فرماتے ہیں:

خَيْرُكُمْ كُلُّ مُفَتَّنٍ تَوَّابٍ۔　　　تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس سے اگر گناہ صادر ہوں تو بعد میں فوراً توبہ کرے۔

اور خدا کی طرف زیادہ رجوع کرے اور گناہوں پر پشیمان زیادہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ سے ڈر کر استغفار زیادہ کرے۔ تم اس آیت قرآنی کے معنی پر تو غور کرو:

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝　　　جو برے عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ کو ضرور بخشنے والا مہربان پائے گا۔

فصل

الغرض جب تم توبہ و استغفار کے ذریعہ اپنے دل کو تمام گناہوں سے صاف کر لو اور آئندہ کے لیے اپنے دل کو گناہوں سے دور رکھنے پر محکم کر لو۔ اور اس خلوص سے توبہ کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو توبہ میں سچا اور خالص پائے۔ اور جہاں تک ہو سکے لوگوں کو راضی کر لو جنہیں تم نے مالی، بدنی، یا

دینی قسم کی اذیتیں پہنچائی ہوں، اور گزشتہ زمانے کے چھوٹے ہوئے نمازیں اور روزے وغیرہ بھی حتی الامکان قضا کر لو۔ اور جو قضا نہیں کر سکتے ان کی معافی کے لیے دربار خداوندی میں گریہ وزاری بھی کر چکو جس کے ذریعہ تمہارے باقی ماندہ گناہ اور لغزشیں معاف ہو جائیں تو پھر تم غسل کرو، اور پاک کپڑے پہنو، اور وضو کر کے پورے خشوع وخضوع سے چار رکعت نماز ادا کرو۔ اور اپنی پیشانی کو ایسی جگہ زمین پر رکھو جہاں تمہیں اللہ کے سوا کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ پھر تم اپنے چہرہ پر خاک ڈالو۔ اور اپنے چہرے کو جو تمام اعضاء سے اعلیٰ عضو ہے، خاک سے آلودہ کرو، اور حالت یہ ہو جائے کہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں، دل غم کے دریا میں تیر رہا ہو، اور شدت خوف کے باعث تمہارے رونے کی آواز بے ساختہ بلند ہو رہی ہو، ایک ایک کر کے تمہارے گناہ آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہوں، تو اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہوئے اپنے نفس کو ڈانٹتے ہوئے اس سے یوں خطاب کرو:

أَمَا تَسْتَحْيِيْنَ يَا نَفْسُ۔ أَمَا آنَ لَكِ أَنْ تَتُوْبِيْ۔ أَلَكِ طَاقَةٌ بِعَذَابِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ أَلَكِ حَاجَةٌ بِسَخَطِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ۔

اے نفس کیا تجھے خدا سے شرم نہیں آتی؟ کیا تیری توبہ کا وقت ابھی قریب نہیں آیا؟ کیا تجھ میں خدائے جبار کے دردناک عذاب برداشت کرنے کی سکت ہے؟ کیا تو اپنے اوپر خدا کو ناراض کرنے کا خواہش مند ہے؟

اسی طرح چند بار گناہوں کو یاد کر کے ان الفاظ کا تکرار کرو، اور پورے سوز وگداز سے روؤ اور گریہ وزاری کرو۔ پھر سجدے سے سر اٹھاؤ اور اپنے مہربان خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دو، اور یہ دُعا کرو:

إِلٰهِيْ عَبْدُكَ الْآبِقُ رَجَعَ إِلَيْكَ وَعَبْدُكَ الْعَاصِيْ رَجَعَ إِلَى الصُّلْحِ وَعَبْدُكَ الْمُذْنِبُ أَتَاكَ بِالْعُذْرِ فَاعْفُ عَنِّيْ بِجُوْدِكَ وَتَقَبَّلْنِيْ بِفَضْلِكَ وَانْظُرْ إِلَيَّ بِرَحْمَتِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا سَلَفَ مِنْ

مولیٰ! تیرا بھاگا ہوا بندہ تیرے در پر واپس آگیا ہے۔ تیرا نافرمان بندہ صلح کی طرف لوٹ آیا ہے اور تیرا گنہگار بندہ عذر خواہی کے لیے تیرے دربار میں حاضر ہے۔ مجھے اپنے کرم سے بخش دے اور مجھے قبول فرمالے اور مجھ پر نظر رحمت فرما۔ یا الٰہی! میرے گزشتہ تمام گناہ بخش دے۔ اور باقی

الذُّنُوبِ. وَاعْصِمْنِيْ فِيْمَا بَقِيَ مِنَ الْاَجَلِ. فَاِنَّ الْخَيْرَ كُلَّهٗ بِيَدَيْكَ وَاَنْتَ بِنَا رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

عمر میں ہر گناہ سے مجھے محفوظ رکھنا۔ تو ہی ہر بھلائی کا مالک ہے۔ اور تو ہی ہم پر مہربان اور نرمی فرمانے والا ہے۔

پھر یہ دُعا کرے جسے دُعائے شدت کہتے ہیں۔ وہ دُعا یہ ہے:

يَا مُجَلِّيَ عَظَائِمِ الْاُمُوْرِ۔ يَا مُنْتَهٰى هِمَّةِ الْمَهْمُوْمِيْنَ يَا مَنْ اِذَا اَرَادَ اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اَحَاطَتْ بِنَا ذُنُوْبُنَا اَنْتَ الْمَذْخُوْرُ لَهَا يَا مَذْخُوْرُ الْكُلِّ شِدَّةٍ كُنْتُ اَدَّخِرُكَ لِهٰذِهِ السَّاعَةِ فَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

اے مشکلات کو حل کرنے والے! اے غمناک اور پریشان حال لوگوں کی جائے پناہ! اے وہ قادر ذات جس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ فرمائے تو لفظ کُن فرمانے سے وہ شئے وجود میں آجاتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ کثرتِ معاصی نے ہم کو گھیر لیا ہے۔ تو ہی ہر آڑے وقت میں ہمارا ذخیرہ ہے۔ پس تجھے ایسے ہی وقت کے لیے اپنا ذخیرہ سمجھتا ہوں۔ تو مجھے معاف فرما دے۔ بیشک تو ہی توبہ قبول فرمانے والا اور مہربان ہے۔

پھر جتنا زیادہ روسکو روؤ اور اپنی ذلت و عاجزی کا اظہار کرو، اور زبان سے یہ دُعا کرو:

يَا مَنْ لَّا يَشْغَلُهٗ شَاْنٌ عَنْ شَاْنٍ وَّلَا سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ۔ يَا مَنْ لَّا تُغَالِطُهٗ كَثْرَةُ الْمَسَائِلِ يَا مَنْ لَّا يُبْرِمُهٗ اِلْحَاحُ الْمُلِحِّيْنَ اَذِقْنَا بَرْدَ عَفْوِكَ وَحَلَاوَةَ مَغْفِرَتِكَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

اے وہ ذات جس کو ایک کام دوسرے کام سے مشغول نہیں رکھ سکتا۔ اور نہ ایک طرف سننا دوسرے سننے سے باز رکھ سکتا ہے۔ اے وہ ذات جسے مسائل کی کثرت مغالطے میں نہیں ڈال سکتی۔ اور نہ دعا میں اصرار کرنے والوں کا اصرار اسے دو ٹوک بات کرنے پر مجبور کر سکتا ہے ہمیں اپنی معافی کی ٹھنڈک پہنچا۔ اور بخشش کی حلاوت نصیب فرما اے سب سے بہتر رحمت کرنے والے ہم پر رحم فرما بیشک تو ہر بات پر قادر ہے۔

اس دُعا کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود شریف بھیجو اور تمام مومنین و مومنات کے لیے دُعائے مغفرت کرو اور اللہ جل جلالہٗ کی طرف رجوع کرو۔

جب یہ تمام مندرجہ بالا دعائیں دربار خداوندی میں گریہ وزاری اور توبہ و استغفار وغیرہ پوری طرح کرلو تو بیشک تمہیں توبہ النصوح حاصل ہوگئی۔ اور تم گناہوں سے ایسے پاک ہوگئے جیسے آج ہی پیدا ہوئے ——— اب تمہیں اللہ تعالیٰ دوست بنالے گا، اور تمہیں بہت اجر ثواب عطا کرے گا، اور تم پر اتنی رحمت و برکت نازل فرمائے گا جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ اب تمہیں حقیقی امن و خلاصی حاصل ہوگئی۔ اور تم اللہ تعالیٰ کے غضب اور گناہوں کی سزا سے نجات پاگئے۔ اور دنیا و آخرت میں گناہوں کی آفت سے چھوٹ گئے۔ اور تمہاری توبہ کی گھاٹی باذن الٰہی عبور ہوگئی ——— اور اللہ ہی اپنے فضل و احسان سے ہدایت کا مالک ہے۔

تیسری گھاٹی عوائق اربعہ کے بیان میں

اے عبادت کے طالب! توبہ کے بعد موانع اور رکاوٹوں کو دور کرنا بھی تجھ پر لازم اور ضروری ہے۔ تاکہ تیری عبادت درست اور مقبول ہو سکے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ موانع چار ہیں:

اوّل دنیا اور جو کچھ اس میں ہے۔

اس رکاوٹ کو دور کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تو اس سے تجرد اور علیحدگی اختیار کرے اور دل سے اس کی محبت نکال ڈالے۔ یہ تجرد اور زہد دو وجہ سے ضروری ہے۔ ایک تو اس لیے کہ تو عبادت کثرت سے کر سکے اور اس میں درستی پیدا ہو سکے۔ کیونکہ دنیا کی مشغولیت تیرے ظاہر و باطن کو عبادت سے روکے گی۔ ظاہر کو تو اس طرح کہ تو طلب دنیا کے لیے مارا مارا پھرتا رہے گا۔ اور باطن کو اس طرح کہ تیرے دل میں لحہ بہ لحہ تحصیل دنیا کے ارادے اور وسوسے پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور یہ ارادہ اور وسوسہ دونوں عبادت میں رکاوٹ بنیں گے۔ کیونکہ دل ایک ہے۔ تو جب وہ ایک چیز کے ساتھ مشغول ہو گا تو اس کی ضد کے ساتھ اس وقت مشغول نہیں ہو سکتا۔ اور دنیا و آخرت کی مثال دو سوکنوں کی سی ہے۔ اگر تم ایک کو خوش کرو گے دوسری ناراض ہو جائے گی۔ اور دنیا و آخرت کے درمیان مغرب و مشرق جتنا فاصلہ ہے۔ جتنا ایک کے قریب ہوتے جاؤ گے، دوسری سے دور ہوتے جاؤ گے۔

ہم نے یہ جو کہا کہ بندے کا ظاہر طلب دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کا ثبوت مندرجہ ذیل روایت سے ہوتا ہے جو حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

زَاوَلْتُ اَنْ اَجْمَعَ بَيْنَ الْعِبَادَةِ وَ	میں نے عبادت و تجارت کو جمع کرنے کا تجربہ کیا،
التِّجَارَةِ فَلَمْ يَجْتَمِعَا فَاَقْبَلْتُ	لیکن یہ دونوں جمع نہ ہو سکیں۔ تو میں نے عبادت
عَلَى الْعِبَادَةِ وَتَرَكْتُ التِّجَارَةَ	کو اختیار کیا اور تجارت کو چھوڑ دیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

لَوْ كَانَتَا مُجْتَمِعَتَيْنِ لِاَحَدٍ غَيْرِي	اگر عبادت و تجارت میرے سوا کسی میں اکٹھی

لاجتمعتا لی لما اعطانی الله سبحانه	ہو سکیں تو مجھے دونوں ضرور ملتیں کیونکہ مجھے
من القوة واللین۔	اللہ تعالیٰ نے قوت اور نرمی دونوں عطا فرمائی ہیں۔

تو جب معاملہ یہ ہے کہ دونوں کا اجتماع مشکل ہے تو فنا ہونے والی (دنیا) کا نقصان گوارا کر لو مگر سلامتی اور حفاظت والی چیز یعنی آخرت کو نہ چھوڑو۔ باقی رہا بندے کے باطن کا دنیا کے ساتھ مشغول ہونا۔ تو اس کا ثبوت اس روایت سے ملتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

مَنْ اَحَبَّ دُنْیَاهُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِهٖ	جس نے دنیا کو پسند کیا اُس نے آخرت کا نقصان
وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَهٗ اَضَرَّ	کیا، اور جس نے آخرت کو پسند کیا اس نے دنیا کا
بِدُنْیَاهُ فَاٰثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی	نقصان کیا۔ تو اس کو اختیار کرو جس کا نفع پائدار
مَا یَفْنٰی۔	اور دائمی ہے اور اس کو چھوڑ دو جو صرف چند دن ہے۔

ان گزشتہ روایات سے تجھ پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جب تک تیرا ظاہر و باطن دُنیا کے ساتھ مشغول رہے گا، کما حقہٗ عبادت نہیں ہو سکے گی۔ مگر جب تو دنیا سے بے رغبت ہو جائے گا اور ظاہر و باطن کو دنیا سے خالی اور فارغ کردے گا تو تجھے کما حقہ عبادت بجالانی نصیب ہو جائے گی۔ بلکہ ظاہری و باطنی اعضاء تیرے معاون و مددگار ہو جائیں گے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا زَهِدَ فِی الدُّنْیَا	جب بندہ دنیا سے زہد و بے رغبتی اختیار کرتا ہے
اِسْتَنَارَ قَلْبُهٗ بِالْحِکْمَةِ	تو اس کا قلب حکمت سے منور ہو جاتا ہے اور
وَتَعَاوَنَتْ اَعْضَاءُهٗ فِی	اس کے اعضاء عبادت کے سلسلہ میں اس کے
الْعِبَادَةِ۔	معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔

عوائق اربعہ کو دور کرنے کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ عوائق ختم ہو جانے کے بعد تمہارے اعمال صالحہ کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی اور ان کی عظمت و مرتبہ زیادہ ہو جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

رکعتان من رجل عالم زاهد	زاہد و عابد عالم کی دو رکعت نماز اللہ تعالیٰ
قلبه خیر واحب الی الله جل	کے ہاں تکلف سے عبادت کرنے والوں کی

جلالہ من عبادۃ المتعبدین الی اٰخر الدھر ابدًا سرمدًا
قیامت تک کی عبادت سے افضل و اعلیٰ ہے۔

تو جب دنیا میں زہد اور اس سے علیحدگی اختیار کرنے سے عبادت کی عظمت زیادہ ہوتی ہے اور اس میں استقامت و کثرت نصیب ہوتی ہے، تو طالب عبادت پر لازم ہے کہ زہد و تجرد کا راستہ اختیار کرے۔

سوال: زہد کے کیا معنی ہیں اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: علمائے اہل سنت کے نزدیک زہد دو قسم ہے۔ (۱) زہد مقدور (۲) زہد غیر مقدور
زہد مقدور یعنی وہ زہد جو بندہ کے اختیار میں ہے۔ وہ تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے:
(۱) دنیا کی جو چیز پاس نہ ہو اس کی طلب نہ کرے۔
(۲) جو موجود ہو اس کو راہِ خدا میں تقسیم کر دے۔
(۳) دنیا کی اشیاء کا ارادہ اور انہیں پسند کرنا ترک کر دے۔

جس شخص میں یہ تین صفتیں موجود ہوں وہ زاھد ہے۔

لیکن زہد غیر مقدور یعنی وہ جو بندے کے اختیار میں نہیں، یہ ہے کہ اس کا دل دنیوی اشیاء کو حاصل کرنے کے شوق سے سرد پڑ جائے۔ زہد غیر مقدور زہد مقدور کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ زہد مقدور غیر مقدور کا ذریعہ و سبب ہے۔ جو اشیاء بندے کے پاس نہ ہوں، جب ان کی طلب چھوڑ دے، اور موجود اشیاء کو راہِ خدا میں بانٹ دے۔ اور ثواب آخرت کی نیت سے دنیا و اسباب دنیا کی آفات یاد کرتے ہوئے بندہ جب آئندہ کے لیے مال دنیا کے حاصل کرنے کا ارادہ اور اس کی چاہت دل سے نکال دے تو اس کے ذریعہ دل میں دنیا کی طلب سرد پڑ جائے گی۔ اور دنیا و اسباب دنیا کی طلب سے دل کا سرد پڑ جانا ہی حقیقی زہد ہے۔

پھر یہ جاننا چاہیے کہ زہد مقدور کی تیسری جزء یعنی طلب دنیا کا ارادہ بھی دل سے نکال دینا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ بہت ایسے ہیں جو اوپر اوپر سے تو تارکِ دنیا ہیں مگر ان کے دلوں میں دنیا کی محبت چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ ایسا شخص اسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ حالانکہ زہد کی اصل شان اس تیسری جزء سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ کیا تم نے اللہ بلند و بزرگ کے یہ ارشادات نہیں سُنے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۔ (پ۲۰)

ہم آخرت کا گھر صرف ان لوگوں کو عطا کریں گے جو دنیا میں سرکشی و فساد کا ارادہ تک نہیں کرتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخلے کا حکم ان لوگوں کے لیے بتایا ہے جو سرکشی و فساد کا ارادہ نہیں کرتے۔ ان کیلئے نہیں بتایا جو سرکشی و فساد طلب نہیں کرتے یا عملی طور پر نہیں کرتے۔ ایک مقام پر فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۔ (پ ۲۵)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ رکھتا ہے ہم اسے اس کھیتی کی اور زیادہ توفیق دیتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرے ہم اسے کچھ دے دیتے ہیں۔ مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ ۔ (پ۱۵)

جو شخص اس دنیا کو چاہے ہم اس کو اپنی مشیت کے مطابق اس سے کچھ دے دیتے ہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (پ۱۵۔ بنی اسرائیل)

جس نے آخرت کو چاہا اور اس کے لیے کوشش کی۔

تو تم ان تمام مندرجہ بالا آیات کا مطالعہ نہیں کرتے کہ ان تمام میں ارادے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ ارادہ ایک بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن جب انسان پہلی دو چیزوں (یعنی موجود مال راہِ حق میں صدقہ کرنا اور غیر موجود کی طلب سے بے نیاز ہونا) پر عزم و استقلال سے عمل شروع کر دے۔ تو امید ہے کہ رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے طلبِ دنیا کے ارادے کو بھی کُلّی طور پر دل سے نکال دے گا کیونکہ وہ ذات نہایت فضل و کرم فرمانے والی ہے۔ پھر جس چیز سے راہِ خدا میں مال لگانے اور ترکِ دنیا پر مدد ملتی ہے۔ اور جو شئی اس سلسلے میں آسانی کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ آفاتِ دنیا

اور اس کے عیوب کو ذہن میں دُہرایا جائے۔

مذمتِ دنیا کے متعلق مشائخ رحمہم اللہ کے بہت اقوال ہیں چنانچہ بعض مشائخ نے فرمایا ہے

ترکتها لقلة غنائها و سرعة	میرے دنیا سے متنفر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ
فنائها وخسة شركائها۔	تھوڑا وقت انسان کو دولتمند کرتی ہے اور جلدی

فنا ہو جاتی ہے۔ اور جتنے اس کے طالب ہیں سب خسیس اور کمینے ہیں۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مندرجہ بالا قول سے بھی دنیا کے ساتھ تعلق کی بو آتی ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی شئ سے جدائی کا شکوہ کرتا ہے وہ درحقیقت اس کے وصال کا آرزومند ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی شئ سے اس بنا پر علیحدگی اختیار کرتا ہے کہ اس میں اور بھی شریک ہیں۔ وہ درحقیقت اس امر کا خواہشمند ہوتا ہے کہ کاش میں اکیلا ہی اس کا مالک ہوتا۔ اس لیے مذمت دنیا کے متعلق زیادہ درست وہی ہے جو میرے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا:

الدنيا عدو الله وانت محبه و	دنیا خدا کی دشمن ہے اور تو خدا کا دوست ہے
من احب احدا ابغض عدوه	اور قاعدہ ہے کہ جو کسی کو دوست رکھتا ہو وہ
	اپنے دوست کے دشمن کو بھی اپنا دشمن سمجھتا ہے۔

میرے شیخ نے یہ بھی فرمایا:

لان الدنيا فی اصلها وسخة	کیونکہ یہ دنیا درحقیقت میلے کچیلے مردار کی مانند
جيفة الا ترى ان اخرها الى	ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس کے لذیذ کھانے تھوڑی
القذر والفساد والتلاشی و	دیر میں بدبودار گندگی بن جاتے ہیں اور انجام کار
الاضمحلال والنفاد لكنها	اس کی زیب زینت والی چیزیں خراب، پژمردہ
ضمخت بطيب و طويت	اور فنا و معدوم ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کے ظاہر کو خوشبو
بزينة۔	دار اور مزین کر دیا گیا ہے۔

تو غافل اس کے ظاہر کو دیکھ کر اس کے دھوکے میں آ گئے۔ مگر دانا لوگوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔

سوال: کیا زہد اختیار کرنا فرض ہے یا نفل؟

جواب: مشائخ اہل سنت کے نزدیک زہد دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک حرام سے، دوسرے

حلال سے۔ حرام اشیاء سے زہد فرض ہے اور حلال سے مستحب۔ پھر جن لوگوں کو طاعات وعبادات میں استقامت حاصل ہے ان کے نزدیک حرام ایک نجس اور مردار چیز کی طرح ہے۔ خدانخواستہ اگر اس کے استعمال کی ضرورت پیش آئے تو بہت معمولی اور بقدر ضرورت استعمال کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ مگر ابدال و کاملین کے نزدیک حلال بھی ضرورت سے زائد استعمال کرنا مردار کی مانند ہے۔ وہ حلال بھی بقدر ضرورت وحاجت ہی استعمال کرتے ہیں۔ باقی رہا حرام تو وہ ان کے نزدیک آگ کی مانند ہے۔ اس کے استعمال کا انہیں وہم تک نہیں آتا۔ دل کے دنیا سے نکل جانے کا یہی مطلب ہے کہ طلب دنیا کے پراگندہ خیالوں سے دل پاک وصاف ہو جائے۔ اور یہاں تک دنیا کی نفرت دل میں جاگزیں ہو جائے کہ وہ اسے سخت گندی اور مکروہ شئی سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ طلب دنیا کا کوئی داعیہ دل میں نہ رہے۔

سوال :

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عجیب عجیب شہوتوں اور لذتوں سے آراستہ پیراستہ دنیا کو انسان آگ یا ایک گندے مردار کی طرح سمجھنے لگے۔ خاص کر ہم جیسے کمزور خلقت اور ضعیف طبیعت تو بالکل ایسے نہیں ہو سکتے۔

جواب :

اللہ تعالیٰ جس انسان کو اپنی خاص توفیق سے نوازتا ہے اور جو آفات دنیا سے واقف و آگاہ ہو جاتا ہے تو دنیا اسے ایسی ہی حقیر وذلیل معلوم ہوتی ہے۔ مگر جو بیوقوف اس کے عیوب اور اس کی آفات سے اندھا رہے اور اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ زینت سے فریب خوردہ ہو وہ دنیا کے متعلق ایسے تصور سے تعجب ہی کرتا ہے۔ اور وہ دنیا کو حقیر وذلیل سمجھنا ناممکن خیال کرتا ہے۔ میں ایک ایسی مثال دیتا ہوں جس سے دنیا کی حقیقت تم پر روشن اور واضح ہو جائے گی۔

ایک شخص پوری اشیاء ڈال کر نفیس اور عمدہ حلوہ تیار کرے۔ مگر تیار کرنے کے بعد اس میں زہر قاتل کا ایک قطرہ ڈال دے۔ زہر ڈالتے وقت ایک شخص تو دیکھ رہا تھا، مگر دوسرا اس سے بے خبر تھا۔ جب دونوں کے سامنے وہ بہترین اور عمدہ حلوہ کھانے کے لیے رکھا جائے گا تو جسے زہر کی ملاوٹ کا علم ہے وہ ہرگز اس کے کھانے کی طرف راغب نہیں ہوگا۔ بلکہ کھانے کا خیال بھی نہیں کرے گا۔ اور اس کے

نزدیک یہ حلوہ پیٹ میں آگ ڈالنے سے بھی زیادہ مشکل ہوگا۔ کیونکہ وہ اس کی اندرونی آفت سے واقف ہے۔ وہ اس کی ظاہری عمدگی اور نفاست سے دھوکے میں نہیں آئے گا۔ مگر دوسرا شخص جسے آمیزش زہر کا علم نہیں، وہ اس کی ظاہری عمدگی و نفاست سے فریب میں آ جائے گا۔ وہ حرص و لالچ سے حلوے پر ٹوٹ پڑے گا اور اپنے ساتھی پر اس حلوے سے نفرت کی وجہ سے تعجب کرے گا۔ بلکہ اسے احمق اور بیوقوف خیال کرے گا۔ دنیا کی حرام اشیاء بھی بعینہٖ اسی طرح ہیں جو اہلِ بصیرت استقامت کے ساتھ شریعت حقہ کے راستے پر گامزن ہیں وہ تو اس سے سخت متنفر ہیں۔ مگر حرام کے نقصانات سے بے خبر لوگ اس پر فدا ہو رہے ہیں۔

اور اگر حلوہ تیار کرنے والے نے اس میں زہر کی ملاوٹ نہ کی ہو، بلکہ اس میں تھوک دیا ہو یا ناک صاف کی ہو، اور اس تھوک وغیرہ کو حلوہ میں ملا کر اوپر سے اچھی طرح درست کر دیا ہو، تو جو آدمی اس کارروائی کو دیکھ رہا ہو، وہ تو اس حلوے سے کراہت اور نفرت کا اظہار کرے گا، اور سوائے اشد ضرورت کے اسے کھانے پر رضامند نہیں ہوگا لیکن جو شخص مذکورہ کارروائی سے ناواقف ہوگا وہ اس کی عمدگی اور نفاست سے متاثر ہو کر خوشی خوشی سب چٹ کر جائے گا۔ بلکہ اس پر فرحت و پسندیدگی کا اظہار کرے گا۔

یہ دنیا کے حلال کی مثال ہے۔ جو اہلِ بصیرت و استقامت ہیں وہ تو اسے صرف بقدرِ حاجت استعمال میں لاتے ہیں، مگر اہلِ غفلت اسے من و سلویٰ کی طرح اُڑاتے ہیں۔ دیکھیے یہاں دونوں قسم کے لوگوں کی خلقت و طبیعت تو برابر ہے، مگر علم و بصیرت، جہالت و خفا کی وجہ سے دونوں کے افعال میں کتنا فرق ہے۔ اگر اس جاہل و ناواقف کو آمیزش زہر کا علم ہوتا تو ضرور وہ اس سے اجتناب کرتا۔ اور اگر اس واقف آدمی کو مذکورہ آمیزش کا پتہ نہ ہوتا تو وہ اس بے خبر شخص کی طرح بلا توقف سب حلوہ ہڑپ کر جاتا۔ تمہیں اس بیان کردہ مثال سے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ یہ فرق طبیعت و خلقت کی وجہ سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی بنا پر ہے۔ یہ فرق ایک ٹھوس اور پختہ چیز ہے۔ ہر با انصاف اور عقلمند اس کی درستی کا اعتراف کرے گا ——— اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہدایت و توفیق کا مالک ہے۔

سوال: کچھ نہ کچھ دنیا کا ہونا تو ضروری ہے۔ جس سے ہماری اور ہمارے اہل و عیال کی

زندگی قائم رہ سکے۔ تو دنیا سے کُلی طور پر علیحدگی کیسے ہو سکتی ہے ؟

جواب :

زہد سے مقصود یہ ہے کہ فضول، زائد اور غیر ضروری اشیاء سے اجتناب کیا جائے۔ غرضیکہ صرف اس قدر طاقت و قدرت موجود رہے جس سے عبادت و طاعتِ خداوندی ادا ہو سکے۔ محض کھانا پینا اور لذت گیر ہونا مقصود نہ ہو۔ اور خدا تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت ہے کہ تمہیں سبب و ذریعہ سے زندہ رکھے، یا بغیر کسی ظاہری سبب کے۔ جیسے ملائکہ، کہ ان مادی اسباب و ذرائع کے بغیر ہی زندہ ہیں۔ خدا تعالیٰ کو اس کی بھی طاقت ہے کہ تمہیں تمہارے پاس موجود شئے کے ذریعہ زندہ رکھے یا ایسی شئے مہیا فرما دے جس کا تمہیں وہم و گمان تک نہ ہو۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا	جو تقویٰ و پرہیز گاری کی راہ اختیار کرے تو اللہ
وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ	تعالیٰ اسے اس جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں کا
	اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

اس لیے اگر تم تقویٰ پر کاربند ہو جاؤ تو تمہیں بقاءِ حیات کے لیے طلبِ دُنیا وغیرہ کی حاجت نہیں۔ اور اگر زہد کا یہ درجہ تمہیں حاصل نہ ہو تو زادِ آخرت اور تقویٰ کی نیت سے تلاش کرو۔ شہوت رانی کی غرض سے تلاش نہ کرو۔ کیونکہ جب تمہاری نیت نیک ہو گی تو یہ طلب آخرت میں ہی شمار ہو گی۔ اور اس طرح تمہارے زہد میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس مذکورہ بیان کو اچھی طرح ذہن نشین کرو ——— وباللہ التوفیق۔

دُوسری رُکاوٹ مخلوق سے میل جول :

پھر مخلوق سے علیحدگی اور عزلت بھی لازم ہے، اور اس کے دو سبب ہیں:
ایک یہ کہ تم میل جول میں مبتلا ہو کر عبادت سے محروم ہو جاؤ گے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں ایک جماعت کے پاس سے گزرا جو بحث و مباحثہ میں مشغول تھی اور ایک شخص ان سے تھوڑی دور ہٹ کر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس سے گفتگو کرنی چاہی تو اس نے جواب دیا "میں ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کو تیرے ساتھ گفتگو کرنے سے زیادہ محبوب سمجھتا ہوں"۔ میں نے کہا تم یہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہو۔ تو اس نے کہا "میں اکیلا نہیں بلکہ میرے

ساتھ ایک میرا رب ہے اور دو کراماً کاتبین ہیں"۔ اس کے بعد میں نے اس سے سوال کیا، بحث مباحثہ کرنے والوں میں بہتر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا "جس کو خدا نے بخش دیا ہو"۔ میں نے پوچھا سیدھی راہ کونسی ہے؟ تو اس نے ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور کھڑا ہو کر چل پڑا۔ چلتے وقت وہ یہ کہہ رہا تھا "اے اللہ تیری اکثر مخلوق مجھے تیرے ذکر سے غافل رکھنے کی کوشش کرتی ہے"۔

تو معلوم ہوا کہ مخلوق کے ساتھ تعلقات عبادت سے غافل کر دیتے ہیں، بلکہ عبادت سے روک دیتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ہلاکت اور برائی میں ڈال دیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"میں نے مخلوق سے پانچ چیزیں طلب کیں مگر نہ مل سکیں۔ میں نے ان سے کہا زہد و طاعت میرے لیے مہیا کرو، مگر وہ نہ کر سکے۔ میں نے کہا زہد و طاعت میں میری اعانت ہی کرو، مگر وہ اعانت بھی نہ کر سکے۔ میں نے کہا اگر زہد و طاعت کے لیے تم سے کنارہ کشی کروں تو ناراض نہ ہونا، مگر وہ کنارہ کشی پر ناراض ہو گئے۔ میں نے کہا زہد و طاعت کے حاصل کرنے میں تم رکاوٹ نہ بننا، مگر وہ روکنے سے باز نہ آئے۔ اخیر میں نے کہا مجھے خدا کی نافرمانی کی طرف تو نہ بلاؤ، مگر انھوں نے میری اس بات کو بھی تسلیم نہ کیا۔ جب لوگوں سے میری کوئی مراد بھی پوری نہ ہوئی تو میں ان سے کنارہ کش ہو گیا اور اصلاح نفس میں مشغول ہو گیا۔

اے عزیز! نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گوشہ نشینی کی حقیقت، گوشہ نشینی کے زمانے اور اس زمانے کے لوگوں کی وضاحت فرما دی ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ جب وہ وقت اور زمانہ آئے تو مخلوق سے یکسر کنارہ کش ہو جانا، ورنہ تمہارا دین تباہ اور آخرت برباد ہو جائے گی۔ اور یہ واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم امت کے مصالح ہم سے زیادہ جانتے تھے، اور آپ ہم سے زیادہ ہمارے خیر خواہ تھے۔ تو اگر تم وہ زمانہ پاؤ جس میں آپ نے عزلت کا حکم دیا ہے، تو آپ کے حکم کی ضرور تعمیل کرو اور آپ کی نصیحت پر عمل کرو اور ایسا وہم بھی نہ کرو کہ ہم اپنی بھلائیوں کو حضور سے بہتر جانتے ہیں۔ اور عزلت و گوشہ نشینی کے ترک کے لیے پھر و بیہودہ تاویلات نہ کرو۔ اور رقیق حیلوں کے ذریعہ اپنے دل کو نہ بہلاؤ۔ اگر اس نازک وقت میں حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل نہیں کرو گے تو ہلاک و برباد ہو جاؤ گے اور آخرت میں تمہارا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔

ایک مشہور حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے گوشہ نشینی کے وقت کی تشریح کر دی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں "ایک دفعہ ہم حضورؐ کی خدمت میں حاضر

تھے۔ فتنوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ تو آپ نے فرمایا:

اذا رایتم الناس مرجت	جب تم دیکھو کہ لوگ وعدہ خلافی میں مبتلا ہو جائیں
عهودهم وخفت اماناتهم	اور امانت میں خیانت کرنے لگیں اور لوگوں میں
وکانوا هکذا و شبك بين	بیجا اختلاط بڑھ جائے (اور بیجا اختلاط کا تذکرہ
اصابعه فالزم بیتك واملك	کرتے ہوئے آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک
علیك لسانك۔ وخذ ما تعرف	دوسری میں ڈال دیں) تو اس وقت شدید ضرورت
ودع ما تنکر وعلیك بامر	کے بغیر گھر سے باہر نہ نکل۔ اپنی زبان پر کنٹرول کر نیک
الخاصة ودع عنك امر	کام اختیار کر برائی سے اجتناب کر عزلت کو اپنے
العامة۔	اوپر لازم پکڑ، اور میل جول سے پوری طرح احتراز کر

ایک اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زمانہ عزلت کی یہ نشانی بیان فرمائی ہے:

ذلك ایام الهرج۔ یعنی اس وقت گوشہ نشینی لازم ہے جب ہرج عام ہو۔ حاضرین نے عرض کیا "ہرج" سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا جب کوئی شخص اپنے ہمنشین سے بے خوف اور مطمئن نہ ہو۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے حرث بن عمیرہ کو فرمایا:

ان یدفع عن عمرك فسیاتی	اگر تیری عمر نے وفا کی تو تو ایسا زمانہ پائے گا جس میں
علیك زمان کثیر خطباءه قلیل	خطیب بہت ہوں گے لیکن جامع عالم کم ہوں گے
علماءه کثیر سواله قلیل معطوه	گداگر بہت ہوں گے لیکن انہیں دینے والے بہت
الهوی فیه قائد العلم	کم ہوں گے۔ اور علم خواہشات کے تابع ہو جائے گا

حضرت حرث بن عمیرہ نے عرض کیا ایسا زمانہ کب آئے گا؟ تو آپ نے فرمایا:

اذا امیت الصلوة وقبلت الرشاء	جب نمازوں کی پرواہ نہیں ہوگی۔ رشوت کا لین
ویباع الدین بعرض یسیر من	دین عام ہوگا، اور دین ومذہب حقیر دنیا کے عوض
الدنیا فالنجاء النجاء ثم	فروخت کر دیا جائے گا۔ ایسے وقت میں بچنا
ویحك النجاء۔	آپ نے بچنے کا لفظ تین بار دہرایا۔

میں کہتا ہوں حضورؐ نے زمانہ عزلت کی جو علامات بتائی ہیں وہ سب کی سب ہمارے زمانے میں موجود ہیں۔ (امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پانچ سو ہجری کی حالت بیان کر رہے ہیں ۔ آج چودھویں صدی کا اخیر ہے۔ اس میں عزلت گزینی کی اہمیت و ضرورت کا خود اندازہ لگالیں

پھر سلف صالحین ایسے خراب وقت کے لوگوں سے علیحدہ رہنے کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ وہ خود تمام عمر میل جول اور اختلاط سے کنارہ کش رہے' اور دوسروں کو اس کی تاکید فرماتے رہے۔ ور بلاشبہ وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ صاحب بصیرت تھے۔ ان کے بعد کا زمانہ ان کے زمانے سے بہتر نہیں' بلکہ دینی اعتبار سے زیادہ تلخ اور خراب ہے۔

حضرت یوسف بن اسباط نے فرمایا کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خدا کی قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہمارے زمانے میں گوشہ نشینی جائز ہوگئی ہے۔ میں (امام غزالی) کہتا ہوں اگر ان کے زمانے میں جائز تھی تو ہمارے زمانے میں فرض ہوگئی ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے حضرت عباد الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

اما بعد فانك فی زمان كان اصحاب رسول الله صلى الله تعالیٰ علیه وسلم یتعوذون بالله من ان یدركوه فیما بلغنا ولهم من العلم مالیس لنا فكیف بنا حین ادركناه على قلة علم وقلة صبر وقلة اعوان على الخیر وكدر من الدنیا وفساد من الناس فان عمر بن الخطاب رضی الله تعالیٰ عنه قال: فی العزلة راحة من خُلَطاءِ السُّوْءِ۔	اما بعد' تو ایسے زمانے میں ہے جس سے حضورؐ کے صحابہ پناہ مانگتے تھے۔ حالانکہ وہ ہم سے زیادہ عالم تھے۔ اب ہمارا کیا حال ہوگا' جبکہ ہم اسی خطرناک زمانے میں ہیں' اور پھر ہم علم میں ان سے کم ہیں' صبر میں کم ہیں اور نیکی پر اعانت کرنے والے بھی اب کم ہیں۔ اور دنیا بہ نسبت اُس وقت کے اِس وقت زیادہ خراب ہے۔ اور لوگوں میں فساد بھی زیادہ آگیا ہے۔ اسی لیے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "برے ہمنشین سے کنارہ کشی میں راحت ہے۔

یہ مندرجہ ذیل عربی اشعار بھی اسی سلسلے میں کہے گئے ہیں:

(۱) ھٰذا الزمان الذی کنا نحاذرہ — فی قول کعب وفی قول ابن مسعودؓ

(۲) دَھْرٌ بہ الحقُّ مردود باجمعہ — والظلم والبغی فیہ غیر مردود

(۳) اعمی اصم من الازمان ملتبس — فیہ لابلیس تصویب وتصعید

(۴) ان دام ھذا ولم تحدث لہ غیر — لم یبلٰ میت ولم یفرح بمولود

(۱) ترجمہ: ہمارا یہ زمانہ وہی ہے جس سے ہمیں حضرت کعبؓ و حضرت ابن مسعودؓ کے قول میں ڈرایا گیا ہے۔

(۲) یہ ایسا زمانہ ہے جس میں حق مردود ہے اور ظلم و بغاوت مقبول و محبوب ہے۔

(۳) اس وقت دین سے اندھے اور بہرے مسلمانوں میں رل مل گئے ہیں' اور اس وقت ابلیس کو سچا اور بلند خیال کہا جاتا ہے۔

(۴) اگر اس زمانے کی نازک حالت یہی رہی اور اس میں کوئی بہتر تبدیلی رُونما نہ ہوئی تو اس کے مرنے والوں پر نہ اظہار افسوس لائق ہوگا اور نہ نئے پیدا ہونے والوں پر اظہار مسرت مناسب ہوگا۔

اور میں (امام غزالیؒ) نے سُنا ہے کہ ایک دفعہ حضرت سفیان بن عیینہ نے حضرت سفیان ثوری سے کہا "مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ تو آپ نے فرمایا: "اقلل من معرفة الناس" یعنی "لوگوں سے میل جول اور تعارف کم رکھ"۔ تو سفیان بن عیینہ نے کہا "اللہ آپ پر رحم کرے' حدیث میں تو آیا ہے اکثروا من معرفة الناس فان لکل مؤمن شفاعة۔ یعنی "لوگوں سے تعارف بڑھاؤ۔ کیوں کہ ہر واقف مومن دوسرے مومن کی شفاعت کرے گا"۔ تو حضرت سفیان ثوری نے اس کے جواب میں فرمایا "میرا غالب گمان یہی ہے کہ تجھے جو تکلیف اور ایذا پہنچی ہوگی وہ کسی واقف کار ہی سے پہنچی ہوگی" حضرت سفیان ثوریؒ نے یہ الفاظ کہے اور فوت ہو گئے۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو بعد وفات خواب میں دیکھا کہ آپ بلند مراتب پر فائز ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی نصیحت کیجیے۔

تو آپ نے فرمایا:

اقلل من معرفة الناس ما استطعت — جہاں تک ہو سکے لوگوں سے تعارف و واقفیت

فان التخلص منھم شدیدا۔ — کم رکھ کیونکہ مخلوق کے اختلاط سے خلاصی پانا سخت

ایک عربی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

(۱) وما زلت مذلاح الشیب بمفرق — افتش عن هذا الوری واکشف

(۲) فما ان عرفت الناس الا ذممتهم — جزی الله خیرا کل من لست اعرف

(۳) وما لی ذنب استحق به الجفا — سوی اننی احببت من لیس ینصف

(۱) میں لوگوں کے حالات کی تفتیش اور ان سے تعارف پیدا کرنے میں مصروف رہا یہاں تک میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا۔

(۲) تو میری جن سے بھی واقفیت ہوئی میں نے ان کی برائی ہی کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو نیک جزا دے جن کو میں نہیں جانتا۔

(۳) وہ غلطی جس کے باعث میں زیادہ قابل مذمت ہوں یہی ہے کہ میں نے ان کو دوست بنایا جو انصاف و وفا سے نا آشنا تھے۔

ایک مکان کے دروازے پر یہ الفاظ تحریر تھے:

جزی الله من لا یعرفنا خیرًا. ولا جزی بذلك اصدقائنا فما اوذینا قط الا منهم۔

اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے جن کو ہم نہیں جانتے مگر انہیں نہ دے جو ہمارے دوست ہیں۔ کیوں کہ ہمیں جو ایذا و تکلیف پہنچی ہے وہ دوستوں ہی سے پہنچی ہے

عربی کے یہ دو شعر بھی اسی سلسلے میں کہے گئے ہیں:

(۱) جزی الله عنا الخیر من لیس بیننا — ولا بینه وُدٌّ ولا نتعارف

(۲) فما مسنا هم ولا نالنا اذی! — من الناس الا من نود ونعرف

(۱) اللہ اس کو جزائے خیر دے جس کی ہم سے کوئی دوستی اور تعارف نہیں۔

(۲) کیونکہ ہمیں جو بھی غم یا ایذا پہنچی ہے وہ اپنے دوستوں اور واقف کاروں ہی سے پہنچی ہے۔

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

هذا زمان احفظ لسانك واخف مكانك وعالج قلبك وخذ ما تعرف ودع ما تنكر۔

اس نازک دور میں اپنی زبان کی حفاظت کر اپنے مکان کو مستور رکھ۔ اپنے قلب کی اصلاح کر، نیک کام اختیار کر اور برائی سے اجتناب کر۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانے کے متعلق فرمایا:

هذا زمان السكوت ولزوم البيوت ۔ والرضاء بالقوت ۔ الى ان تموت	یہ خاموشی اختیار کرنے کا زمانہ ہے۔ اس وقت گھر کی چار دیواری کے اندر رہتے ہیں ہی امن ہے اور معمولی معاش پر گزر بسر کرنا ہی بہتر ہے یہاں تک کہ موت آ جائے۔

اور حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے:

صم عن الدنيا. واجعل فطرك الاخرة وفر من الناس فرارك من الاسد ۔	دنیا میں روزہ سے رہ آخرت میں جا کر یہ روزہ افطار کر۔ اور لوگوں سے اس طرح دُور بھاگ جس طرح شیر سے بھاگتا ہے۔

حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا:

ما رأيت حكيما قط الا قال لى عقب كلامه ان احببت الا تُعرف فانت على بالى	میں نے جس دانا کو بھی دیکھا اور اس سے گفتگو کی اس نے آخر یہی کہا کہ اگر تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگوں میں تیری جان پہچان نہ ہو تو پھر تیرا اللہ کے ہاں کچھ مقام ہے۔

اس قسم کی روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر کتاب میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ ہم نے اس قسم کی روایات کو ایک مستقل کتاب میں جمع کر دیا ہے جس کا نام ہم نے "اخلاق الابرار والنجاۃ من الاشرار" رکھا ہے، اس کا مطالعہ کرو۔ تمہیں اس میں عجیب و غریب معلومات ملیں گی۔ اور عقلمند کو تو اشارہ ہی کافی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

دوسرا سبب جس کے باعث مخلوق سے علیحدگی ضروری ہے، یہ ہے کہ لوگوں میں مخلوط رہ کر تمہاری عبادت و طاعت تباہ و برباد ہو جائے گی، الا ماشاء اللہ۔ وہ اس طرح کہ لوگوں میں رہ کر تم ریا، خود ستائی اور زینت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہی بہتر فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

رؤية الناس بساطه الرياء	لوگوں کا دیکھنا ریا کی چٹائی ہے۔

بزرگوں نے ریا کے خوف سے لوگوں سے ملاقات اور ایک دوسرے کی زیارت ترک کر دی تھی۔ روایات میں مذکور ہے کہ حضرت ہرم بن حیان نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا "ہمیں ملاقات و زیارت کے ذریعہ اپنے ساتھ ملائے رکھیے"۔ تو آپ نے فرمایا "میں نے تجھے ان دوسے بھی زیادہ نافع شئے کے ذریعہ اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ اور وہ تیری عدم موجودگی میں تیرے حق میں دعائے خیر ہے۔ ملاقات و زیارت ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اس سے ریاء و زینت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ حضرت سلیمان خواص رحمۃ اللہ علیہ کے شہر میں تشریف لائے تو لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ الرحمۃ کو کہا "آپ حضرت ابراہیمؒ سے ملاقات کو نہیں جاتے"؟ تو آپ نے جواب دیا "ابراہیم بن ادہم کی بجائے سرکش شیطان سے ملاقات کرنے کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ لوگوں نے ایسے جواب پر بُرا منایا تو آپ نے فرمایا "مجھے اس چیز کا ڈر ہے کہ جب میں ان سے ملاقات کروں گا تو ان کے ساتھ گفتگو اور علیک سلیک میں تکلف اور تزئین کروں گا لیکن اگر شیطان کو دیکھ پاؤں تو اس سے بچنے اور پناہ کی تدبیر کروں گا۔

ایک دفعہ میرے (امام غزالیؒ کے) شیخ کی کسی عارف کامل سے ملاقات ہو گئی۔ دیر تک دونوں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو رہے۔ پھر اختتام کلام پر ایک دوسرے کے لیے دعائے خیر کی۔ علیحدہ ہوتے وقت میرے شیخ نے اس عارف سے مخاطب ہو کر کہا "میں آج کی مجلس کو بہترین مجلس تصور کرتا ہوں"۔ اس عارف نے جواباً کہا "میں اسے ایک خطرناک مجلس تصور کرتا ہوں۔ کیا دوران گفتگو ہم اپنی اپنی گفتگو کو مزین اور اپنے اپنے علوم کو ایک دوسرے پر ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے اور کیا اس طرح ہم ریا و تکلف میں مبتلا نہیں ہو گئے تھے"؟ یہ سُن کر میرے شیخ رو پڑے اور اتنے روئے کہ آپ کو غشی آ گئی ——— یہ واقعہ پیش آنے کے بعد آپ اکثر مندرجہ ذیل اشعار دُہرایا کرتے تھے:

(۱) یا ویلنا من موقف ما بہ ۔۔۔ اخوف من ان یعدل الحاکم

(۲) ابارز اللہ بعصیانہ ۔۔۔ ولیس لی من دونہ راحم

(۳) یارب عفوا منک عن مذنب ۔۔۔ اسرف الا انہ نادم!

(۴) یقول فی اللیل اذا ناداہ ۔۔۔ اٰھا لذنب ستر العالم

(۱) ہمارے موقف ورو یئے پر افسوس! کہ حقیقی عدل کے وقت یہ انتہائی خوفناک نتائج کا موجب ہوگا۔

(۲) میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اس کے عذاب کو چیلنج کر رہا ہوں۔ حالانکہ اس غفور و رحیم کے سوا مجھ پر کوئی رحم کرنے والا بھی نہیں۔

(۳) اے اللہ! میں اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے اگرچہ گناہ کر کے انتہائی زیادتی کی ہے مگر میں اس پر نادم ضرور ہوں۔

(۴) جب اندھیری رات کائنات میں تاریکی پھیلا دیتی ہے۔ اس وقت میں درگاہ خداوندی میں آہ و زاری شروع کر دیتا ہوں جس نے میرے گناہوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

مندرجہ بالا اُن لوگوں کی ملاقات کا حال ہے جو زہد و ریاضت میں اپنی مثال آپ تھے، تو دنیادار اور فضول و بیہودہ لوگوں کی آپس میں ملاقات کے نتائج جو ہوں گے ان کا قیاس تم خود کر لو۔

اے عزیز! زمانہ اعتقادی و عملی فسادات کا گہوارہ بن چکا ہے۔ لوگ ضرر رسانی میں حد سے گزر گئے ہیں۔ وہ تجھے عبادت سے باز رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ان میں رہتے ہوئے تو آخرت کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ بلکہ تیری سابقہ نیکیاں بھی سب کی سب ضائع ہو جائیں گی اس لیے عزلت و گوشہ نشینی کے سوا تیرے لیے کوئی چارہ نہیں۔ (خدا اس زمانے کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے)

سوال:

کن کن لوگوں پر عزلت و گوشہ نشینی لازم ہے؟ اور عزلت کے اعتبار سے لوگ کتنے طبقات میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں؟ اور عزلت کی حد کیا ہے جس کا نگاہ رکھنا ضروری ہے؟

جواب:

اے عزیز! تو جان کہ عزلت کے اعتبار سے لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:

ایک وہ جو نہ عالم ہیں اور نہ حاکم۔ ایسے لوگوں کی طرف مخلوق محتاج نہیں۔ تو ایسے لوگوں کو چاہیے کہ مخلوق سے الگ اور علیحدہ رہیں۔ صرف جمعہ، جماعت، عید، حج یا دینی مجلس میں شرکت کریں، یا معیشت کے لیے بقدر ضرورت میل جول کریں۔ اس کے علاوہ لوگوں سے الگ رہیں۔ کسی سے معرفت اور واقفیت پیدا نہ کریں۔ اور اگر اس قسم کا آدمی کسی مصلحت کی بنا پر لوگوں سے

بالکل ہی علیحدہ رہنا چاہیے اور کسی دینی یا دنیوی کام میں شرکت نہ کرنا چاہیے۔ تو اس شخص کے عزلت اختیار کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور میں سے کسی ایک امر کا ہونا ضروری ہے:

(۱) یا تو آبادی سے اتنا دور چلا جائے کہ جمعہ، جماعت وغیرہ احکام اس پر لازم نہ رہیں جیسے پہاڑوں کی چوٹیاں، یا دور دراز وادیاں بعض بزرگ جو عبادت کے لیے دور دراز مقامات پر چلے گئے ان کے جانے کی ایک وجہ شاید یہی تھی۔

(۲) دوسرا امر یہ ہے کہ ایسے شخص کو اس امر کا یقین ہونا چاہیے کہ لوگوں سے معمولی اختلاط سے بھی نقصان پہنچے گا۔ تو اس بنا پر اگر وہ جمعہ، جماعت وغیرہ میں بھی شریک نہ ہو تو وہ معذور ہے۔ اور میں نے خود مکہ معظمہ میں (اللہ اسے ہر حادثے سے محفوظ رکھے) بعض ایسے مشائخ کو دیکھا ہے جو بیت اللہ شریف کے بالکل قریب اور تندرست ہونے کے باوجود نماز کی جماعت میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ میں نے ایک دن ایک بزرگ سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے وہی وجہ بیان کی جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اختلاط سے نقصان پہنچتا ہے۔ میں کہتا ہوں، معذور پر کوئی ملامت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کے عذر کو خوب جانتا ہے۔ کیونکہ وہ سینوں کے راز جانتا ہے لیکن زیادہ بہتر اور مناسب یہی ہے کہ قریب رہتے ہوئے جمعہ، جماعت اور دیگر امور خیر میں شرکت کرے اور اس کے ماسوا علیحدہ رہے۔ اگر وہ دینی امور میں بھی شریک ہونا نہیں چاہتا تو آبادی سے اتنی دور سکونت اختیار کرے کہ مندرجہ بالا شرعی احکام اس پر لازم نہ رہیں۔ لیکن جو شخص ہے تو شہر یا آبادی میں ہی، مگر جمعہ جماعت وغیرہ میں شریک نہ ہو تو اس کا ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔

دوسرا طبقہ وہ لوگ ہیں جو دین کے اعتبار سے لوگوں کے مقتدا ہوں، خلاف شرع امور کی تردید اور اثباتِ حق میں مصروف ہوں، اور اپنے اقوال و افعال سے تبلیغ دین میں مشغول ہوں۔ تو ان علمائے کرام کو شرعاً عزلت کی اجازت نہیں۔ بلکہ ایسے حضرات پر لازم ہے کہ عامۃ الناس میں رہ کر دین کی نشر و اشاعت کریں۔ مخالفینِ اسلام اور فرقِ باطلہ کے شبہات کے جوابات دیں، اور احکام الٰہیہ کے پھیلانے اور واضح کرنے میں ہمہ تن مشغول رہیں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اِذَا ظَهَرَ الْبِدَعُ وَسَكَتَ الْعَالِمُ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ۔	جب خلاف شرع امور عام ہو جائیں اور عالم دین خاموش رہے تو ایسے عالم پر خدا کی لعنت۔

خلاصہ یہ کہ دینی پیشوا کے لیے کسی صورت میں عزلت روا نہیں۔ اُستاد ابوبکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ جب آپ نے عبادت کی غرض سے لوگوں سے علیحدگی کا ارادہ فرمایا اور پہاڑوں میں پہنچ گئے، تو ایک آواز دینے والے نے غیب سے آواز دی "اے ابوبکر، جب تو مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی حجت اور دلیل ہے تو تو انہیں چھوڑ کر کیوں یہاں آیا ہے"؟

اور مجھ سے مامون بن احمد نے بیان کیا کہ اُستاد ابواسحاق اسفرائنی رحمۃ اللہ علیہ نے جبل لبنان کے گوشہ نشینوں کو فرمایا "اے گھاس پھونس پر گزارا کرنے والو، تم سرکار دو عالم کی اُمت کو گمراہوں کے چنگل میں چھوڑ کر خود یہاں آ گئے ہو"؟ تو انہوں نے جواب دیا "ہمیں لوگوں میں رہنے کی طاقت نہیں اور خدا نے آپ کو قوت دی ہے۔ اس لیے آپ رہ سکتے ہیں"۔۔۔۔۔ اس کے بعد آپ نے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام "الجامع للخفی والجلی" رکھا۔

لیکن یہ علمائے کرام جس طرح علم میں بے مثل تھے عمل اور امورِ آخرت کی معرفت میں بھی سب سے آگے تھے۔ اے عزیز، جان لے کہ ایسے عالم میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو صبر، حلم، اپنے نفس کا محاسبہ اور ہمیشہ خدا تعالیٰ سے سلامتی کا طلب گار رہنا۔ دوسری یہ کہ باطن کے اعتبار سے لوگوں سے جدا رہے۔ اگرچہ ظاہری جسم کے اعتبار سے وہ ان کے ساتھ رہے۔ اگر لوگ اس سے کلام کریں تو ان سے کلام کرے۔ وہ اس کی زیارت کو آئیں تو حسب مراتب ان کا شکریہ اور احترام کرے۔ اور اگر لوگ اس سے اعراض کریں اور خاموشی برتیں تو وہ اسے غنیمت شمار کرے۔ نیک بات میں ان کا ہاتھ بٹائے اور اگر وہ برائی اور شرارت کی طرف مائل ہوں تو اُن کی مخالفت کرے اور ان سے الگ رہے۔ اور اگر لوگ اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے بُرائی سے باز آ سکتے ہوں تو انہیں مناسب ڈانٹ ڈپٹ بھی کرے۔ اور جو حقوق ان میں رہنے کے باعث اس پر لازم آتے ہیں ان کو ادا کرتا رہے۔ جیسے وقتاً فوقتاً ان سے میل ملاقات، بیماروں کی عیادت، اور حسب استطاعت ان کی حاجات پوری کرنا مگر ان سے کسی قسم کا مطالبہ نہ کرے۔ اور نہ اس کی اُمید رکھے حتی الوسع ان پر خرچ کرے مگر ان سے کوئی چیز نہ لے۔ جو تکلیف یا ایذاء ان سے پہنچے اسے برداشت کرے۔ اور ہر ایک کو خندہ پیشانی سے ملے۔ اپنے آپ کو ان کے سامنے بے پرواہ ظاہر کرے۔ اپنی حاجات ان سے پوشیدہ رکھے اور ان کا خود انتظام کرے۔ پھر ان باتوں کے ساتھ ساتھ نفلی عبادت کے لیے بھی چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت خاص کرے تاکہ اپنے ظاہر اور باطن کی اصلاح بھی جاری رکھ سکے۔ جیسا کہ حضرت

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا :

ان نمت اللیل لاضیعن نفسی و — اگر رات کو سوتا ہوں تو اپنی آخرت برباد کرتا

ان نمت النھار لاضیعن الرعیۃ — ہوں اور اگر دن کو نیند کروں تو رعیت تباہ ہوگی

فکیف بین ھاتین ۔ — تو ان دو باتوں کے ہوتے ہوئے مجھے بتاؤ کس طرح آرام

کا وقت نکال سکتا ہوں ۔

اسی مضمون کے موافق میں نے مندرجہ ذیل چند اشعار کہے ہیں ۔

(۱) فان کنت فی ھدی الائمۃ راغبًا — فوطن علی ان تنتحیک الوقائع

اگر تم اپنے اندر بزرگوں کی سیرت پیدا کرنے کے آرزومند ہو تو زمانے کے مصائب و حوادث برداشت کر کے اپنے اندر نرمی اور تواضع کو مضبوط کرو ۔

(۲) بنفس وقور عند کل ملمۃ — وقلب صبور وھو فی الصدر رائم

ہر تکلیف کے وقت نفس میں سنجیدگی اور قوت برداشت پیدا کرو ۔ دل کو صابر بناؤ اگر چہ وہ اس کے مانع ہے ۔

(۳) لسانک مخزون وطرفک ملجم — وسرّک مکتوم لدی الرب دائم

تمہاری زبان منہ میں بند رہنی چاہیے اور تمہاری آنکھیں لگام میں رہنی چاہییں ۔ تمہارا معاملہ لوگوں سے مستور رہو ۔ صرف خدا ہی کو اس کا علم ہو ۔

(۴) وذکرک مضمور وبابک مغلق — وثغرک بسام وبطنک جائع

تمہارا کوئی چرچا نہ ہو ۔ تمہارا دروازہ بند ہو ۔ تمہارا ظاہر خوش ہو اور پیٹ بھوکا ہو ۔

(۵) وقلبک مجروح وسوقک کاسد — وفضلک مدفون وطعنک شائع

تمہارا دل عشق مولیٰ سے زخمی ہو ۔ تمہارا بازار بے رونق ہو ۔ تمہارے کمالات مدفون ہوں اور تمہارے متعلق طعن و تشنیع عام ہو ۔

(۶) وفی کل یوم انت جارع غصۃ — من الدھر والاخوان والقلب طائع

ہمیشہ زمانہ اور اہلِ زمانہ سے مصائب و تکالیف کے گھونٹ پیتے رہو ۔ درانحالیکہ تمہارا دل شوق اطاعت سے لبریز ہو ۔

(۷) نهارك شغل الناس من غير منة   وليلك شوق غاب عنه طلائع

دن کو بغیر احسان جتائے نیک کاموں میں لوگوں کے ہاتھ بٹاتے رہو۔ اور رات لقائے الٰہی کے شوق میں کاٹ دو۔ اور اس ذوق و شوق کا کسی کو پتہ نہ ہو۔

(۸) فدونك هذا الليل خذه ذريعة   ليوم عبوس عز فيه الذرائع

تم ان موجودہ راتوں کی قدر کرو۔ ان کو اس سخت دن کا ذریعہ بناؤ جب ہر قسم کے ذرائع کامیابی مفقود ہوں گے۔

تو عالم دین پر لازم ہے کہ ظاہر میں تو لوگوں سے ملا رہے۔ مگر دل سے ان سے بالکل الگ رہے۔ اور خدا کی قسم یہ بہت مشکل اور تلخ ہے۔ اسی کے متعلق ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

يا بنى عش مع اهل زمانك ولا   اے میرے عزیز بیٹے اہلِ زمانہ کے ساتھ زندگی

تعتد بهم   تو گزار مگر کسی بات میں ان کی اقتداء نہ کر۔

پھر میرے شیخ نے فرمایا اس طرح کی زندگی بسر کرنا انتہائی تلخ اور مشکل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

خالط الناس وزايلهم۔   لوگوں سے حسب ضرورت خلط ملط اور لین دین رکھو مگر اپنے دین کو ضرر سے بچائے رکھو۔

میں کہتا ہوں جب فتنوں کی موجیں تلاطم میں ہوں۔ جب حق زوال پذیر ہو۔ جب لوگ دین سے منہ پھیر کر دوسری طرف متوجہ ہو جائیں اور کسی مومن کی قرابت یا عہد کا پاس لحاظ نہ کریں۔ جب لوگ عالم دین سے متنفر ہوں اور اسے نہ چاہیں، اور نہ دین کے معاملہ میں اس کی اعانت کریں۔ اور فتنے عوام وخواص میں پھیل جائیں، تو ایسے حال میں عالم اگر عزلت وعلیحدگی اختیار کرلے، اور اپنے علم کو پھیلانا ترک کر دے تو وہ معذور ہے۔ اور میں تو یہی کہتا ہوں کہ حضورؐ نے جس زمانے میں عزلت کا حکم دیا تھا وہ ہمارا ہی زمانہ ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں وہ سب امور موجود ہیں جن کی وجہ سے عزلت لازم وضروری ہو جاتی ہے۔ اور حقیقتاً مددگار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی پر توکّل کرنا چاہیے۔

یہ ہے عزلت اور گوشہ نشینی کا مختصر اور ضروری بیان، اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ کیونکہ اس میں غلط فہمی کا عظیم خطرہ ہے، اور زمانہ عزلت میں اس سے گریز کرنے میں سخت نقصان

ہے (و باللہ التوفیق)

سوال :

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو یہ حکم دیا ہے :

علیکم بالجماعۃ فان ید اللہ علی الجماعۃ وان الشیطان ذئب الانسان یاکل الشاذۃ والناجیۃ والقاصیۃ و الفاذۃ ۔	تم پر جماعت میں رہنا لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دست عنایت جماعت پر ہی ہے ۔ اور بلاشبہ شیطان انسان کے حق میں بھیڑیے کی مانند ہے، جو ریوڑ سے جدا ہونے والی یا آگے نکل جانے والی یا دور چلی جانے والی یا اکیلی رہ جانے والی بکری کو اڑا لے جاتا ہے ۔

اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے :

ان الشیطان مع الفذ وھو مع الاثنین اَبعَدُ ۔	تنہا آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور جب دو ہو جائیں تو ان کے قریب نہیں آتا ۔

جواب :

جہاں سرکار دو عالم علیہ السلام نے جماعت میں رہنے کی تاکید فرمائی ہے، وہاں یہ بھی فرمایا ہے :

الزم بیتك ۔ وعلیك بالخاصۃ ودع امر العامۃ ۔	اپنے گھر میں ہی رہ ۔ تنہائی اختیار کر اور عام میل جول سے سخت اجتناب کر ۔

تو اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے عوام سے الگ رہنے کا حکم دیا ہے ۔ اور اس حدیث اور پہلی حدیث کے درمیان درحقیقت کوئی تناقض یا اختلاف نہیں ۔ ہم بتوفیق الٰہی ان میں تطبیق عرض کرتے ہیں ۔

حضور علیہ السلام کے ارشاد علیکم بالجماعۃ میں تین احتمال ہیں :

(۱) دین اور احکام میں جماعت سے علیحدہ راہ اختیار کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ تمام امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی ۔ تو اجماعی مسائل اور بنیادی احکام میں جمہور سے علیحدگی باطل اور گمراہی ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنے دین کی حفاظت کی غرض سے تنہائی اختیار کرے تو اس حدیث میں اس کی ممانعت نہیں ۔

(۲) عام مسلمانوں سے نماز باجماعت اور جمعہ وغیرہ میں علیحدگی اختیار نہ کی جائے۔ کیوں کہ مل کر نماز و جمعہ ادا کرنے میں دین کو تقویت پہنچتی ہے' اسلام کا کمال ظاہر ہوتا ہے' اور کفار و ملحدین مسلمانوں کا اجتماع دیکھ کر جلتے ہیں۔ اور جمعہ و جماعات وغیرہ اسلامی اجتماعات پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اسی لیے ہم نے کہا ہے کہ گوشہ نشین شخص پر لازم ہے کہ جمعہ، جماعت وغیرہ دینی اجتماعات میں عام مسلمانوں کے ساتھ شریک رہے۔ اور اس کے سوا عام تعلقات اور میل جول سے پرہیز کرے۔ کیونکہ عام اختلاط میں بہت آفات اور نقصانات ہیں۔

(۳) علیکم بالجماعۃ میں تیسرا احتمال یہ ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد نیک زمانے میں ضعیف الاعتقاد شخص کے لیے ہے۔ لیکن قوی الاعتقاد، صاحب بصیرت شخص جب ایسے زمانے کو پائے جس میں فتنہ و فساد ہو اور جس سے حضور علیہ السلام نے ڈرایا ہے' اور جس میں عزلت کا حکم دیا ہے' تو اس کے لیے عزلت، خلط ملط اور میل جول سے بہتر ہے۔ تاکہ آفات و فسادات سے محفوظ رہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ دینی اجتماعات اور امور خیر میں شریک ہوتا رہے۔ اور اگر لوگوں سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو کسی پہاڑ کی چوٹی یا دور ویرانے میں نکل جائے۔ جس کے باعث اپنا دین محفوظ رکھ سکے۔

میں کہتا ہوں کہ ایسے شخص کو بھی چاہیے کہ نیک اجتماعات اور امور خیر میں ضرور شریک ہو۔ تاکہ اس کا یہ ثواب ضائع نہ ہو۔ اور اسلامی اجتماعات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ لوگوں میں فساد اور دین سے اعراض پایا جاتا ہو۔ اور ہم نے ابدال کے متعلق سنا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں' مذکورہ اجتماعات میں شرکت کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے رہتے ہیں' اور تمام زمین ان کے لیے ایک قدم ہے۔ اخبار میں آیا ہے کہ ابدال کے لیے زمین سمٹ جاتی ہے۔ انہیں اللہ کی طرف سے معزز خطابات، برکتیں اور انواع و اقسام کی روحانی نعمتیں عطا ہوتی رہتی ہیں ان ابدال کو اس عظیم کامیابی پر مبارک ہو۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت سے غفلت برتنے والوں کے حالات بھی اپنی رحمت کاملہ سے درست کرے۔ اور جو اپنی آخرت درست کرنے میں مصروف ہیں انہیں منزل مقصود تک پہنچائے ——— میں نے اپنی اس حالت زار کے متعلق یہ اشعار کہے ہیں:

(۱) ظفر الطالبون واتصل الوصل وفاز الاحباب بالاحباب

جدوجہد کرنے والے کامیاب ہو گئے۔ ان کو وصل کی سعادت نصیب ہو گئی۔ اور دوست دوستوں کی امداد واعانت سے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

(۲) وبقینا مذبذبین حیاری بین حد الوصال والاجتناب

اور ہم اسی طرح تذبذب وحیرانی کے عالم میں کھڑے ہیں اور ہجر ووصال کے درمیان معلق ہیں۔

(۳) وترتجی القرب بالبعاد وھذا نفس حال المحال للالباب

تمہارا حال تو یہ ہے کہ روز بروز خدا سے دور ہو رہے ہو۔ اور امید یہ رکھتے ہو کہ وہ تمہیں اپنا قرب نصیب کرے عقل انسانی ایسی امید کو بعید از عقل سمجھتی ہے۔

(۴) فاسقنا منک شربۃ تذھب الغم وتھدی الیٰ طریق الصواب

اے اللہ! ہمیں اپنا شربت وصال چکھا، جو ہر قسم کا غم دور کرتا ہے اور راہ ثواب کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(۵) یا طبیب السقام یا مرھم الجرح ویا منقذی من الاوصاب

اے ہماری ظاہری باطنی بیماریوں کے طبیب! اے ہمارے زخموں کی مرہم!! اور اے ہر قسم کی بیماری سے نجات دینے والے۔

(۶) لست ادری بما اداوی سقامی او بماذا افوز یوم الحساب

میں نہیں جانتا کہ میری بیماریوں کی دوا کیا ہے۔ یا کس شے کے ذریعہ روز قیامت میری نجات ہو گی۔

ہم اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں اور مسائل عزلت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

سوال: نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ:

رھبانیۃ امتی الجلوس فی المساجد۔ — میری اُمت کی عزلت یہی ہے کہ وہ مساجد کو اپنی نشستگاہ بنائے۔

اس حدیث میں لوگوں سے علیحدہ ہو کر کسی پہاڑ یا جنگل میں سکونت اختیار کرنے سے روکا گیا ہے اور لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے پر زجر کی گئی ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ لوگوں سے علیحدہ ہو کر کہیں دور چلا جائے؟

جواب :

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی اچھے زمانے کے لیے ہے، نہ کہ فتنہ و فساد کے زمانے کے لیے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مذکورہ حدیث کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو شخص مسجد کو اپنی نشست گاہ بنالے۔ لوگوں سے میل ملاپ چھوڑ دے اور ان کے معاملات میں مداخلت ترک کر دے۔ تو وہ اگرچہ بظاہر ان میں ہے مگر حقیقت میں ان سے جدا ہے۔ عزلت و گوشہ نشینی سے مقصود بھی یہی ہے۔ محض مکان یا جسم کی علیحدگی مقصود نہیں۔ اس نکتے کو اچھی طرح ذہن نشین کر۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مندرجہ ذیل ارشاد میں اسی نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

کن واحدا جامعیا۔ ومن ربك ذا أنس ومن الناس وحشیا۔	تم لوگوں سے بظاہر ملے جلے رہو۔ مگر تمہاری انسیت و محبت صرف رب تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ لوگوں سے تمہارا قلبی تعلق نہ ہو۔

سوال : مدارس دینیہ کے مدرسین اور شہروں میں مقیم صوفیائے کرام کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ کیونکہ وہ تو عزلت و گوشہ نشینی پر عامل نہیں ہیں؟

جواب : مدرسین کی تدریس اور صوفیائے عظام کی مجالس بہت اچھی چیزیں ہیں۔ اس میں دو فائدے ہیں:

(۱) قلبی طور پر لوگوں سے علیحدگی، ان کی مجالس اور ان کے معاملات میں شرکت اور اختلاط سے پرہیز۔

(۲) جمعہ، جماعات اور دیگر اسلامی امور میں شرکت۔

تو ان لوگوں کو وہی سلامتی حاصل ہو گی جو لوگوں سے بالکل علیحدہ رہنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ سلامتی کے ساتھ ساتھ ان حضرات سے ایک اور بہت بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ عوام ان کی اقتدا کرتے ہیں۔ ان کی برکات سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اور ان سے دین کے متعلق بیش قیمت پند و نصائح حاصل کرتے رہتے ہیں۔ تو ان حضرات کا حال درست رہتا ہے ان کو علم و عمل کی پختگی کی بدولت سکون و اطمینان میسر رہتا ہے۔ اسی فیض رسانی کے لیے اگر

عارفین لوگوں میں رہے ہیں۔ لوگوں کو ان کے حسن اخلاق کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔ بلکہ تکلیف کی بجائے ان سے فائدہ پہنچتا تھا۔ عامۃ الناس ان کے آداب و رسوم کی اقتداء کرتے تھے۔ اس طرح صالحین کے اخلاق لوگوں میں اسلامی اخلاق کو مضبوط کرنے کا ذریعہ بنتے رہے۔ ظاہر ہے کہ قال سے حال کی تبلیغ زیادہ مؤثر اور مفید ہوتی ہے۔ تو عارفین اور صالحین کا عوام میں رہنا تعمیر سیرت کے لحاظ سے بہت ہی مفید تھا۔

سوال: وہ مرید جو اکثر منازل تصوف طے کر چکا ہو۔ اسے ابتدائی مریدین کے ساتھ رہنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

جواب: وہ مبتدی اگر سلف صالحین کے آداب، ان کی سیرت اور ان کی رسوم پر دل سے قائم ہوں، تو ان کے ساتھ رہنے میں مضائقہ نہیں۔ وہ دین میں تمہارے بھائی اور ساتھی ہیں اور عبادت کے سلسلہ میں تمہارے معاون اور مددگار ہیں۔ ایسوں سے علیحدہ ہونا درست نہیں۔ ایسے مبتدی کوہِ لبنان وغیرہ کے تارک الدنیا زاہدوں کی طرح ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ کوہ لبنان کے زاہدین میں کئی ایسے گروہ ہیں جو تقویٰ اور نیکی میں لوگوں سے تعاون کرتے ہیں اور حق و صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ہاں وہ ابتدائی مریدین جو اسلاف کی سیرت، ان کی پاکیزہ رسوم اور ان کے پسندیدہ طریقے چھوڑ چکے ہوں۔ اور نامناسب، غیر متعلق اور بے فائدہ امور کو انہوں نے اپنا شعار بنا لیا ہو تو ان سے بھی اجتناب و علیحدگی اسی طرح ضروری ہے جس طرح دوسرے عام لوگوں سے طبقۂ جہلاء میں گھرے ہوئے مرید صادق کو چاہیے کہ اپنے گھر کے کسی گوشے کو اختیار کرے۔ اپنی زبان کو برائی سے روکے رکھے۔ نیک کاموں میں ان کے ساتھ شمولیت کرے۔ مگر ان کے احوال اور ان کی آفات سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ اس طرح یہ مرید صادق بھی صحیح عزلت نشین شمار ہوگا۔

سوال: اگر کوئی ریاضت و مجاہدہ کرنے والا مبتدی علماء کے مدارس اور صوفیائے کرام کی مجالس سے نکل کر کسی تنہا مقام پر اصلاح نفس اور دوسروں کی آفات سے بچنے کی غرض سے چلا جائے تو کیا اس کا جانا درست ہے؟

جواب: جاننا چاہیے کہ باعمل علماء کی دینی درس گاہیں اور طالب آخرت صوفیائے کرام کی مقدس خانقاہیں ایسے مرید کے لیے محفوظ قلعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مبتدی ان میں رہ کر دین کے

ڈاکوؤں اور چوروں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ان درس گاہوں اور خانقاہوں کے باہر کا خطہ ایسے صحراء کی مانند ہے جہاں ہر وقت شیطانی لشکر گھومتے رہتے ہوں جو قلعہ سے باہر رہنے والے کو ہلاک کر دیتے یا گرفتار کر لیتے ہوں۔ تو جو ریاضت و مجاہدہ کرنے والا مبتدی محفوظ قلعے سے نکل کر چاروں طرف سے شیطانی لشکروں کے نرغے میں آجائے اس کا جو حشر ہوگا، ظاہر ہے۔ اس لیے ایسے مبتدی کے لیے ان مدارس و مجالس سے باہر قدم رکھنا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں لیکن وہ شخص جو کامل ہو ایمانی بصیرت سے بہرہ ور ہو، دینی طور پر پختہ اور مضبوط ہو، اس کے لیے قلعہ اور صحرا مساوی ہے شیطانی لشکر اس پر ہرگز غالب نہیں آسکتے، اور نہ وہ ان کی شرانگیزیوں سے مرعوب ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ایسے شخص کے لیے بھی حفاظتی قلعہ میں ہی رہنا بہتر ہے۔ اس لیے کہ دشمنوں کے اتفاقی اور اچانک حملوں سے بے خوف ہونا درست نہیں۔ غرضیکہ اہل اللہ کے ساتھ رہنا، ان کی صحبت کی مشقتیں برداشت کرنا ہی بہتر ہے۔ اور ہر حال میں انہی سے طلب خیر کرنا اچھا ہے۔ اور صاحب استقامت و راسخ الحال پر عزلت لازم نہیں، مگر بہتر ضرور ہے۔

ان بیان کردہ مسائل عزلت پر اگر تم عمل کرو گے تو ان شاء اللہ آفات سے محفوظ رہو گے۔

سوال: دینی بھائیوں کی زیارت۔ اپنے مخلص احباب سے ملاقات اور ان کے ساتھ گفتگو وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

جواب: دینی بھائیوں کی زیارت و ملاقات جبکہ وہ نیک اور بزرگ ہوں، ایک اچھی چیز ہے ایسے اشخاص کی زیارت سے عبادت میں قوت، معاملات میں برکت، خدا کا قرب اور دل کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور دیگر بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن دو باتوں کا لحاظ بہت ضروری ہے:

(۱) حد سے تجاوز نہ ہو۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا:

زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا۔ ہماری زیارت کے لیے ناغہ کر کے آیا کرو تاکہ محبت زیادہ ہو۔

(۲) یہ کہ ریاکاری، اپنے آپ کو آراستہ کرنے، لغو گفتگو، غیبت اور بے فائدہ باتوں سے

پورے طور پر اجتناب کیا جائے۔ ورنہ فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔

حکایت:

ایک دفعہ حضرت فضیل اور سفیان ثوری رحمہا اللہ تعالیٰ کی آپس میں ملاقات ہوئی۔ دونوں بزرگ دیر تک مصروفِ گفتگو رہے، پھر دونوں رو پڑے۔ آخر میں حضرت سفیان ثوری نے کہا "میں آج کی اس صحبت کو بہترین صحبت تصور کرتا ہوں"۔ حضرت فضیل نے فرمایا "میں تو اسے ایک خطرناک صحبت خیال کرتا ہوں"۔ سفیان ثوری نے کہا کیوں؟ حضرت فضیل نے جواب دیا: "کیا ہم دونوں اپنی باتوں کو مزین اور آراستہ نہیں کر رہے تھے؟ اور کیا ہم تکلف و ریا میں مبتلا نہیں تھے"؟ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ یہ سن کر رو پڑے۔

تو چاہیے کہ احباب کی زیارت و ملاقات میں میانہ روی، احتیاط کو ملحوظ رکھا جائے اور ریا، تکلف وغیرہ سے اجتناب کیا جائے۔ ایسی ملاقات سے تمہاری عزلت میں کوئی فرق نہیں ہوگا، بلکہ فائدے کی امید ہے۔

سوال: کن چیزوں سے عزلت کی رغبت اور اس میں آسانی پیدا ہوتی ہے؟

جواب: تین چیزوں سے:

(۱) دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اکثر اوقات میں عبادت میں مشغولیت و مصروفیت سے۔ کیونکہ اصل مصروفیت یہی ہے۔ اور لوگوں سے بے ضرورت میل جول اور انسیت افلاس کی علامت ہے۔ جب تمہارا نفس بلا ضرورت و بلا حاجت لوگوں سے ملاقات، ان کی زیارت اور ان سے میل جول کا شائق ہو تو سمجھ لو کہ تم فضول پن، دین سے اعراض اور نفس کے دھوکے میں مبتلا ہو گئے ہو۔ ایک عربی شاعر نے بہت خوب کہا ہے:

ان الفارغ الی سلامك قادنی ! ولربما عمل الفضول فارغ !

"نیکیوں سے فراغت کی بنا پر میں تم سے سلام علیکم کرنے آگیا ہوں۔ واقعی بے کار آدمی بہت سے فضول کام کر بیٹھتا ہے"۔

جب تم صحیح معنوں میں عبادتِ خداوندی میں مشغول ہو جاؤ گے اور مناجاتِ الٰہی کا مزہ پا لو گے تو تمہیں خود بخود کتاب اللہ سے انسیت پیدا ہو جائے گی۔ تمہارا دل عامۃ الناس سے علیحدہ رہنے میں

راحت محسوس کرے گا اور تمہیں لوگوں کی آواز اور ان سے گفتگو کرنے سے نفرت آئے گی۔

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے جب واپس آتے تھے تو آپ کو لوگوں سے وحشت آتی تھی۔ آپ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے تاکہ کسی کی آواز سنائی نہ دے۔ اور آپ لوگوں کی آواز کو نفرت و وحشت کے اعتبار سے گدھے کی مانند خیال کرتے تھے۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ ہمارے شیخ رحمہ اللہ کے مندرجہ ذیل ارشاد پر عمل کرو۔ آپ نے فرمایا:

(۱) ـــــ ارض باللہ صاحباً! وذر الناس جانباً

تم لوگوں سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ۔ اور صرف خدا ہی کو دوست بنانے میں خوشی تصور کرو

(۲) ـــــ صادق الود شاھداً کنت فیھم وغائباً

تم لوگوں کے چاہے مخلص دوست بنو اور ان میں رہو یا ان سے غائب۔

(۳) ـــــ قلب الناس کیف شئت تجد ھم عقارباً

جب تمہیں ان سے واسطہ پڑے گا تو اپنے حق میں ان کے دل بچھوؤں کی مانند پاؤ گے۔

(۲) گوشہ نشینی کی رغبت پیدا کرنے والی دوسری چیز یہ ہے کہ تم لوگوں سے ہر قسم کا طمع اور ابد منقطع کر لو۔ اس طرح تم ان سے بآسانی کنارہ کش ہو سکو گے۔ کیونکہ جب تمہیں کسی شخص سے کسی قسم کا طمع نہ ہو تو تمہارے لیے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گا۔

(۳) اور تیسری چیز یہ ہے کہ تم لوگوں میں رہنے کی آفات پر غور کرو۔ ان کو ہر وقت یاد رکھو اور دل میں دوہراتے رہو۔ جب تم ان تین امور پر پابندی کرو گے تو ضرور مخلوق سے الگ ہو کر تمہارا رجوع خداوند تعالیٰ کی طرف ہو جائے گا اور اس طرح تمہیں عزلت گزینی کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔ اور یہ کٹھن منزل تمہیں دل پسند لگے گی۔ اور اس کے ذریعہ تمہیں دربار خداوندی میں جھکنے کی توفیق نصیب ہو جائے گی۔ (و باللہ التوفیق والعصمۃ)

عبادت میں تیسری بڑی رکاوٹ شیطان:

اے برادر عزیز! عبادت میں ترقی اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے شیطان سے جنگ اور اس پر سختی کرنا بھی لازم اور ضروری ہے۔ اور یہ دو وجہ سے ضروری ہے:

ہٹا دے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سے مقابلہ کیا جائے۔ اس کو ہٹانے اور اس کی مخالفت کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہا جائے۔ میں (امام غزالیؒ) کہتا ہوں کہ میرے نزدیک زیادہ مناسب اور بہتر یہ ہے کہ دونوں طریقوں پر عمل کیا جائے۔ اوّل تو اس کی شرارتوں سے رب تعالیٰ سے پناہ مانگی جائے۔ جیسا کہ ہم کو حکم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی شرارتوں سے ہمیں محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

پھر اگر تم یہ محسوس کرو کہ شیطان حق تعالیٰ سے پناہ مانگنے کے باوجود تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتا اور غالب آنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے مجاہدے، ہماری قوت اور ہمارے صبر کا امتحان مطلوب ہے۔ یعنی حق تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم شیطان سے مقابلہ اور محاربہ کرتے ہو یا اس سے مغلوب ہو جاتے ہو۔ جیسا کہ اس نے ہم پر کفار وغیرہ کو مسلط کر رکھا ہے۔ حالانکہ وہ اس پر قادر ہے کہ ہمارے جہاد وغیرہ کے بغیر ہی ان کی شرارتوں اور فتنوں کو کچل دے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ بندوں کو ان سے جہاد کا حکم کرتا ہے تاکہ آزمائے کہ کس کے دل میں جذبہ جہاد اور شہادت کی تڑپ ہے، اور کون پورے خلوص، تندہی اور صبر سے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۔	اور تاکہ اللہ تعالیٰ مخلص ایمان داروں کو ظاہر کرے اور تاکہ تم میں بعض کو شہادت کا رتبہ عطا فرمائے۔

ایک مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ٥	کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ابھی تک مجاہدین اور صبر کرنے والوں کو جہاد کے ذریعہ ممتاز اور الگ نہیں کیا۔

تو اسی طرح شیطان کے مقابلے میں بھی ہمیں سختی اور پوری کوشش کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر ہمارے علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ شیطان کو مغلوب کرنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

پہلی چیز یہ ہے کہ تم اس کے حیلوں اور چالاکیوں کو معلوم کرو اور پہچانو۔ جب تمہیں اس کی حیلہ سازیوں کا علم ہو جائے گا تو پھر وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ جیسے چور کو جب معلوم ہو جائے کہ صاحب مکان کو میرا علم ہو گیا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے، کہ تم شیطان کی گمراہ کن دعوت کو ہرگز منظور نہ کرو۔ اور تمہارا دل قطعاً اس سے متاثر نہ ہو۔ اور تم اس کے مقابلے کی طرف توجہ نہ دو۔ کیونکہ ابلیس ایک بھونکنے والے کتے کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو چھیڑو گے تو زیادہ شور مچائے گا۔ اور اگر اعراض کرو گے تو وہ بھی خاموش ہو جائیگا۔

ابلیس سے حفاظت کی تیسری تدبیر یہ ہے کہ ذکر الٰہی کی کثرت کی جائے۔ سرکار دو عالم نورِ مجسم شفیع معظم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ان ذکر اللہ تعالیٰ فی جنب الشیطان — شیطان کے لیے خدا تعالیٰ کا ذکر اتنا تکلیف دہ

کالاٰ کلۃ فی جنب ابن اٰدم۔ — ہے جس طرح انسان کے لیے خارش

سوال: شیطان کے مکر و فریب کس طرح معلوم ہو سکتے ہیں؟

جواب: شیطان کے مکر و فریب کئی طرح کے ہیں۔ اول تو اس کے وسوسے ہیں جو اس کے تیر ہیں۔ جن کے ذریعہ وہ لوگوں کے قلوب مجروح کرتا ہے۔ اور ان وساوس کا صحیح انکشاف خواطر اور خواطر کی اقسام معلوم کرنے سے ہو سکتا ہے۔

دوسری چیز اس کے حیلے ہیں، جو بمنزلہ جال کے ہیں۔ جن سے لوگوں کے دلوں کو پھانستا ہے۔ اور ان کی معرفت، شیطان کے دھوکے، ان کے اوصاف اور ان کے راستے معلوم کرنے سے ہوتی ہے۔ علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان خواطر و وساوس کی تفصیل میں کئی باب لکھے ہیں۔ اور ہم (امام غزالیؒ) نے اس سلسلے میں ایک مستقل کتاب "تلبیسِ ابلیس" نام تصنیف کی ہے۔ اور ہماری یہ زیر تصنیف کتاب اختصار و ایجاز کے باعث ان خواطر و وساوس وغیرہ کی تفصیلات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم ہر ایک چیز کو اس کتاب میں ایسے اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ اگر ان پر عمل کر لیا جائے تو کافی ہو جائیں۔

اے عزیز! دل میں جو خطرات آتے ہیں، ان کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہوا ہے، جو اسے نیکیوں کا الہام کرتا ہے۔ اس فرشتے کو ملہم کہتے ہیں۔

اوراس کی دعوت کو الہام۔ اس کے مقابلے میں خدا کی طرف سے دل پر ایک شیطان مسلط کردیا گیا ہے جو بُرائی کی طرف بُلاتا ہے۔ اس شیطان کو وسواس اور اس کی دعوت کو وسوسہ کہتے ہیں۔ ملہم انسان کو نیکیوں کی طرف بلاتا ہے اور وسواس صرف برائیوں کی طرف۔ یہ اکثر علماء کی رائے ہے۔ لیکن میرے شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ شیطان بسا اوقات بظاہر نیکی کی دعوت دیتا ہے۔ مگر دراصل یہاں بھی اس کا مقصد بُرائی کی طرف لگانا ہوتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ بڑی نیکی کی بجائے چھوٹی کی طرف بُلاتا ہے۔ جس سے ایک بڑے گناہ کرنے کا نقصان نیکی کے ثواب سے زیادہ ہو۔ جیسے عُجب وغیرہ۔ تو خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے دل پر دو داعی مقرر ہیں۔ ہر ایک اپنی نوعیت کی دعوت میں لگا ہوا ہے اور انسان اپنے دل سے دونوں کی دعوت کو سنتا اور محسوس کرتا ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا ولد لابن اٰدم مولود قرن اللہ سُبحانہ بہ ملکا و قرن الشیطان بہ شیطانا۔ والشیطان جاثم علی اذن قلب ابن اٰدم الایسر و الملك جاثم علی اذنہ الایمن۔ فھما یدعوانہ۔	جب کسی انسان کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ لگا دیتا ہے۔ اور شیطان اس کے ساتھ ایک شیطان لگا دیتا ہے شیطان اس کے دل کے بائیں کان میں پھونکتا رہتا ہے اور فرشتہ دائیں میں۔ اس طرح دونوں اپنی اپنی دعوت میں لگے رہتے ہیں۔

اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے:

للشیطان لمۃ بابن اٰدم و للملك لمۃ۔	شیطان بھی اپنی دعوت کے لیے انسان کے پاس آتا ہے اور فرشتہ بھی۔

پھر ایک شے اور بھی حق تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی شہوت اور لذت کی طرف مائل ہو جاتا ہے، چاہے جائز ہو یا نا جائز۔ اس تیسری چیز کا نام خواہش نفس ہے جو انسان کو آفات میں مبتلا کرتی ہے۔ تو یہ تین چیزیں ہیں جو انسان کو مختلف امور کی طرف بلاتی ہیں۔

پھر اس مقدمے کے بعد جاننا چاہیے کہ خواطر وہ آثار ہیں جو بندے کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ خطرہ کے معنی ہیں "اضطراب"۔ چونکہ یہ بھی کبھی دل میں

آتا ہے اور کبھی جاتا ہے۔جس طرح ہوا کہ کبھی آتی ہے اور کبھی جاتی ہے۔ تو اس آنے جانے کے اضطراب کے باعث اس کو خطرہ کہتے ہیں۔

حقیقت میں ہر قسم کے خواطر کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسباب و ذرائع کی طرف مجازاً نسبت ہوتی ہے۔ اور خواطر کل چار قسم ہیں:

ایک وہ جو ابتداءً اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو صرف خواطر کہتے ہیں۔

دوسرے وہ جو انسانی طبیعت کے موافق قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو ہوائے نفس کہتے ہیں۔

تیسرے وہ جو ملہم فرشتہ کی دعوت کے ذریعہ حق تعالیٰ کی جانب سے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں الہام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

چوتھے وہ جو شیطانی دعوت سے قلب انسانی میں آتے ہیں۔ انھیں وسوسہ کہا جاتا ہے۔ اور شیطان کی طرف منسوب کرتے ہوئے انہیں شیطانی خطرات بھی کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خواطر چار اقسام ہیں، جن کا ذکر ہُوا۔

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو خطرہ بلاواسطہ رب تعالیٰ کی جانب سے ابتداءً دل میں آتا ہے وہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ کبھی نیک ہوتا ہے اور کبھی بُرا۔ اچھا تو اکرام و اتمام حجت کے لیے ہوتا ہے۔ اور بُرا آزمائش اور مشقت میں ڈالنے کے لیے۔ اور جو خطرہ ملہم کی جانب سے ہوتا ہے وہ خیر ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ملہم کو نصیحت اور ارشاد کے واسطے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ اور جو خطرہ شیطان کی جانب سے ہوتا ہے وہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ تاکہ بندہ اس کے ذریعہ گمراہی میں مبتلا ہو اور راہِ حق سے پھسلے۔ اور کبھی استدراج کے طور پر یعنی دھوکے میں ڈالنے کی غرض سے بظاہر نیک بھی ہوتا ہے۔ اور جو خطرہ قلب میں ہوائے نفس سے پیدا ہوتا ہے وہ فضول اور بُری چیزوں کے متعلق ہوتا ہے۔ تاکہ بندہ امر خیر سے رکا رہے۔ اور میں نے بعض سلف سے سُنا ہے کہ ہوائے نفس بھی بعض اوقات انسان کو نیک امور پر اُبھارتی ہے۔ مگر ابلیس کی طرح مقصد اس سے بھی بُرائی کی طرف لگانا ہوتا ہے —— یہ ہیں خواطر اربعہ، جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

پھر تین اور امور کو بھی جاننا اشد ضروری ہے، جو اصل مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ خطرہ شر اور خیر

میں کیا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ خطرہ شر رحمانی، شیطانی اور نفسانی میں کیا امتیاز ہے۔ تیسرے یہ کہ خطرہ خیر ابتدائی رحمانی، یا الہامی، یا شیطانی اور نفسانی میں کیا فرق ہے۔ تاکہ خطرہ خیر رحمانی اور الہامی کی اتباع کی جائے، اور نفسانی و شیطانی سے اجتناب کیا جائے۔

خطرہ خیر اور شر میں فرق کا طریقہ علمائے کرام نے یہ لکھا ہے کہ جو خطرہ قلب میں آئے اس کا میزان شرع سے موازنہ کیا جائے۔ اگر اصُولِ شریعت کے موافق ہو تو وہ خطرہ درست اور صحیح ہے ورنہ غلط۔ اگر میزان شرع سے فرق معلوم نہ ہو سکے تو سلف صالحین کی سیرت مطہرہ سے موازنہ کیا جائے اگر ان کی سیرت کے مطابق ہو تو خیر ہے ورنہ شر۔ اگر سیرتِ اسلاف سے بھی پتہ نہ چل سکے تو اس کو اپنے نفس اور خواہش سے پرکھا جائے۔ اگر نفس اس سے طبعًا نفرت کرے۔ کسی خارجی خوف و ڈر کے باعث نفرت نہ کرے تو وہ نیک ہے۔ اور اگر قلب میں آنے والا خطرہ ایسا ہو کہ نفس اپنی طبیعت اور سرشت کے اعتبار سے اس کی طرف مائل ہو۔ اللہ تعالیٰ سے کسی امید یا ترغیب کی بنا پر مائل نہ ہو تو وہ خطرہ شر ہے۔ کیونکہ نفس ہمیشہ بُرائی کی طرف ہی مائل ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس کی فطرت میں بُرائی ہے ——— جب تم ان مذکورہ بالا طریقوں کے ذریعہ خوب کوشش، احتیاط اور دھیان کے ساتھ خواطر مذکورہ میں فرق و امتیاز کا ارادہ کرو گے تو تم پر بفضلہ تعالیٰ نیک اور بد خطرہ کے درمیان فرق واضح ہو جائے گا۔

دوسرے امر میں فرق معلوم کرنے کا طریقہ ہمارے علمائے کرام نے یہ بتایا ہے کہ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ یہ خیال اور خطرہ شیطانی یا رحمانی یا نفسانی ہے۔ تو اس خیال کو تین طرح سے جانچو۔ اگر وہ خیال اور خطرہ پختہ اور مضبوط اور راسخ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا نفس کی جانب سے ہے۔ اور اگر راسخ نہ ہو بلکہ اس میں اضطراب اور تردد ہو تو ایسا خیال شیطانی ہے۔

بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ ہوائے نفس چیتے کی مانند ہے۔ جب تک اسے سخت شکست نہ دی جائے اور اس کے ساتھ شدت کا معاملہ نہ کیا جائے، مغلوب و مرعوب نہیں ہوگی۔ یا خارجی العقیدہ شخص کی طرح ہے۔ کہ جب تک خارجی کو مار اور قتل نہ کر دیا جائے اپنی شرارت سے باز نہیں آتا۔ اور شیطان بھیڑیے کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو ایک جانب سے روکو تو دوسری طرف سے آگھستا ہے خیال شر میں امتیاز کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ گناہ کرنے کے بعد دل میں آئے تو وہ رحمانی

ہوگا تاکہ اس گناہ کی ذلت وحقارت دل میں آئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ | اور کچھ نہیں بلکہ گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے۔

میرے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ گناہ رفتہ رفتہ قساوت قلبی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اوّل اوّل تو دل میں بُرے خطرات آتے ہیں اور پھر رین اور زنگ لگ جاتا ہے۔

اور بُرا خیال گناہ کے بعد متصل دل میں نہ آئے تو ایسا خیال شیطانی ہوتا ہے۔ گمراہ کرنے کے لیے ابلیس اکثر بُرے خیالات دل میں ڈالتا ہے۔ اور اگر ایسا خیال ہو کہ ذکرِ حق سے کمزور یا کم نہ ہو تو سمجھ لو کہ ایسا خیال نفسانی ہے۔ اور اگر ذکر سے کمزور یا کم ہو تو ایسا خیال شیطانی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے ان الفاظ کی تفسیر میں کہا گیا ہے:

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

کہ ابلیس انسان کے دل کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بندہ جب ذکرِ خدا کرتا ہے تو وہ علیحدہ ہو جاتا ہے اور جب غفلت کرتا ہے تو اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

حق تعالیٰ یا فرشتے کی جانب سے بندہ کے قلب میں جو خیال آتا ہے ان دونوں میں فرق وامتیاز کی پہچان یہ ہے کہ اگر وہ خیال پختہ اور قوی ہو تو ایسا خیال رحمانی ہے۔ اور اگر اس میں تردد واضطراب ہو تو ملکی ہے۔ کیونکہ فرشتے کو ناصح بنا کر انسان کے دل پر مقرر کیا گیا ہے۔ وہ ہر طرح بندے کو نیکیوں کی طرف مائل کرتا ہے اور نیک اُمور سامنے لاتا ہے تاکہ انہیں قبول کرے اور ان پر عمل کرے۔

فرق وامتیاز کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر خیال طاعت ومجاہدہ کے بعد دل میں آئے تو رحمانی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ | جو لوگ ہم تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لیے ضرور اپنے وصال کی راہیں کشادہ کر دیتے ہیں۔

اور ایک مقام پر فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ۝ | جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت

اور اگر نیک خیال طاعت و مجاہدہ کے بعد قلب میں پیدا نہ ہو بلکہ ابتداء پیدا ہو تو وہ ملکی ہوتا ہے۔ اور اگر نیک خیال باطنی اصول و اعمال کے متعلق ہو تو وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ اور اگر ظاہری فروع و اعمال کے متعلق ہو تو فرشتہ کی طرف سے ہے۔ کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک فرشتے کو باطنی امور کی معرفت نہیں۔

اور جو نیک خیال ابلیس کی جانب سے ہوتا ہے اور جس سے درحقیقت اس کا مقصود گناہ میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ تو ہمارے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اگر اس سے دل میں خوشی پیدا ہو، خوف پیدا نہ ہو، عجلت پیدا ہو، تحمل و اطمینان پیدا نہ ہو۔ دل میں بے خوفی آئے، ڈر نہ آئے۔ اور آخرت کے متعلق غفلت پیدا ہو، بصیرت پیدا نہ ہو، تو ایسا خیال شیطانی ہے، اس لیے اس سے اجتناب کرو۔ اور اگر اس کے خلاف ہو۔ یعنی اس سے قلب میں خوشی کے بجائے خوف پیدا ہو، عجلت کے بجائے تحمل پیدا ہو۔ بے خوفی کے بجائے ڈر پیدا ہو۔ اور آخرت سے غفلت کے بجائے اس کی یاد پیدا ہو، تو یہ خیال رحمانی ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں خوشی سے مراد ایک قسم کا سکون ہے جس میں بصیرت نہیں ہوتی۔ اور بعض دفعہ ذکر سے بھی نشاط و فرحت پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی خوشی و فرحت بُری نہیں، مگر اس کے مواقع محدود ہیں۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

العجلۃ من الشیطان الا فی	پانچ کاموں کے علاوہ باقی تمام کاموں میں
خمس مواضع ـ تزویج البکر	عجلت شیطانی فعل ہے۔ وہ پانچ کام یہ ہیں۔
اذا ادرکت ـ وقضاء الدین اذا	جب لڑکی بالغ ہو جائے تو جلدی بیاہ دی جائے
وجب ـ وتجھیز المیت اذا مات	جب فرض واجب ہو تو جلدی ادا کیا جائے۔
وقری الضیف اذا نزل وتوبۃ	جب کوئی مرے جلدی دفن کیا جائے جب مہمان
الذنب اذا اذنب	آئے تو اس کی مہمان نوازی میں جلدی کی جائے۔
	اور گناہ سرزد ہونے پر جلدی توبہ کی جائے۔

اور خوف سے مراد یہ ہے کہ بندے کے دل میں یہ ڈر ہو کہ شاید میں ارادے کو عملی طور پر کما حقہ ادا کر سکوں یا نہ۔ اور شاید دربار ایزدی میں یہ قبول ہو یا نہ ہو۔ اور بصیرت کا مطلب یہ ہے کہ اس ارادے میں غور و تامل کر لے کہ اچھا اور خیر ہے یا کہ بُرا ہے۔ اور آخرت میں اس پر ثواب ملنے کی امید ہے یا نہیں۔

یہ تین امور ضروری تھے جن کی معرفت سے قلبی خواطر و خیالات میں فرق و امتیاز معلوم ہو سکتا ہے۔ اس لیے انہیں ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ اور جہاں تک ہو سکے ان کی تہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان تین امور کی معرفت و واقفیت علوم لطیفہ اور اسرار شریفہ میں سے ہے۔

باقی رہے ابلیس کے دھوکے، جن کے ذریعہ بندے کو طاعات سے روکنے کی کوشش کرتا ہے، وہ سات قسم ہیں۔

اوّل طاعات سے روکنے کی کوشش کرتا ہے —— تو اگر اللہ تعالیٰ بندے کو بچالے اور بندہ اس کے مطالبے کو اس طرح رد کر دے کہ "مجھے طاعات و عبادات کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ یہ سفر آخرت کا توشہ ہیں، اور بغیر توشہ سفر طے نہیں ہو سکتا"۔ تو:

پھر ابلیس اس طرح گمراہ کرتا ہے کہ "چلو آج رہنے دو، یہ کام کل کر لینا" —— اگر بندہ اس سے بھی بچ جائے اور ابلیس کی بات کو اس طرح ٹھکرا دے کہ "میری موت میرے قبضہ میں نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر آج کا کام کل پر چھوڑا، تو کل کا کام بھی تو ہے، وہ کس دن کروں گا؟ کیوں کہ کل کا کام علیحدہ ہے"۔

جب ابلیس یہاں بھی ناامید ہوتا ہے، تو کہتا ہے کہ "جلدی جلدی کرو تاکہ فلاں فلاں کام کے لیے فارغ ہو سکو" —— اگر بندہ اس کے اس حربے سے بھی بچ جائے، اور اس طرح رد کر دے کہ "قلیل نیکی اطمینان و سکون کے ساتھ اس نیکی سے بہتر ہے جو مقدار میں زیادہ مگر ناقص ہو"۔

اگر یہاں بھی وہ ناکام ہو تو بندہ کو ریا میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے —— اگر اس وقت بھی بندہ اللہ تعالیٰ کی امداد و حفاظت سے بچ جائے اور یہ کہہ کر وسوسۂ ریا کو مسترد کر دے کہ "میں کسی اور کی نمائش کے لیے عبادت کیوں کروں۔ کیا صرف خدا تعالیٰ کا دیکھنا میرے واسطے کافی نہیں ہے"؟ تو

پھر وہ عُجب میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور بندہ از روئے وسوسہ کہتا ہے کہ "تو کتنا باعظمت اور شب بیدار ہے، اور تو کتنی فضیلت کا مالک ہے" —— اگر حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے بندہ اب بھی محفوظ رہے اور عُجب میں مبتلا نہ ہو۔ بلکہ ابلیس کے اس وسوسہ کو اس طرح رد کر دے کہ "اس میں میری کیا بزرگی ہے۔ یہ تو یہ سب اللہ تعالیٰ کا احسان ہے جس نے مجھ گناہ گار کو یہ توفیق دی۔ اور یہ بھی اس کا کرم ہے کہ میرے حقیر و ناقص اعمال کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔ اگر اس کا فضل و کرم نہ ہوتا تو میرے بےحد گناہوں

کے مقابلے میں میرے ان قلیل اعمال کی کیا وقعت تھی"۔

اگر ابلیس کے یہ مذکورہ حربے ناکام ہو جائیں، تو پھر ایک چھٹے راستے سے آتا ہے اور یہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ بہت ہی دانا اور ہوشیار شخص کے سوا کوئی اس کے دھوکے سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اس سے واقف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابلیس یہ کہتا ہے کہ "اے نیک بندے! تو لوگوں سے پوشیدہ پوشیدہ نیک اعمال میں کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بخود تیرے اعمال خیر کو لوگوں میں مشتہر کر دے گا"۔ یہ کہنے سے اس کا مقصود ریا میں مبتلا کرنا ہوتا ہے ——— اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بندہ ابلیس کے اس مغالطے سے بھی بچ جائے اور اس کے اس وسوسے کو اس طرح ناکام بنا دے کہ "میں اس چیز کا متمنی نہیں ہوں کہ میری نیکیاں عوام میں مشہور ہوں۔ بلکہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے وہی درست اور حق ہے۔ چاہے ظاہر کرے چاہے ظاہر نہ کرے۔ وہ مجھے کوئی مرتبہ عطا کرے یا نہ کرے۔ سب اس کی مرضی ہے۔ لوگوں کے سامنے اظہار یا عدم اظہار میرے نزدیک مساوی ہے، کیونکہ لوگوں کے ہاتھ میں میرا نفع نقصان نہیں ہے"۔

اس طرح گمراہ کرنے سے مایوس ہونے کے بعد ابلیس یوں گمراہ کرتا ہے کہ "انسان کے نیک و بد ہونے کے متعلق روزِ ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ جو اُس روز بُروں میں ہو گیا وہ بُرا ہی رہے گا۔ اور جو اچھوں میں ہو گیا وہ اچھا ہی رہے گا۔ تمہارے اعمال نیک و بد سے فیصلۂ ازلی میں ہرگز فرق نہیں آ سکتا" ——— ——— اگر اللہ تعالیٰ بندہ کو اس وسوسۂ شیطانی سے بھی بچا لے اور بندہ ابلیس لعین کو یوں جواب دے کہ "میں تو خدا تعالیٰ کا بندہ ہوں، اور بندے کا کام ہے اپنے مولیٰ کے حکم کی تعمیل۔ اور اللہ تعالیٰ چونکہ رب العالمین ہے اس لیے جو چاہے حکم دے اور جو چاہے کرے۔ اور پھر عبادت و طاعت کسی طرح بھی مضر نہیں۔ کیونکہ اگر میں علمِ الٰہی میں سعید ہوں تو پھر بھی اور زیادہ ثواب کا محتاج ہوں۔ اور اگر معاذ اللہ علمِ الٰہی میں میرا نام بدبختوں میں لکھا ہو تو بھی نیک اعمال کرنے سے اپنے اوپر یہ ملامت تو نہیں کروں گا، کہ مجھے اللہ تعالیٰ طاعت و عبادت نہ کرنے پر سزا دے گا۔ اور کم از کم یہ تو ہے کہ نافرمان بن کر جہنم میں جانے کی نسبت مطیع بن کر جانا بہتر ہے۔ لیکن یہ تو سب محض احتمالات ہیں، ورنہ اس کا وعدہ حق ہے اور اس کا کلام قطعاً سچا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تو جا بجا طاعات و عبادات کی بجا آوری پر ثوابِ جمیل کے وعدے فرمائے ہیں۔ تو جو شخص ایمان و طاعت کے ساتھ رب تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو گا وہ ہرگز دوزخ میں

نہ جائے گا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی مہربانی اور اعمال صالحہ کی وجہ سے جنت فردوس میں ان شاء اللہ جگہ پائیگا لیکن حقیقت میں یہ دخول بھی وعدہ خداوندی کی وجہ سے ہوگا۔ اسی صدق وعدہ کا اظہار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سعید لوگوں کے اس مقولہ کو نقل فرمایا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ سب تعریفیں حق تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

لہٰذا خدا تم پر رحم کرے! تمہیں ابلیس کے حیلوں سے بچنے میں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ کیونکہ معاملے کی نزاکت تمہارے سامنے ہے۔ اور اسی پر اپنے باقی احوال وافعال کو بھی قیاس کر لو اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہو۔ اور اس کی پناہ میں رہو۔ کیونکہ ہر معاملہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور توفیق عطا کرنے والا بھی وہی ہے ——— وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

چوتھا عائق (مانع) "نفس"

پھر اے عبادت کے طالب! (اللہ تعالیٰ تجھے اور ہمیں ہر لغزش سے محفوظ رکھے) اس نفس امارہ کی شرارتوں سے بچنا بھی بہت ہی ضروری ہے کیونکہ یہ نہایت نقصان دہ دشمن ہے اور اس کی آفات نہایت سخت ہیں۔ اس کا علاج بہت مشکل امر ہے۔ اس کی بیماری نہایت خطرناک بیماری ہے اور اس کی دوا سب دواؤں سے دشوار ہے۔

نفس کا اس قدر مضر اور خطرناک ہونا دو وجہ سے ہے:

اوّل یہ کہ نفس گھر کا چور ہے۔ اور چور جب گھر میں ہی چھپا ہو تو اس سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہوتا ہے اور بہت زیادہ نقصان پہنچاتا ہے نفس کی شرارتوں کے متعلق کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

نفسی الی ما ضرنی داعی ۔۔۔ تکثر اسقامی واوجاعی

کیف احیالی من عدوی اذا ۔۔۔ کان عدوی بین اضلاعی

ترجمہ (۱) نفس مجھے مضرت رساں کاموں کی طرف بلاتا ہے اور میری بیماریوں اور امراض کو زیادہ

کرتا رہتا ہے۔

(۲) اس دشمن سے بچنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے جو دونوں پہلوؤں کے درمیان چھپا بیٹھا ہے۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ نفس ایک محبوب دشمن ہے۔ اور انسان کو جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کے عیوب نظر نہیں آتے۔ بلکہ محبت کی وجہ سے محبوب کے عیوب سے اندھا رہتا ہے۔ ایک شاعر نے اس چیز کو مندرجہ ذیل دو شعروں میں بیان کیا ہے:

لست ترى عيبا لذى الود والاخا　　ولا بعض ما فيه اذا كنت راضياً

وعين الرضاء عن كل عيب كليلة　　لكن عين السخط تبدى المساديا

ترجمہ (۱) جب تیری کسی سے دوستی اور اس سے بھائی چارہ ہوتا ہے اور تو اس سے راضی ہوتا ہے تو تجھے اس کا کوئی عیب نظر نہیں آتا۔

(۲) رضاء اور پیار والی آنکھ ہر عیب سے اندھی ہوتی ہے۔ لیکن دشمن آنکھ کو بُرائیاں ہی بُرائیاں دکھائی دیتی ہیں۔

تو جب انسان اپنی ہر قباحت کو نظر استحسان سے دیکھے اور نفس کے عیوب سے آگاہ نہ ہو جو ہر وقت انسان کے ساتھ عداوت اور نقصان رسانی میں مصروف ہے۔ تو ایسا شخص اگر خدا تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل نہ ہُوا تو عنقریب ہلاکت اور ذلّت کے گہرے گڑھے میں جا گرے گا۔

اے عزیز، تو اس ایک نکتے پر ہی غور کر، یہی تیرے لیے کافی ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ جب تو ماضی پر نظر کرے گا، تو تجھے معلوم ہوگا کہ اوّل روز سے جو ذلت و خواری جو تباہی جو گناہ اور جو آفت و مصیبت دنیا میں واقع ہوئی اور قیامت تک ہوگی سب نفس کے باعث ہی ہوئی اور ہوگی۔ بعض بُرائیاں اکیلے نفس کے باعث اور بعض نفس کی معاونت و شرکت کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے اول نافرمانی ابلیس نے کی۔ اور اس کا باعث تکبر و حسد تھا۔ جب ابلیس نے حکم الٰہی کے آگے تکبر کیا اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حسد کیا تو اس کی اسی ہزار برس کی عبادت ضائع ہوگئی اور وہ ہمیشہ کے لیے ضلالت و گمراہی کے گہرے سمندر میں غرقاب ہو گیا۔ اس وقت نہ دنیا تھی نہ مخلوق، اور نہ ہی کوئی اور ابلیس تھا جو اس ابلیس کو گمراہ کرتا۔ لہٰذا ابلیس کے اندر تکبر و حسد اس کے نفس کی وجہ سے صادر ہُوا۔

ابلیس کی مردودیت کے بعد حضرت آدم و حوّا علیہما السلام سے جو لغزش ظہور پذیر ہوئی اس میں بھی

چاہتِ نفس کارگر تھی۔ ابلیس نے قسم کھا کر کہا کہ دانہ کھا لینے کے بعد تمہیں ہمیشہ کے لیے جنت میں رہنا نصیب ہو جائے گا۔ تو دونوں بقاء حیات کو عزیز گردانتے ہوئے پھسل گئے۔ تو یہ لغزش بھی (جو بعد میں بالکل معاف ہو گئی) نفس کی معاونت و شرکت سے واقع ہوئی۔ اور دونوں حضرات اس بنا پہ اللہ تعالیٰ کے پڑوس و قرب سے دور کر دیے گئے اور جنتِ فردوس سے اس فانی، حقیر، کھوٹی، ہلاکت میں ڈالنے والی دنیا کی طرف منتقل کر دیے گئے۔ اور اس لغزش کے باعث انہیں بہت کچھ دقتیں پیش آئیں۔ اور ان کی اولاد بھی قیامت تک دنیا کے پھندوں میں مبتلا ہو گئی۔

پھر ہابیل کا قتل بھی بخل و حسد کی وجہ سے ہی ہوا۔ اور ہاروت و ماروت بھی شہوت کے سبب فتنے میں مبتلا ہوئے۔ اور اسی طرح قیامت تک نفس کی وجہ سے ناقابل گفتہ بہ واقعات رُونما ہوتے رہیں گے۔ مخلوق میں جو فتنے، جو خرابیاں، جو گمراہیاں اور جو گناہ واقع ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے ان کی بنیاد نفس اور نفس کی خواہش ہی ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مخلوق خیریت اور سلامتی سے رہتی۔ جب نفس کی عداوت اس حد تک خطرناک ہے تو عاقل کو چاہیے کہ نفس کی شرارتوں سے بچاؤ کا اہتمام کرے۔

(واللہ الہادی)

سوال: تو ایسے دشمن سے حفاظت میں رہنے کا حیلہ اور تدبیر کیا ہے؟ اس کی وضاحت فرمایئے تاکہ اس کے مطابق عمل کیا جا سکے۔

جواب: ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ نفس کا معاملہ سب سے زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ اسے بالکل ختم کرنا بھی حکمتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ عبادت کے سلسلے میں بندوں کی سواری اور ذریعہ ہے۔

کہتے ہیں کسی اعرابی نے اپنے دوست کے لیے دعائے خیر کی اور کہا کہ "اللہ تعالیٰ تیرے ہر دشمن کو ذلیل کرے، سوائے نفس کے"۔ کیونکہ نہ تو اسے بالکل ختم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں بھی نقصان ہے۔ تو درمیانی راستہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ کسب حسنات کے لیے اس کو قوت اور اس کی تربیت کرو۔ اور برائیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس کو ضعیف و لاغر بھی رکھو اور بندش میں بھی۔

اس بیان سے واضح ہوا کہ نفس کا علاج بہت مشکل امر ہے اور بڑی دقتِ نظر کی ضرورت ہے۔ ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کو تقویٰ اور ورع کی لگام دیے رکھو۔ تاکہ کسب حسنات اور گناہوں سے حفاظت دونوں فائدے حاصل ہوں۔

سوال :

نفس امّارہ تو بہت ہی سرکش، ضدی اور بدفطرت شے ہے، اس کا لگام سے قابو میں آنا مشکل ہے۔ اس لیے اور کونسا حیلہ ہو سکتا ہے جس سے ہم اس کو زیر کر سکیں؟

جواب :

تمہارا یہ اشکال درست ہے۔ واقعی یہ انتہائی سرکش ہے۔ مگر اس کا حیلہ یہ ہے کہ اسے بہت ذلیل و خوار کر کے رکھا جائے تاکہ لگام میں آ سکے۔

علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ نفس کو خوار اور اس کے زور کو تین چیزوں سے توڑا جا سکتا ہے:

اوّل یہ کہ اسے شہوات سے روکا جائے۔ کیونکہ اڑیل حیوان کو جب چارہ کم ملتا ہے تو نرم ہو جاتا ہے

دُوسری چیز یہ کہ عبادات کا بھاری بوجھ اس پر لاد دیا جائے۔ کیونکہ گدھے کو جب چارہ کم دیا جائے اور بوجھ زیادہ لادا جائے تو لازمی طور پر اپنی شیخی چھوڑ دیتا ہے اور مطیع و منقاد ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ہر وقت رب تعالیٰ سے امداد طلب کرتا رہے کہ وہ نفس کے شر و فساد سے بچائے رکھے۔ تم نے قرآن حکیم میں سیّدنا حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد نہیں پڑھا:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ۔	نفس تو ہمیشہ بُرائیوں کا حکم ہی دیتا ہے۔ ہاں جس پر اللہ تعالیٰ کا رحم ہو وہی محفوظ رہتا ہے۔

جب تم ان تین باتوں پر کاربند ہو جاؤ گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ نفس سرکش مطیع و منقاد ہو جائیگا اُس وقت تمہیں اس کو زیر کرنے اور لگام دینے میں جلدی کرنی چاہیے تاکہ آئندہ کے لیے اس کی شرارتوں سے محفوظ رہ سکو۔

سوال :

ذرا تقویٰ کی وضاحت بھی فرما دیں، تاکہ ہم تقویٰ کی حقیقت سے واقف ہو جائیں؟

جواب :

اے عزیز! اوّل تجھے یہ جاننا چاہیے کہ تقویٰ ایک نادر خزانہ ہے۔ اگر تم اس خزانے کو پا لینے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں اس میں بیش قیمت موتی و جواہرات ملیں گے۔ اور علم و دولت روحانی کا بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگے گا۔ رزقِ کریم تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔ تم بہت بڑی کامیابی حاصل کر لو گے۔

بہت بڑی غنیمت پا لو گے، اور ملکِ عظیم (جنت) کے مالک بن جاؤ گے۔ یوں سمجھو کہ دنیا و آخرت کی بھلائیاں تقویٰ میں جمع کر دی گئی ہیں۔ تم ذرا قرآن حکیم میں تو غور کرو کہ کہیں ارشاد فرمایا "اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو ہر قسم کی خیر و برکت کے مالک بن جاؤ گے"۔ کہیں تقویٰ اختیار کرنے پر اجر و ثواب کے وعدے فرمائے گئے ہیں۔ اور کہیں فرمایا گیا کہ سعادت کا ذریعہ تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنا ہے۔

میں یہاں قرآن حکیم سے تقویٰ کے بارہ فوائد بیان کرتا ہوں:

(۱) متقی شخص کی رب تعالیٰ حمد و ثنا کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِنْ تَتَّقُوْا وَتَصْبِرُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔	اگر تقویٰ اور صبر اختیار کرو گے تو بے شک یہ باہمت کاموں میں سے ہے۔

(۲) متقی شخص دشمنوں سے مامون و محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا۔	اگر تم تقویٰ و صبر اختیار کرو گے تو تمہیں مخالفوں کے مکر و فریب کچھ نقصان نہ دے سکیں گے۔

(۳) متقی شخص کی اللہ تعالیٰ تائید و امداد فرماتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۔	بیشک اللہ تعالیٰ متقی اور نیکوکار لوگوں کے ساتھ ہے۔

ایک جگہ فرمایا:

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔	اور اللہ متقیوں کا حامی اور کارساز ہے۔

(۴) اہلِ تقویٰ آخرت کی ہولناکیوں اور وہاں کے شدائد سے نجات میں رہیں گے۔ اور دنیا میں انہیں رزقِ حلال نصیب ہوگا چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔	جو شخص تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنا شعار بنائے گا اللہ تعالیٰ اسے ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کا راستہ

مہیا کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے روزی عطا کرے گا جہاں سے اُسے وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

(۵) اس کے اعمال کی اصلاح ہو جائے گی۔ قرآن پاک میں وارد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ	اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو،

وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

اور ہمیشہ درست اور سچی بات کہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمائے گا۔

(۶) تقویٰ کی برکت سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

اور تقویٰ اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

(۷) متقی شخص اللہ تعالیٰ کا دوست بن جاتا ہے۔ جیسا کہ کلام اللہ شریف میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔

بیشک اللہ تعالیٰ متقی لوگوں سے محبت رکھتا ہے

(۸) تقویٰ سے اعمال درجۂ قبولیت کو پہنچتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اہل تقویٰ کے اعمال ہی قبول ہوتے ہیں۔

(۹) تقویٰ کے باعث انسان خدا تعالیٰ کے ہاں اعزاز و اکرام کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔

تم میں سے خدا کے ہاں وہی زیادہ اکرام کا مستحق ہے جو زیادہ متقی و پرہیزگار ہے۔

(۱۰) متقی لوگوں کو بوقت موت دیدارِ الٰہی اور آخرت میں نجات کی بشارت دی جاتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ

جو لوگ ایمان لائے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کی انہیں دنیا و آخرت میں بشارت و خوشخبری ہے

(۱۱) متقی لوگ آتش دوزخ سے محفوظ رہیں گے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا۔

پھر ہم اہل تقویٰ کو نار دوزخ سے نجات دیں گے

دوسری جگہ فرمایا:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى۔

متقی انسان نارِ دوزخ سے بچایا جائے گا۔

(۱۲) اہلِ تقویٰ کو ہمیشہ کے لیے جنت میں رہنے کی سعادت نصیب ہو گی۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ جنت ارباب تقویٰ کے لیے تیار کی گئی ہے ۔

تو خلاصہ یہ نکلا کہ دنیا و آخرت کی تمام سعادت مندیاں اور بھلائیاں اس ایک تقویٰ میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لیے اے عزیز! تو بھی راہِ تقویٰ اختیار کر اور حسبِ استطاعت اس سے حصہ حاصل کر۔

پھر مذکورہ فوائد تقویٰ میں تین امور خاصکر عبادت سے تعلق رکھتے ہیں ۔

اوّل، عبادت کی توفیق اور اس میں اعانت و تائید۔ جیسے فرمایا گیا :

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ بیشک اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے ساتھ ہے ۔

دوم، اعمال کی اصلاح و درستی اور عبادت کی خامیوں کو پورا کرنا ۔ یہ چیز بھی تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے ۔ چنانچہ فرمایا :

وَيُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۔ تقویٰ کی برکت سے رب تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرما دے گا ۔

سوم، قبولیتِ اعمال ۔ قبولیتِ اعمال کی یہ فضیلت بھی اہل تقویٰ ہی کو نصیب ہوتی ہے ۔ ارشادِ خداوندی ہے :

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں اہل تقویٰ کے اعمال ہی مقبول ہوتے ہیں ۔

اور عبادت کا دارومدار بھی ان تین امور پر ہے ۔ پہلے تو خود توفیقِ عبادت، تاکہ اس کی بندگی کی جا سکے ۔ پھر اس میں جو کمی رہ جائے اس کی اصلاح، اور پھر اس عبادت کا درگاہِ حق تعالیٰ میں مقبول ہو۔ یہ تین امور یعنی توفیقِ عبادت، اصلاحِ اعمال، اور قبولِ اعمال ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں عابد لوگ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر مانگتے ہیں اور دعا کرتے ہیں :

رَبَّنَا وَفِّقْنَا لِطَاعَتِكَ وَاَتْمِمْ تَقْصِيْرَنَا وَتَقَبَّلْ مِنَّا ۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں طاعت کی توفیق دے اور ہماری کوتاہیوں کو پورا فرما اور ہماری طاعت کو قبول فرما ۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ سے خود ہی بغیر مطالبہ ان تین امور کا وعدہ فرما لیا ہے اور اصحاب تقویٰ کے اعزاز و اکرام کا ذکر فرمایا ہے ۔ اس لیے اگر رب تعالیٰ کی عبادت و بندگی کرنا چاہتے ہو۔ بلکہ دنیا و آخرت

کی تمام سعادات سمیٹنا چاہتے ہو تو اپنے میں صفت تقویٰ پیدا کرو۔ایک شاعر نے تقویٰ کی کیا ہی عمدہ انداز میں تعریف کی ہے :

من اتقی اللہ فذاك الذی سیق الیہ المتجر الرابح

لا یتبع المرء الی قبرہ غیر التقی والعمل الصالح

(۱) جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہی نفع والی شے حاصل کرتا ہے۔

(۲) قبر میں انسان کے ساتھ صرف تقویٰ اور عمل صالح ہی جاتے ہیں۔

تقویٰ کی شان بعض دوسرے شعراء نے اس طرح بیان کی ہے :

(۱) ــــ من عرف اللہ فلم تغنہ معرفۃ اللہ فذاك الشقی

(۲) ــــ ما یصنع العبد بعز الغنی والعز کل العز للمتقی

(۳) ــــ ماضر ذا الطاعۃ ما نالہ فی طاعۃ وما ذا لقی

(۱) جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ اس معرفت کو کافی نہ جانے تو ایسا شخص بدبخت ہے۔

(۲) دولت سے انسان کو کیا عزت حاصل ہو سکتی ہے۔عزت تو سب تقویٰ سے وابستہ ہے۔

(۳) متقی شخص کو جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی طاعت میں حاصل ہوتی ہیں وہ مضر نہیں بلکہ مفید ہی مفید ہیں۔

بعض لوگوں نے کسی کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر یہ شعر لکھا :

لیس زاد سوی التقا خذی منہ او دعی

(تقویٰ ہی آخرت کا توشہ ہے۔اب تیری مرضی ہے کہ اسے حاصل کرے یا چھوڑ دے)

پھر اس اصل پر بھی غور کرو کہ تم ساری عمر عبادت کے پیچھے مشقتیں اُٹھاتے اور مجاہدے و ریاضتیں کرتے ہو یہاں تک کہ تم عبادت کے مقصد کو پا لیتے ہو۔لیکن خدانخواستہ وہ عبادت اگر دربارِ الٰہی میں مقبول نہ ہو تو ساری کوششیں اور مجاہدے ضائع ہو گئے۔تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے :

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۔ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں ہی کی عبادت قبول فرماتا ہے۔

تو ظاہر ہوا کہ تمام معاملہ تقویٰ ہی سے متعلق ہے۔اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم دنیا کی کسی شے پر یا کسی انسان پر تعجب نہیں فرماتے تھے مگر صاحبِ تقویٰ پر۔اور حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ تورات شریف میں مذکور ہے : ”اے

انسان! تو متقی بن جا، پھر جہاں چاہے سو۔

حضرت عامر بن قیس کے متعلق سُنا ہے کہ آپ بوقتِ موت رو پڑے۔ حالانکہ زندگی میں آپ کی حالت یہ تھی کہ ہر دن رات میں ایک ہزار رکعت نفل پڑھتے تھے، پھر اپنے بستر پر آتے تھے اور بستر کو مخاطب ہو کر فرماتے تھے "اے ہر برائی کی جگہ! قسم خدا کی میں نے تجھے ایک پلک بھر بھی پسند نہیں کیا"۔ جب آپ روئے تو کسی نے کہا آپ کیوں روتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا میں رب تعالیٰ کے اس قول کو یاد کر کے روتا ہوں: اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔

پھر ایک اور نکتے پر بھی غور کرو۔ جو تمام اصولوں کی اصل ہے۔ وہ یہ کہ بعض صالحین نے اپنے کسی شیخ کی خدمت میں عرض کیا "مجھے کوئی وصیت کیجیے"۔ تو شیخ نے فرمایا "میں تجھے اللہ تعالیٰ کی وہ وصیت کرتا ہوں جو اس نے تمام اولین و آخرین کو کی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	بیشک ہم نے ان کو جو تم سے پہلے کتابوں والے
مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ۔	گزرے ہیں اور تمہیں تاکید کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

میں کہتا ہوں بندے کی بہتری اور بھلائی کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسے ہو سکتا ہے۔ اور خداوند تعالیٰ بندے کے لیے سب سے زیادہ خیر خواہ، سب سے زیادہ رحم کرنے والا اور مہربان ہے۔ تو جہان میں بندے کے لیے تقویٰ کے علاوہ اگر کوئی اور شے مفید ہوتی، اس میں زیادہ بھلائی ہوتی، اس کا زیادہ ثواب ہوتا، عبادت میں اس کی زیادہ ضرورت ہوتی، شان میں تقویٰ سے اوپر ہوتی اور دنیا و آخرت میں تقویٰ سے زیادہ وقعت رکھتی تو اللہ تعالیٰ تقویٰ کے بجائے اپنے بندوں کو اس کی وصیت اور اس کا حکم دیتا۔ اور اپنے خواص کو اسی کے حکم کی تاکید فرماتا۔ کیونکہ اس کی حکمت مکمل اور اس کی رحمت وسیع ہے۔ تو جب رب تعالیٰ نے تقویٰ کی تاکید فرمائی اور تمام اولین و آخرین کو اسی کا حکم دیا تو ثابت ہو گیا کہ تقویٰ ہی سب سے اعلیٰ چیز ہے، کوئی اور چیز نہیں۔ اور نہ اس کے سوا کچھ اور مقصود ہے۔

اس تقریر سے تم پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بھلائی، ہر راہ نمائی، ہر ارشاد، ہر تنبیہ و تادیب، ہر تعلیم و تہذیب کو تقویٰ ہی سے متعلق کیا ہے۔ اور یہ اس نے اپنی حکمت و رحمت کے عین مطابق کیا ہے۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تقویٰ ہی دینی و دُنیوی اور اُخروی بھلائیوں کا جامع ہے۔

اور تقویٰ بندگی و عبادت کو درجاتِ قبولیت پر پہنچانے کا ضامن و کفیل ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

الا انما التقوی هی العز والکرم وحبك للدنیا هو الذل والعدم
ولیس علی عبد تقی نقیصة اذا صحح التقوی وان حاك او حجم

(۱) سُن لو کہ تقویٰ ہی عزّت و بزرگی ہے۔ دنیا کی محبت تو ذلّت و خواری ہے۔
(۲) جب کوئی شخص اپنے اندر وصفِ تقویٰ پیدا کرلے' تو وہ اگر جولاہے کا پیشہ یا حجام کا پیشہ اختیار کرلے تو اس میں کوئی عیب نہیں۔

یہ آخری نکتہ وہ اصل ہے کہ اس سے اعلیٰ کوئی اصل نہیں' اور نور و ہدایت والے کے لیے یہ اصل کافی ہے۔ چاہیے کہ اس پر عمل کرے اور دوسری چیزوں سے بے نیاز ہو جائے۔ واللہ تعالیٰ ولی الهدایة والتوفیق۔

سوال:

تمہاری اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ بہت اعلیٰ شے ہے۔ اس کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے' اور دنیا و آخرت میں اس کی شدید ضرورت ہے۔ اور اس کی پہچان کرنا از حد ضروری ہے۔ لہٰذا ہمیں تفصیل کے ساتھ اس کی حقیقت بتائی جائے۔

جواب:

بات یوں ہی ہے کہ تقویٰ ایک نہایت ہی عظیم شے ہے۔ اس کی تحصیل ضروری ہے اور اس کی معرفت حاصل کیے بغیر چارہ کار نہیں لیکن تمہیں معلوم ہے کہ جس قدر کوئی کام اعلیٰ و مفید ہوتا ہے، اسی قدر اس کا حصُول دشوار ہوتا ہے اور اتنی ہی زیادہ مشقت و جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اتنی ہی زیادہ بلند ہمتی چاہتا ہے۔ لہٰذا جس طرح یہ تقویٰ ایک نفیس و اعلیٰ چیز ہے' اسی طرح اس کے حصُول کے لیے عظیم مجاہدے اور شدید جدوجہد کی ضرورت ہے۔ نیز اس کے حقوق و آداب کی نگہداشت کی بھی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ درجات حسبِ مجاہدہ عطا ہوتے ہیں۔ اور جس درجے کی کوشش کی جاتی ہے اسی درجے کا ثمرہ اور پھل ملتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ جن لوگوں نے ہم تک پہنچنے کیلئے مجاہدے

سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ دریافتیں کی ہیں ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے تک وصول کے راستوں کی رہنمائی کریں گے۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

اور خدا تعالیٰ رؤف و رحیم ہے۔ ہر مشکل کو آسان کرنا اس کے دست قدرت میں ہے۔ اب تم ہماری باتوں کی طرف کان لگاؤ اور ان کو ذہن نشین کرنے کے لیے بیدار ہو جاؤ۔ اور تقویٰ کی ماہیت و حقیقت کو پورے غور سے سمجھو تاکہ اس کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد اس کو حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہو سکو۔ اور اس کی حقیقت کو جان لینے کے بعد اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے رب تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ کیونکہ اصل چیز وہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کو اپنے فضل و کرم سے ہدایت و توفیق دیتا ہے۔

اے عزیز! (اللہ تعالیٰ تیرے دین میں برکت اور تیرے یقین میں اضافہ فرمائے) تقویٰ کے بز... معنی مشائخ کرام نے بیان فرمائے ہیں پہلے وہ جان۔ چنانچہ بعض مشائخ نے تقویٰ کے یہ معنی کیے ہیں:

تنزيه القلب عن ذنب لم يسبق عنك مثله۔ اس گناہ سے دل کو بچانا جس کی مثل آگے تجھ سے صادر نہیں ہوا۔

تاکہ تمہارے اندر ترک گناہ کے عزم سے ہر قسم کے معاصی سے بچاؤ و حفاظت پیدا ہو جائے۔ میرے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی یہی تعریف کی ہے۔ کیونکہ لفظ تقویٰ لغت عرب میں اصل میں وقویٰ تھا۔ اور لفظ وقویٰ وقایۃ کی طرح مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے وَقٰى يَقِىْ وِقَايَةً وَوَقْوٰى۔ پھر واؤ کو تاء سے تبدیل کیا گیا۔ جیسے وُکلان سے تُکلان بنا دیا گیا۔ اور وقایۃ کے معنی ہیں بچاؤ و حفاظت کا ذریعہ۔ جب بندہ ترک معاصی کا پختہ عزم کر لیتا ہے، اور دل کو ترک معاصی پر مضبوط کر لیتا ہے تو ایسے عزم و ارادے والے شخص کو متقی اور اس عزم و مضبوطی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

پھر تقویٰ کا اطلاق قرآن حکیم میں تین اشیاء پر ہوا ہے۔ ایک خوف و ہیبت خداوندی جیسے:

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۔ صرف مجھ ہی سے خوف و ڈر رکھو۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم دربار خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے۔

اور تقویٰ کا لفظ طاعت و عبادت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کا ارشاد

گرامی ہے:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ۔ — اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

یہاں ڈرنے سے مراد طاعت وعبادت ہے۔ سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی معنی کیے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ترجمہ کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

اطیعوا اللہ حق اطاعتہ — اللہ تعالیٰ کی ایسی اطاعت کرو جیسی کہ چاہیے۔

اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی یوں تفسیر فرمائی ہے:

ھوان یُطاع فلا یُعصی وان یذکر فلا یُنسی وان یشکر فلا یکفر۔ — اتقوا اللہ حق تقاتہ کے معنی ہیں رب تعالیٰ کی ایسی اطاعت کرنا کہ پھر نافرمانی نہ ہو اور اس کی ایسی یاد کا نقشہ دل میں قائم کرنا کہ پھر نسیان واقع نہ ہو۔ اور اس کی اس طرح شکرگزاری کی جائے کہ ہرگز ناشکری کا صدور نہ ہو۔

اور لفظ تقویٰ قرآن حکیم میں تیسرے اس معنی میں استعمال ہوا ہے:

تنزیہ القلب من الذنوب۔ — دل کو گناہوں سے دور رکھنا۔

اور تقویٰ کے حقیقی معنی یہی تیسرے معنی ہیں۔ پہلے دونوں معنی مجازی ہیں۔ کیا تم نے قرآن مجید میں یہ آیۃ کریمہ نہیں پڑھی:

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَ اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ — اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں اور دل کو گناہوں سے دور رکھتے ہیں تو ایسے ہی لوگ کامیاب اور فائز المرام ہیں۔

اس آیۃ کریمہ میں پہلے اطاعت اور خوف کا ذکر فرمایا اور پھر تقویٰ کا۔ تو معلوم ہوا کہ تقویٰ اطاعت و خشیت کے سوا کسی تیسری شے کا نام ہے، اور وہ ہے تنزیہ القلب من الذنوب۔

پھر علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین مراتب ہیں:

(۱) شرک سے تقویٰ (بچنا)۔ (۲) بدعت سے تقویٰ (بچنا)۔ (۳) گناہوں سے تقویٰ (بچنا)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں مرتبے اس ایک آیت میں ذکر فرما دیے ہیں۔ وہ آیۃ مبارکہ یہ ہے:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اس میں جو انہوں نے کھایا
الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا اِذَا	جبکہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں اور
مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اعمال صالح بجالائیں، پھر تقویٰ اختیار کریں اور
ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ	ایمان لائیں۔ پھر تقویٰ اختیار کریں اور احسان
اَحْسَنُوْا ۔	کی راہ اختیار کریں۔

اس آیت میں پہلے تقویٰ سے شرک سے پرہیز اور ایمان سے توحید مراد ہے ۔ دوسرے سے بدعت سے پرہیز اور اس کے مقابل ایمان سے اہل سنت وجماعت کے عقائد و نظریات کا اقرار و اعتراف مراد ہے اور تیسرے تقویٰ سے صغیرہ گناہوں سے پرہیز اور اس کے مقابل احسان سے طاعت واستقامت مراد ہے ۔ تو اس وضاحت سے ظاہر ہوا کہ اس آیت میں تقویٰ کے تینوں مرتبے بیان کر دیے گئے ہیں یعنی مرتبہ ایمان، مرتبہ سنت، اور اطاعت خداوندی پر استقامت کا مرتبہ ——— یہ ہے وہ تفصیل جو ہمارے علمائے کرام نے تقویٰ کے معنی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمائی ہے ۔

میں (امام غزالیؒ) کہتا ہوں کہ میں نے تقویٰ کا ایک اور معنی بھی پایا ہے ۔ اور یہ معنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک مشہور حدیث میں مروی ہے ۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

ان سمی المتقون متقین لترکھم	متقیوں کو متقی اس لیے کہا گیا کہ انہوں نے اس کام
مالا باس بہ حذرا بہ عما بہ	کو بھی ترک کر دیا جس میں شرعاً کوئی حرج نہیں یہ احتیاط
باس ۔	کرتے ہوئے کہ اس کے ذریعہ ایسے کام نہ پڑ جائیں جس
	میں حرج اور گناہ ہو ۔

میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ علماء کرام کے بیان کردہ معنی اور اس حدیث میں تقویٰ کے وارد شدہ معنوں کو جمع کر دوں تاکہ تقویٰ کے مکمل اور پورے معنی بیان ہو جائیں ۔

تو تقویٰ کے جامع ترین معنی یہ ہوئے کہ "ہر اس شے اور کام سے اجتناب کرنا جس سے دین کو نقصان پہنچنے کا خوف ہو"۔ تمہیں معلوم نہیں کہ بخار میں مبتلا شخص کو جب وہ ہر اس چیز سے پرہیز کرے جو اس کی صحت کے لیے مضر ہو۔ جیسے کھانا، پینا اور پھل وغیرہ ۔ تو اسے اصل پرہیز کرنے والا کہتے ہیں ۔ اسی طرح جو شخص ہر خلاف شرع امر سے اجتناب کرے تو ایسا ہی شخص درحقیقت متقی کہلانے کا حقدار ہے ۔

پھروہ چیزیں جن سے دین کو نقصان پہنچنے کا خوف ہے دو طرح کی ہیں : (۱) حرام ومعصیت ۔ (۲) حلال مگر ضرورت سے زائد۔ کیونکہ زائد از ضرورت حلال اشیاء میں مشغولیت اور انہماک بھی رفتہ رفتہ گناہ وحرام میں مبتلا ہونے کا باعث بن جاتا ہے ۔ اور وہ اس طرح کہ زائد از ضرورت حلال اشیاء کے استعمال سے اور ان کی عادت ڈالنے سے نفس کی حرص، اس کی سرکشی اور شہوات زور پکڑ جاتی ہیں اور بندہ گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ تو جو شخص اپنے دین کو مکمل طور پر محفوظ کرنا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ حرام اور فضول حلال سے اجتناب کرے ۔ تاکہ فضولِ حلال سے حرام تک نہ پہنچ جائے ۔ اسی امر کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس ارشاد مبارک میں بیان فرمایا ہے :

ترکھم ما لا بأس بہ حذرا عما بہ بأس ۔ — فضول حلال سے بھی پرہیز کرتے ہیں تاکہ حرام میں نہ پڑ جائیں ۔

تو تقویٰ کی جامع ترین تعریف یہ ہوئی کہ "دین میں ہر نقصان دہ چیز سے اجتناب و پرہیز کرنا"—— یہ ہے تقویٰ کی حقیقت و ماہیت کا مفصل بیان ۔ والحمد للہ ۔

اور علم سِر کے اعتبار سے تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ "ہر اس بُرائی سے دل کو دُور رکھنا جس کی مثل بندے نے پہلے بُرائی نہ کی ہو" تاکہ گناہوں سے دور رہنے کا عزم ان سے حفاظت کا ذریعہ بن جائے ۔

پھر شر دو قسم ہے :

ایک شرِ اصلی، اور یہ وہ ہے جس سے شرع نے صراحتہً روکا ہو ۔ جیسے گناہ اور معاصی ۔

دوسرا شرِ غیر اصلی ۔ اس سے وہ شر مراد ہے جس سے شرع نے تادیباً روکا ہو ۔ اور وہ فضول اور زائد از ضرورت حلال ہے ۔ جیسے عام مباح چیزیں، جن سے شہوت کو تقویت ملتی ہے ۔

شرِ اصلی سے بچنا فرض ہے اور نہ بچنے کی صورت میں مستحق عذاب ہوگا ۔ شرِ غیر اصلی سے اجتناب بہتر و مستحب ہے، اور نہ اجتناب کرنے پر روزِ قیامت حشر میں حساب کے لیے روکا جائے گا ۔ اور اس سے ہر شئے کا حساب لیا جائے گا ۔ اور دنیا میں بلا ضرورت امور کے ارتکاب پر اسے عار و ندامت دلائی جائیگی ۔

شرِ اصلی سے بچنے والے کا تقویٰ کم درجے کا ہے، اور یہ طاعت پر استقامت کا درجہ ہے ۔ اور شرِ غیر اصلی سے بچنے والوں کا درجہ بلند ہے اور یہ ترکِ مباح زائد از ضرورت کا درجہ ہے ۔ اور جو شخص دونوں قسم کا تقویٰ اپنے اندر پیدا کرلے وہ کامل متقی ہے اور یہی وہ شخص ہے جس نے تقویٰ کے پورے حقوق ملحوظ رکھے ۔ ایسا

شخص ہی تقویٰ کے پورے فوائد حاصل کرتا ہے اور اسی کا نام کامل ورع ہے جس پہ دین کے کمال کا دارو مدار ہے۔ دربارِ الٰہی میں حاضری کے لیے جن آداب کی ضرورت ہے وہ اسی تقویٰ سے حاصل ہوتے ہیں تقویٰ کے ان معنوں کو خوب سمجھو اور پھر ان پہ عمل کرو۔

سوال :

یہ بیان فرمائیے کہ اس تقویٰ کے حصول کا کیا طریقہ اور کیا ذریعہ ہے۔ اور ہم اپنے نفس کو اس کا کیسے عامل بنا سکتے ہیں تاکہ یہ علم ہو جائے کہ نفس کو اس تقویٰ سے لگام کس طرح دی جائے ؟

جواب :

اس کی صورت یہ ہے کہ نفس کو پورے عزم وثبات سے ہر معصیت سے روکا جائے۔ اور ہر طرح کے فضول حلال سے دور رکھا جائے۔ ایسا کرنے سے بدن کے ظاہری و باطنی اعضا صفتِ تقویٰ سے موصوف ہو جائیں گے۔ آنکھ، کان، زبان، دل، پیٹ، شرمگاہ اور باقی جملہ اعضاء اور اجزاء بدن میں تقویٰ پیدا ہو جائے گا۔ اور نفس تقویٰ کی لگام میں اچھی طرح آ جائے گا۔

اس باب کی شرح بہت طویل ہے "احیاء علوم دین" میں ہم نے اس کی تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن جس امر کا بیان یہاں زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ پانچ اعضاء کی خصوصیت سے نگہداشت کی جائے وہ اعضاء یہ ہیں :

آنکھ۔ کان۔ زبان۔ دل اور شکم۔

دین کو ضرر و نقصان سے بچانے کے لیے ان مذکورہ اعضاء کو ہر معصیت، ہر حرام، ہر فضول حلال اور ہر اسراف سے حفاظت میں رکھنا ضروری ہے۔ جب ان پانچ اعضاء کی حفاظت ہو گئی تو امید ہے کہ بدن کے باقی اعضاء بھی محفوظ ہو جائیں گے اور بندہ پورے طور پہ تقویٰ کی صفت کے ساتھ موصوف ہو جائے گا۔

ہم پانچ فصلوں میں ان اعضاء سے متعلقہ امور کا بیان کرتے ہیں اور نہیں بتاتے ہیں کہ کون کون سی چیز ان کے لیے حرام ہے۔ جن سے ان کو حفاظت میں رکھنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں یہ بیان اس کتاب کے حجم کے مطابق ہو گا۔ یعنی مختصر۔

فصلِ اوّل آنکھ کے بیان میں :

پھر تم پر اپنی آنکھ کی حفاظت بھی لازم ہے۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں حفظِ نظر کی توفیق دے)۔ کیونکہ آنکھ ہی ہر فتنے اور ہر آفت کا سبب ہے۔ اور میں اس کے متعلق تین اصول بیان کرتا ہوں جن پر کاربند ہونے سے نظر کی حفاظت ان شاء اللہ تعالیٰ پوری طرح میسر آجائے گی۔

پہلا اصول وہ جو قرآن مجید کی اس درج ذیل آیت میں بیان کیا گیا ہے :

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَصْنَعُوْنَ ۔

اے حبیب! اہلِ ایمان سے کہو کہ اپنی نظر جھکائے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے بہت پاکیزہ بات ہے۔ اور (اے ایمان والو) تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

اے عزیز! تو جان کہ اس مختصر سی آیت میں غور کرنے سے مجھے تین عجیب و نادر معانی معلوم ہوئے ہیں۔ یعنی اس آیت میں تادیب، تنبیہ اور تہدید تین امر جمع کر دیے گئے ہیں۔

تادیب یعنی ادب سکھانا۔ تو اس آیت کے اس جملے میں ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ چونکہ اس آیت میں لفظ يَغُضُّوْا وارد ہوا ہے، جو صیغہ امر ہے۔ تو غلام پر لازم ہو جاتا ہے کہ آقا کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کے بتائے ہوئے آداب کو بجا لائے۔ ورنہ بے ادبوں میں شمار ہوگا۔ اور بے ادب غلام کو آقا کی مجلس میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ملتی اور نہ وہ آقا کے سامنے آنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس نکتے کو ذہن نشین کر لو اور اس میں غور کرو۔ کیونکہ اس میں بہت کچھ ہے۔

اور تنبیہ ان الفاظ میں ہے : ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ۔ اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظروں کو جھکائے رکھنا مومنوں کے دلوں کو زیادہ پاک کرنے والی شے ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ طہارت کے معنی میں ہے اور تزکیہ تطہیر کے ہم معنی۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ نظروں کو جھکائے رکھنا مومنوں کی نیکیوں کو بڑھانے اور زیادہ کرنے کا باعث ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے معنی لغت میں بڑھنے اور زیادہ ہونے کے بھی آتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ نظر نیچی رکھنا دل کو بہت زیادہ پاک کرتا ہے اور طاعت و خیر میں اضافے کا ذریعہ ہے۔ اور

یہ اس لیے ہے کہ اگر تم نظر نیچی نہ رکھو بلکہ اسے آزادانہ ہر چیز پر ڈالو تو بسا اوقات تم بے فائدہ اور فضول بھی ادھر اُدھر دیکھنا شروع کرو گے اور پھر رفتہ رفتہ تمہاری نظر حرام پر بھی پڑنا شروع ہو جائے گی۔ اب اگر قصداً حرام پر نظر ڈالو گے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ تمہارا دل حرام شے پر فریفتہ ہو جائے اور تم تباہی کا شکار ہو جاؤ۔ کیونکہ روایات میں وارد ہے:

ان العبد ینظر النظرۃ ینغعل فیھا	بعض اوقات بندہ کسی شے پر نظر ڈالتا ہے تو اس
قلبہ کما ینغعل الادیم فی	اس طرح اثر قبول کرتا ہے جس طرح چمڑہ عمل
الدباغ	دباغت سے رنگ کو۔

اور اگر اس طرف دیکھنا حرام نہ ہو بلکہ مباح ہو تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا دل مشغول ہو جائے۔ اور اس کے سبب تمہارے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خطرات آنے شروع ہو جائیں۔ اور شاید دوسرے کی چیزوں تک عملی طور پر نہ پہنچ سکو اور اس طرح وسوسوں کا شکار ہو کر نیکیوں سے رہ جاؤ۔ لیکن اگر تم نے کسی طرف دیکھا ہی نہیں تو ہر فتنے، وسوسے اور خطرے سے محفوظ رہو گے، اور اپنے اندر راحت و نشاط محسوس کرو گے۔

اس چیز کو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

ایاکم والنظرۃ فانھا تزرع	اپنے آپ کو نظر حرام سے پوری احتیاط سے بچاؤ
فی القلب الشھوۃ کفی بھا لصاحبھا	کیونکہ ایسی بدنظری دل میں شہوت کی تخم ریزی کرتی
فتنۃ۔	ہے اور اس گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو فتنے
	میں مبتلا کر دیتی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد ہے:

نعم حاجب الشھوات غض	آنکھ کو نظر حرام سے روکن شہوات سے بچنے کا
الابصار۔	بہترین طریقہ ہے۔

کسی شاعر نے کیا اچھا کہا ہے:

وانت اذا ارسلت نظرک رائدًا ۔۔۔ لعلک یومًا اتعبتک المناظر

رایت الذی ما کلہ انت قادر ۔۔۔ علیہ ولا عن بعضہ انت صابر

(۱) اگر تم اپنی آنکھ کو کھلا چھوڑ دو گے تو رنگا رنگ نظارے ایک روز تمہیں مشقت میں ڈال دیں گے۔
(۲) تم وہ اشیاء دیکھو گے کہ نہ تو ان تمام پر تم کو قدرت ہوگی اور نہ ان میں بعض سے صبر ہو سکے گا۔
جب تم ہر وقت نظر نیچی رکھو گے، اور اسے بے فائدہ اور لایعنی چیزوں پر نہیں ڈالو گے تو تمہارا سینہ وساوس سے صاف رہے گا۔ دل فارغ ہوگا اور خطرات سے راحت میں رہو گے۔ تمہارا نفس آفات سے سلامتی میں رہے گا اور کسب حسنات کی طرف زیادہ توجہ دے سکو گے۔ اس نکتہ جامعہ کو خوب سمجھ لو۔ واللہ تعالیٰ الموفق

اور تہدید اس جملہ میں ہے: اَللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَصْنَعُوْنَ ۔ دوسری جگہ فرمایا:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۔	اللہ تعالیٰ خائن آنکھوں کو اور سینوں میں پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔

حق تعالیٰ کا خوف رکھنے والے کے لیے یہ تنبیہ اور تہدید کافی ہے۔

دُوسرا اُصُول:

اس سلسلہ میں دوسرا اصول وہ ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان النظر الی محاسن المرأة سهم مسموم من سهام ابليس فمن تركها اذاقه الله طعم عبادة تسره	غیر محرم عورت کے حسن وجمال پر نظر ڈالنا ابلیس کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ تو جو شخص ایسا کرنا ترک کر دے گا، اللہ تعالیٰ اسے سرور آمیز عبادت کا مزا چکھائے گا۔

عبادت میں حلاوت اور مناجات میں لذت عابدین کے نزدیک ایک بہت بڑی چیز ہے۔ اور یہ اصول ایک تجربہ شدہ اصول ہے۔ جو بھی اس پر عمل کرے گا اسے خود اس کی تحقیق ہو جائے گی۔ بلاشبہ جب کوئی شخص نظر کو لایعنی اور بے فائدہ امور سے باز رکھے گا تو وہ عبادت میں لذت اور طاعت میں حلاوت اور دل میں صفائی محسوس کرے گا جس سے قبل ازیں خالی تھا۔

تیسرا اُصُول:

مندرجہ بالا اعضاء کی نگہداشت وحفاظت کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پر غور کیا جائے کہ قیامت

کے دن ان اعضاء سے کیا کام لینا ہے اور قیامت میں ان سے کون سے کام سرانجام دینے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگر یہ اُس کام کے قابل نہ رہے تو سخت حسرت وخسارہ اُٹھانا پڑے گا۔ یہ خیال دل میں جاگزیں ہو جانے سے بھی ان کی نگہداشت ہو سکتی ہے۔

پاؤں تو فردوس بریں کے باغات ومحلات میں چلنے پھرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور ہاتھ جنت میں شراب طہور کے چھلکتے جام پکڑنے اور میوہ جات توڑنے کے لیے دیے گئے ہیں۔ اور آنکھ دیدار الٰہی سے لطف اندوز ہونے کے لیے عطا ہوئی ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس باقی اعضاء بھی علیحدہ علیحدہ کاموں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور ان مذکورہ مقاصد سے دونوں جہان میں اور کوئی اعلیٰ اور افضل مقصد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جن چیزوں کو اعلیٰ ترین مقاصد کے لیے تیار کیا گیا ہو انہیں لازمًا فضول و نامناسب افعال وحرکات سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

اگر تم ان مذکورہ تین اصولوں پر کاربند ہو جاؤ گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہر فضول وحرام چیز سے بچے رہو گے۔ وَاللہ ولی التوفیق وھو حسبی ونعم الوکیل۔

فصل دوم کان کے بیان میں:

کان کو بھی بُری اور فضول باتوں کے سُننے سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کا ضروری ہونا دو وجہ سے ہے۔

ایک تو اس لیے کہ روایت میں آیا ہے کہ سننے والا بھی کلام کرنے والے کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے اس چیز کو ان درج ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

(۱) تحرّ من الطرق اوساطھا وعد عن الجانب المشتبه

(۲) وسمعك عن سماع القبيح كصون اللسان عن النطق به

(۳) فانك عند سماع القبيح شريك لقائله فانتبه!

(۱) افراط وتفریط سے بچ کر درمیانی راہ چلنے کی کوشش کرو اور شبہے والی جانب سے دُور رہو۔

(۲) اپنے کان کو بُری باتیں سُننے سے روکے رکھو جس طرح زبان کو بُری گفتگو سے۔

(۳) کیونکہ اگر تم خلاف شرع باتیں سنو گے تو یاد رکھو کہ تم بھی کہنے والے کے ساتھ شریک سمجھے جاؤ گے۔

بُری باتیں سننے سے پرہیز کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر تم انہیں سنو گے تو دل میں وسوسے اور خیالات پیدا ہوں گے۔ اس طرح تم خیالات میں مستغرق ہو جاؤ گے اور اس صورت میں لازماً عبادت میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا ہو گی۔

پھر اے عزیز، تو جان کہ جو گفتگو انسان کے دل اور زبان تک پہنچتی ہے اس کی خاصیت ایسی ہے جیسے پیٹ میں طعام۔ اور سب جانتے ہیں کہ بعض کھانے نقصان دہ اور بعض نفع دینے والے ہوتے ہیں۔ بعض کھانے جسم کی غذا بنتے ہیں اور بعض زہر کی مانند بُرا اثر کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اچھی اور پاکیزہ گفتگو سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اور بُری گفتگو سے مُردہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ طعام کی نسبت کلام کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ دیر باقی رہتا ہے۔ اس لیے کہ نقصان دہ طعام معدہ سے نیند وغیرہ کے ذریعہ زائل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اس کا اثر کچھ وقت باقی رہنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اثر زائل نہ بھی ہو تو دوا کے ذریعہ زائل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض باتیں بسا اوقات انسان کے دل میں اس طرح جاگزیں ہو جاتی ہیں کہ بھولتی ہی نہیں۔ اگر وہ خراب اور ناروا ہوں تو انسان کو ہمیشہ ان کا تصور خرابی میں ڈالے رکھتا ہے، اور ان کی وجہ سے دل وسوسوں کی آماج گاہ بنا رہتا ہے۔ حالانکہ ان خیالات سے دل کو پاک رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے وساوس سے دل کو محفوظ رکھنے کے لیے حق تعالیٰ کی مدد طلب کرنی چاہیے۔ کیونکہ بسا اوقات یہ وسوسے کسی بلا اور آفت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور انسان کے احساسات کو خواہ مخواہ حرکت دیتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بندہ ان کے سبب کسی بڑی آفت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے کانوں کو فضول و لایعنی باتوں کے سننے سے محفوظ رکھے تو بہت سی آفات سے آرام میں رہتا ہے۔ عقل مند کو چاہیے کہ اس میں غور کرے۔ "وباللہ التوفیق"۔

تیسری فصل زبان کے بیان میں:

پھر زبان کی حفاظت و نگہداشت، اور فضولیات و لغویات سے اسے باز رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ زیادہ سرکشی و بے دینی اور سب سے زیادہ فساد و نقصان اسی عضو (زبان) سے رونما ہوتا ہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے ایک دفعہ دربار رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ، آپ میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ کس چیز کو قرار دیتے ہیں؟

تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر اشارہ فرمایا کہ "اسے"۔

حضرت یونس بن عبداللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ میرا نفس بصرے جیسے گرم شہر میں سخت گرمی کے دنوں میں روزہ رکھنے کی طاقت تو رکھتا ہے لیکن فضول گوئی سے زبان کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

تو معلوم ہوا کہ زبان سب سے زیادہ ضرر رساں اور خطرناک ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت بہت ضروری اور اس پر کنٹرول کرنے کے لیے بڑی کوشش وجدوجہد کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں اس کی حفاظت کے تین اُصول بیان کرتے ہیں:

پہلا اُصول وہ جو سیدنا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انسان روزانہ صبح جب بیدار ہوتا ہے تو تمام اعضاء زبان سے مخاطب ہو کر اس امر کی تاکید کرتے ہیں کہ دن کو درستی وصداقت پر قائم رہنا۔ اور بیہودہ وفضول گوئی سے بچے رہنا۔ کیونکہ اگر تو درست اور ٹھیک رہے گی تو ہم بھی درست رہیں گے، اور اگر تو کج روی کے راستے پر چلے گی تو ہم بھی کج روی کے راستے پر چل پڑیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کلام کے معنی یہ ہیں کہ زبان کی اچھی بُری باتیں انسان کے اعضاء پر باقی اعضا پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اچھی باتیں تو مزید توفیقِ خداوندی کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں اور بُری ذلت وخواری کا باعث۔ اس سلسلے میں حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جو منقول ہے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اذا رأیت قساوۃ فی قلبك وھناً	جب تم اپنے دل میں قساوت، بدن میں سستی
فی بدنك وحرمانا فی رزقك	اور رزق میں تنگی محسوس کرو تو سمجھ لو کہ تم سے
فاعلم انك تکلمت فیما	کہیں فضول اور لایعنی کلمے نکل گئے ہیں جس کا
لا یعنیك	یہ نتیجہ ہے۔

دوسرا اصول:

وقت بہت قیمتی شے ہے۔ اس کی قدر کرنا بہت ضروری ہے۔ اور ذکرِ الٰہی کے سوا اکثر اوقات بندے سے لغو اور بیکار باتیں ہو جاتی ہیں اور ان میں پڑ کر وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

حضرت حسان بن سنان رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ ایک بالا خانے کے پاس سے

گزرے تو اس کے مالک سے دریافت کیا "یہ بالا خانہ بنائے تمہیں کتنا عرصہ گزرا ہے"؟ یہ سوال کرنے کے بعد آپ دل میں سخت نادم ہوئے اور نفس سے مخاطب ہو کر یوں فرمایا "اے مغرور نفس، تو فضول ولایعنی سوالات میں وقتِ عزیز کو ضائع کرتا ہے" پھر اس فضول سوال کے کفارے میں آپ نے ایک سال روزے رکھے۔

وہ لوگ کس قدر خوش نصیب ہیں جو وقتِ عزیز کی قیمت جان کر اس کی قدر کرتے ہیں، اور اپنی اصلاح نفس میں مصروف رہتے ہیں۔ اور کتنے بدقسمت اور احمق ہیں وہ لوگ جنہوں نے زبان کی لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے اور لغویات میں مشغول رہتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا ہی اچھا کہا ہے:

(۱) واغتنم رکعتین فی ظلمة اللیل — اذا کنت خالیا مستریحًا

(۲) واذا ھممت باللغو فی البا — طل فاجعل مکانه تسبیحًا

(۳) ولزوم السکوت خیر من النطق — وان کنت فی الکلام فصیحًا

(۱) جب تمہارا دل دُنیوی تفکرات سے خالی اور راحت میں ہو تو ایسے وقت کو غنیمت جانو اور رات کی تاریکی میں نوافل میں مصروف رہو۔

(۲) اور اگر کسی وقت لغو و باطل سخن زبان سے نکالنے لگو تو زبان کو اس سے روک لو اور اس کی جگہ رب تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس زبان سے ادا کرو۔

(۳) کیونکہ لغو و باطل گفتگو سے سکوت و خاموشی ضروری ہے۔ اگرچہ تم کتنے ہی صاف زبان کیوں نہ ہو۔

تیسرا اصول:

حفظِ زبان سے اعمالِ صالحہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ کیونکہ جو شخص زبان کی نگہداشت نہیں کرتا بلکہ ہر وقت گفتگو میں مصروف رہتا ہے تو لامحالہ ایسا شخص لوگوں کی غیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مشہور فقرہ ہے:

من کثر لغطه کثر غلطه — یعنی زیادہ گو زیادہ غلطیاں کرتا ہے۔

اور غیبت اعمالِ صالحہ کو اس طرح تباہ کرتی ہے جس طرح آسمانی بجلی۔ اور غیبت کرنے والے آدمی کے اعمال اس طرح ضائع ہوتے ہیں جس طرح وہ منجنیق (ایک طرح کی توپ) میں رکھ کر مشرق و مغرب اور

جنوب وشمال میں پھینک دیے جائیں۔

منقول ہے کہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو کسی شخص نے کہا کہ فلاں شخص نے آپ کی غیبت کی ہے۔ تو آپ نے غیبت کرنے والے آدمی کو کھجوروں کا ایک تھال بھر کر روانہ کیا اور ساتھ کہلا بھیجا کہ سُنا ہے تو نے مجھے اپنی نیکیاں ہدیہ کی ہیں۔ تو میں نے ان کا معاوضہ دینا بہتر جانا

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے غیبت کا ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا ''اگر میں کسی کی غیبت کرنا درست جانتا تو اپنی ماں کی غیبت کرتا۔ کیونکہ سب سے زیادہ میری نیکیوں کی مستحق وہ ہے۔

نقل ہے کہ ایک دفعہ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کی نماز تہجد فوت ہوگئی تو آپ کی بیوی نے آپ کو اس پر عار دلائی۔ آپ نے جواب دیا کہ گذشتہ شب ایک جماعت ساری رات نوافل میں مصروف رہی ہے۔ اور صبح انہوں نے میری غیبت کی ہے تو ان کی اس رات کی عبادت قیامت کے روز میرے اعمال کے ترازو میں رکھ دی جائے گی۔

چوتھا اُصول:

زبان کی نگہداشت کرنے سے انسان دنیا کی آفات سے سالم رہتا ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ زبان سے ایسی بات نہ نکالو جسے سُن کر لوگ تمہارے دانت توڑ دیں۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں'' اپنی زبان کو بے لگام نہ چھوڑو تاکہ تمہیں کسی فساد میں مبتلا نہ کرے۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں:

احفظ لسانك لا تقول فتبتلى ان البلاء موكل بالمنطق

(ترجمہ) اپنی زبان کی حفاظت کرو اور بے جا باتیں نہ کرو۔ کیونکہ بسا اوقات گفتگو آفت میں پڑنے کا باعث بن جاتی ہے۔

عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

(۱) الا احفظ لسانك ان اللسان سريع الى المرء فى قتله

(۲) وان اللسان دليل الفؤاد يدل الرجال على عقله

(۱) پوری احتیاط سے زبان کی حفاظت کر۔ کیونکہ یہ معمولی سا عضو بعض دفعہ بہت جلد انسان کو ہلاکت

میں ڈال دیتا ہے۔

(۲) بلاشبہ زبان انسان کے دل پر دلیل ہے جو گفتگو کرنے والوں کی عقل کا اندازہ بتاتی ہے۔

ابن ابی مطیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

(۱) لسان المرء لیث فی مکین اذا خلی الیہ لہ اغارہ

(۲) فصنہ عن الخنا بلجام صمت یکن لک من بلیات ستارہ

(۱) زبان (تباہ کرنے میں) گھات میں چھپے ہوئے شیر کی مانند ہے، جو موقع پانے پر غارتگری کرتا ہے۔

(۲) اس لیے اسے خاموشی کی لگام دے کر لغوبات سے بند رکھ۔ اس طرح تو بہت سی آفات و بلیات سے بچ جائے گا۔

بہت سے کلمات ایسے ہوتے ہیں جو زبان سے نکالنے والے کو کہتے ہیں، "ہمیں زبان سے باہر نہ نکال ـــــ اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو آفاتِ لسان سے محفوظ رکھے۔

پانچواں اُصول:

زبان کی حفاظت نہ کرنے کے باعث آخرت میں انسان عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس عذاب کا تصور ذہن میں رکھا جائے۔ اور جو آفات وہاں اس بنا پر پیش آئیں گی انھیں یاد رکھا جائے۔ اور اس سلسلہ میں تم یہ نکتہ یاد رکھو کہ تم جو گفتگو کرتے ہو وہ یا تو حرام و ناجائز ہو گی یا فضول ولایعنی۔ اگر حرام و ناجائز ہو گی تو ایسی گفتگو بلاشبہ عذاب دوزخ کا باعث ہے۔ جسے برداشت کرنے کی طاقت انسان میں نہیں ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارک ہے:

لیلۃ اُسری بی رأیت فی النار قوما یاکلون الجیف فقلت یا جبرئیل من ھؤلاء؟ قال ھؤلاء الذین یأکلون لحوم الناس۔

معراج کی رات میں نے ایک قوم دیکھی جو مردار کھا رہی تھی میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا گوشت کھاتے تھے یعنی ان کی غیبت کرتے تھے۔

اور ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

اقطع لسانک عن حملۃ القرآن وطلاب العلم ولا تمزق الناس

علماء اور طالب علموں کی غیبت سے زبان بند رکھنا اور عام لوگوں کو زبان سے چیرنا یعنی غیبت

بلسانك فتمزقك كلاب النار۔	نہ کرنا تاکہ روزِ قیامت دوزخ کے کتے تجھے دانتوں سے نہ چبائیں۔

حضرت ابو قلابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ان الغيبة خراب القلب من الهدیٰ	غیبت کی وجہ سے انسان کا دل ہدایت سے ہٹ جاتا ہے اور ویرانے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

نسال الله العصمة من ذٰلك بفضله۔

یہ کلام تو ناجائز و حرام گفتگو سے متعلق تھا۔ اب رہی مباح یعنی غیر ضروری گفتگو۔ تو وہ بھی چار وجہ سے ٹھیک نہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ فضول و لایعنی گفتگو کراماً کاتبین کو لکھنی پڑتی ہے، تو انسان کو چاہیے کہ ان سے حیا کرے اور فضول باتیں لکھنے کی ان کو تکلیف نہ دے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝	بندہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتا مگر اسے نوٹ کرنے کے لیے ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اچھی بات نہیں کہ لغو اور بیہودہ باتوں سے بھرا ہوا اعمال نامہ رب تعالیٰ کے حضور میں پیش ہو۔ اس بنا پر بندے کو چاہیے کہ فضول گفتگو سے بچے بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے کسی کو فضول گفتگو کرتے دیکھا تو کہا تیرے لیے خرابی ہو تیری یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گی۔ تو دیکھ ایسی باتیں کیوں پیش کر رہا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ بندے کو قیامت کے روز کہا جائے گا کہ اپنے اعمال نامے کو اللہ تعالیٰ کے حضور تمام مخلوق کے روبرو پڑھ کر سنائے۔ اس وقت حشر کی خوفناک سختیاں اس کے سامنے ہوں گی۔ انسان پیاس کی شدت سے مر رہا ہوگا جسم پر کپڑا نہیں ہوگا بھوک سے کمر ٹوٹ رہی ہوگی۔ جنت میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہوگا۔ اور ہر قسم کی راحت اس پر بند کر دی گئی ہوگی۔ ایسے حال میں اپنے ایسے نامۂ اعمال کو پڑھنا جو فضول و بیہودہ گفتگو سے پُر ہو کس قدر تکلیف دہ چیز ہوگی۔ اس لیے چاہیے کہ زبان سے سوائے اچھی بات کے نہ نکالے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ بندے کو فضول اور لایعنی باتوں پر ملامت کی جائے گی اور شرم

دلائی جائے گی اور بندے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے شرم وندامت کی وجہ سے انسان پانی پانی ہو جائے گا۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے اپنی زبان کو فضولیات سے روک، کیونکہ ان کا حساب طویل ہوگا۔

جو شخص نصیحت کا آرزومند ہے اس کے لیے یہ چار اصول کافی ہیں۔ اور ہم نے اپنی کتاب "اسرار معاملات دین" میں ایسے اصول پوری شرح سے لکھے ہیں۔ اگر زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو اس کا مطالعہ کرو اس میں تم کو ہر شے کا شافی بیان ملے گا۔

چوتھی فصل، دل کے بیان میں:

پھر تم پر دل کی حفاظت، اس کی اصلاح اور اسے درست رکھنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ دل کا معاملہ باقی اعضاء سے زیادہ خطرناک ہے اور اس کا اثر باقی اعضاء سے زیادہ ہے۔ اسکی درستی زیادہ دقت طلب اور اس کی اصلاح زیادہ مشکل ہے۔ اور اس کا حال زیادہ محنت طلب ہے۔ میں اصلاح قلب کے متعلق پانچ اصول بیان کرتا ہوں جن پر عمل کرنے سے دل کی اصلاح ان شاء اللہ پوری طرح ہو جائے گی۔

پہلا اصول:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝ — اللہ تعالیٰ خائن آنکھوں اور دل کے پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ۔ — جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے

ایک اور جگہ فرمایا:

إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ — بیشک اللہ تعالیٰ سینے کے راز جانتا ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کتنی دفعہ اس بات کو دہرایا اور تکرار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سینے کے اسرار پر آگاہ ہونا ہی ڈرنے اور خوف کرنے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ علام الغیوب کے ساتھ

معاملہ بہت نازک ہے۔ اس لیے تمہیں خیال ہونا چاہیے کہ تمہارے دلوں میں کس طرح کے راز ہیں جن سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے۔ اگر معاذ اللہ تمہارے خیالات و ارادے گندے ہوں تو تمہیں شرم و حیا کرنا چاہیے۔

دوسرا اصول:

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ان اللہ تعالیٰ لاینظر الی صورکم و ابشارکم وانما ینظر الی قلوبکم۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری صرف ظاہری صورتوں اور کھالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں کو بھی دیکھتا ہے۔

اس حدیث مبارک سے معلوم ہُوا کہ دل رب العالمین کی نظر کا مقام ہے۔ تو اس شخص پر تعجب ہے جو ظاہر چہرے کا اہتمام کرے۔ اسے دھوئے، میل کچیل سے ستھرا رکھے تاکہ مخلوق اس کے چہرے کے کسی عیب پر مطلع نہ ہو، مگر دل کا اہتمام نہ کرے جو رب العالمین کی نظر کا مقام ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ دل کو پاکیزہ رکھے، اسے آراستہ کرے اور ستھرا رکھے تاکہ رب العالمین اس میں کسی عیب کو نہ پائے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ دل گندگی، پلیدی اور غلاظت سے لبریز ہے۔ مگر جس پر مخلوق کی نظر پڑتی ہے اس کے لیے کوشش ہوتی ہے کہ اس میں کوئی عیب و قباحت نہ پائی جائے۔

تیسرا اصول:

دل ایک بادشاہ کی مانند ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور باقی اعضاء رعایا کی طرح ہیں کہ سب اس کی پیروی کرتی ہیں۔ تو اگر سردار درست ہو تو اس کے تابع بھی درست ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر بادشاہ درست ہو تو رعایا بھی درست اور ٹھیک ہوتی ہے۔ اس بیان کی وضاحت حضور علیہ السلام کی درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔

انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور اگر وہ خراب ہو تو سارا جسم خراب ہوتا ہے۔ سُن لو کہ وہ دل ہے

جب تمام جسم کی اصلاح قلب کی اصلاح پر موقوف ہے، تو دل کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

چوتھا اُصول:

دل بندے کے نفیس و اعلیٰ جواہر کا خزانہ ہے۔ ان اعلیٰ جوہروں میں سے ایک جوہر اعلیٰ و عمدہ ہے۔ وہ معرفت خداوندی ہے، جو دونوں جہان کی سعادت کا ذریعہ ہے۔ اور وہ قلبی بصیرت ہے جس کی وجہ سے دربارِ الٰہی میں انسان کو وجاہت اور بزرگی حاصل ہوتی ہے۔ پھر دل سے تعلق رکھنے والی عمدہ چیزوں میں سے ایک عمدہ چیز عبادات و طاعات میں نیت خالص ہے جس کے ساتھ ثواب اور جزاء کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ دل کے متعلقات میں سے علوم اور حکمت کی باتیں ہیں جو بندے کے لیے شرف کا باعث ہیں۔ اور پاکیزہ اخلاق اور اچھی عادتیں ہیں جن سے انسان کو فضیلت، عظمت اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "اسرار معاملات دین" میں اس بات کو پوری شرح و تفصیل سے لکھا ہے۔

تو جب دل ایسے گراں قدر اور بہترین جواہر کا خزانہ ہے، تو ایسے خزانے کی ہر قسم کی میل کچیل، ہر آفت اور چوروں و ڈاکوؤں وغیرہ سے حفاظت و نگہداشت ضروری ہے۔ یہ ایسا خزانہ ہے جس کی حفاظت ہر طرح ضروری ہے تاکہ اس کے گراں قدر موتی خراب نہ ہوں، اور نہ کوئی دشمن ان پر قبضہ کر سکے۔

پانچواں اُصول:

میں نے دل کے حالات پر غور کیا تو مجھے اس کے پانچ حالات ایسے ملے جو دوسرے کسی عضو میں نہیں پائے جاتے:

(۱) یہ کہ دشمن ہر وقت اس کی طرف متوجہ ہے اور اسے تباہ کرنے کا قصد کیے ہوئے ہے۔ کیونکہ شیطان انسان کے دل کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ تو قلب الہام و وسوسہ دونوں کی منزل ہے۔ شیطان اور فرشتہ دونوں اسے اپنی اپنی دعوت دینے میں مصروف رہتے ہیں۔

(۲) اس کی دوسری حالت یہ ہے کہ قلب کی مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ عقل اور شہوت دونوں اپنے اپنے لشکر اس میں دوڑاتے رہتے ہیں۔ گویا یہ عقل و شہوت دونوں کے لشکروں کا میدانِ کارزار ہے۔ اس طرح دل دونوں کی جنگ اور دونوں کے مقابلے کا مقام بنا رہتا ہے۔ تو جو مقام دونوں دشمنوں کے درمیان حد کی حیثیت رکھتا ہو اس کی نگہداشت بہت ضروری امر ہے۔

(۳) اس کی تیسری حالت یہ ہے کہ اس کے عوارض ولواحقات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ وسوسے وخطرات تیروں کی مانند ہیں جو ہمیشہ اس پر برستے رہتے ہیں۔ یا بارش کی طرح ہیں کہ ہمیشہ اس پر گرتے رہتے ہیں کبھی بند نہیں ہوتے۔ اور انسان کو یہ طاقت نہیں کہ انہیں روک یا بند کرسکے۔ اور دل کوئی آنکھ کی طرح تو ہے نہیں کہ خطرے کے وقت اسے بند کرلیا جائے اور بوقت امن کھول لیا جائے۔ نیز یہ قلب کسی تنہا مقام میں بھی نہیں اور نہ یہ کہیں رات کی تاریکی میں مخفی ہے کہ دشمن اسے نہ پاسکیں۔ اور نہ یہ زبان کی مانند دانتوں اور ہونٹوں کی حفاظت میں ہے کہ تو اسے بچا سکے اور محفوظ رکھ سکے۔ بلکہ دل تو خطرات و وساوس کا نشانہ ہے۔ اور تم میں ان خطرات و وساوس کو روکنے کی پوری قوت نہیں کہ صحیح معنی میں اس کی نگہداشت کرسکو۔ لہٰذا خطرات و وساوس کو مزید تقویت پہنچاتا رہتا ہے۔ اس بنا پر قلب سے تعلق رکھنے والے خطرات کا مقابلہ سخت کوشش اور محنت چاہتا ہے۔ اور ان خطرات کا دفاع عظیم جدوجہد کا متقاضی ہے۔

(۴) اس کی چوتھی حالت یہ ہے کہ اس کا علاج اس بنا پر بھی مشکل ہے کہ یہ انسان کی نظر سے غائب ہے۔ اس بنا پر بہت بعید ہے کہ تم اس کی آفات اور اس کے لیے ضرر رساں اشیاء کو بھانپ سکو اور ان پر اطلاع پاسکو۔ اس لیے اصلاح قلب کے لیے طویل مجاہدوں، کوششوں اور ریاضتوں کی ضرورت ہے۔

(۵) اس کی پانچویں حالت یہ ہے کہ آفات اس پر جلدی حملہ آور ہوتی ہیں اور یہ ہر وقت انقلاب وتبدیلی کے لیے تیار رہتا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ دل ہنڈیا کے اُبلنے سے بھی جلدی انقلاب میں آجاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

ماسمی القلب الا من تقلبہ   والرائ یضرب بالانسان اطوارًا

(ترجمہ) قلب کا نام اسی بنا پر قلب رکھا گیا ہے کہ یہ ہر آن ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ اور اس میں مختلف رائیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

پس اگر دل لغزش کھا جائے تو اس کی لغزش بہت بڑی لغزش ہوگی۔ اور اس کا بگڑ جانا نہایت پریشان کن امر ہوگا۔ اس لیے کہ دل کی لغزش کا ادنٰی درجہ قساوت اور غیر اللہ کی طرف میلان ہے۔ اور اس کی لغزش کا آخری درجہ یہ ہے کہ اس پر کفر کی مُہر لگ جاتی ہے۔ کیا تم نے حق تعالٰی

کا یہ ارشادِ گرامی نہیں سُنا:

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ۔ — ابلیس نے سجدہ سے انکار کر دیا اور تکبر کی راہ اختیار کی اور کافروں میں سے ہو گیا۔

اس کے دل میں تکبر تھا جس کے باعث وہ حکم ربی سے منکر اور کافر ہو گیا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَلٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ ھَوَاہُ۔ — لیکن وہ تو زمین سے چمٹ گیا اور اپنی خواہش کا پیرو بن گیا۔

تو گناہوں کی طرف میلان اور خواہشات کی پیروی چونکہ اس کے دل میں تھی اس کے باعث وہ ایک منحوس گناہ پر آمادہ ہو گیا۔ قرآن مجید میں وارد ہے:

وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ وَاَبْصَارَھُمْ کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّنَذَرُھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ۔ — اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو اُلٹ دیں گے تو جیسے اس قرآن پر پہلی بار ایمان نہ لائے اسی طرح پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔

اے عزیز، خاصانِ حق تعالیٰ اسی بنا پر دل کے معاملے میں نہایت چوکنے رہتے ہیں اور گریہ زاری میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اپنی پوری کوشش اس کی اصلاح و درستی میں صرف کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم میں وارد ہے:

یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ — اور وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن خوف و ہراس کے باعث دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو عبرت پکڑنے والوں، ہدایت یافتہ لوگوں اور اصلاح قلب کی تگ و دو کرنے والوں میں شامل فرمائے ——— وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔

سوال:

بیشک دل کی اصلاح کا معاملہ نہایت ہی اہم ہے۔ اس لیے ہمیں وہ امور بتائیے جن کو اختیار کرنے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور ان آفات و مہلکات کی بھی نشان دہی کر دیجیے جو خرابی قلب کا باعث ہیں۔ ممکن ہے ہمیں بھی اللہ تعالیٰ ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دیدے۔ اس طرح ہم آپ کے

بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں دل کی اصلاح کرسکیں ؟

جواب :

اصلاحِ قلب کے اسباب و ذرائع کی تفصیل خاصی طویل ہے ۔ یہ مختصر تالیف اس پوری تفصیل کی متحمل نہیں ۔ علمائے آخرت نے اصلاحِ قلب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ایک جامع نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۔ اور انہوں نے دل کو درست کرنے والے نوے خصائل حمیدہ اور اتنی تعداد میں خصائل رذیلہ بیان کیے ہیں جو فسادِ قلب کا باعث ہیں ۔ پھر اصلاح سے متعلق افعال وامور اور اس سلسلہ میں کوشش کا طریقہ اور لائق اجتناب امور کو مفصل طور پر بیان کیا ہے ۔ اگرچہ قلب سے تعلق رکھنے والی ابحاث بظاہر طویل معلوم ہوتی ہیں ۔ مگر خدا کی قسم جو شخص دین کی اہمیت سے واقف ہے غافلوں کی طرح خواب غفلت میں نہیں پڑا ہوا ، بلکہ بیدار ہے اور اپنی بھلائی کے امور میں غور وفکر کرتا رہتا ہے ۔ تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی توفیق و اعانت سے ان تمام تفصیلات کو جاننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کو زیادہ تصور نہیں کرے گا ۔

اور ہم نے ان تفصیلات کا کچھ تھوڑا حصہ اپنی کتاب " احیاء العلوم " کے باب شرح عجائب قلب میں بیان کیا ہے لیکن پوری تفصیل اور کیفیت علاج وغیرہ کا بیان ہم نے اپنی کتاب " اسرار معاملات دین " میں کیا ہے ۔ اور وہ ایک مستقل کتاب ہے جو فوائد عظیمہ پر مشتمل ہے لیکن ان تفصیلات سے جید اور راسخ علماء ہی کما حقہٗ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں ۔ اور اس کتاب " منہاج العابدین " میں ہم نے وہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس سے ہر مبتدی منتہی ، قوی اور ضعیف نفع حاصل کرسکے یعنی اس کتاب میں ہم زیادہ گہرائی اور باریکی میں نہیں گئے ۔

جب ہم نے ان اصولوں پر غور کیا جو علاج قلب کے سلسلے میں کام آتے ہیں ، اور جن کی بہت ضرورت ہے اور کوئی بھی شخص ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا تو چار اُصُول ہمارے سامنے آئے ۔ اسی طرح فسادِ قلب پیدا کرنے والے بھی چار امور سامنے آئے ۔ جو عابدین کے لیے سخت پیچیدگی پیدا کرنے والے اور اہل مجاہدہ کے لیے آفت ہیں ، دلوں کے لیے فتنہ ، نفس کے لیے بلا ، اصلاح میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں ۔ نیز دلوں کو عیب ناک اور برباد کرنے والے ہیں ۔ اور ان کے مقابلے میں چار اور ہیں جن سے عبادت کا معاملہ نظم وضبط اختیار کرتا ہے اور قلوب اصلاح پذیر ہوتے ہیں ۔

فسادِ قلب کا باعث یہ چار چیزیں ہیں :

(۱) دنیا کی اُمیدیں۔ (۲) عبادات میں جلدبازی۔ (۳) حسد۔ (۴) تکبر۔

اس کے مقابلے میں اصلاح کرنے والی یہ چار چیزیں ہیں :

(۱) امیدیں کم کرنا۔ (۲) معاملات میں تحمل و آہستگی۔ (۳) مخلوق کے ساتھ خیر خواہی۔

(۴) خشوع اور تواضع سے پیش آنا۔

یہ ہیں وہ آٹھ چیزیں جن کے ساتھ قلب کی اصلاح یا خرابی وابستہ ہے اور انہیں پر صلاح و فساد کا دارومدار ہے۔ اس لیے اسباب فساد سے بچو۔ اور مفید قلب باتوں کو اختیار کرو تاکہ آخرت کی مشقت سے محفوظ رہو۔ اور اپنے مقصود کو حاصل کر سکو۔ میں تمہارے آگے مختصر مگر جامع طریقہ سے ان آفات کی وضاحت کرتا ہوں۔

طولِ امل کا بیان :

لمبی امیدیں نیکی و طاعت کی راہ میں رکاوٹ ہیں، نیز ہر فتنے اور شر کا باعث ہیں۔ لمبی امیدوں میں مبتلا ہو جانا ایک لاعلاج مرض ہے، جو لوگوں کو اور بہت سی مختلف امراض میں مبتلا کرتا ہے۔

اے عزیز، جب تو لمبی امیدوں میں مبتلا ہو جائے گا تو اس سے چار چیزوں میں اضافہ ہوگا :

ایک ترک طاعت میں زیادتی اور اس کی ادائیگی میں سستی میں اضافہ ہوگا۔ اور عبادت و نیکی بجا لانے کے وقت تم اپنے دل میں کہو گے ابھی تھوڑی دیر بعد کر لوں گا۔ ابھی کافی وقت ہے۔ عبادت کا موقع فوت نہیں ہونے دوں گا۔ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل سچ فرمایا ہے :

من خاف الوعید قرب علیہ البعید۔ و من طال املہ ساء عملہ۔	جو اللہ تعالیٰ کی وعید سے ڈرتا ہے وہ دور کو بھی نزدیک خیال کرتا ہے۔ اور جو لمبی امیدوں میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ بداعمالی کا شکار ہو جاتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے :

الامل قاطع عن کل خیر والطمع مانع من کل حق۔ والصبر صائر	دنیا کی امیدیں انسان کو ہر نیک کام سے کاٹ دیتی ہیں، اور طمع و لالچ ہر حق سے انسان کو روک

الی کل خیر۔ والنفس داعیة — دنیا ہے اور صبر ہر بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے

الی کل شر۔ — اور نفس امارہ ہر شر اور برائی کی طرف بلاتا ہے۔

دوسری چیز جس سے طول امل میں زیادتی ہوتی ہے ترک توبہ ہے۔ طول امل کی وجہ سے انسان توبہ کرنے سے ٹال مٹول شروع کر دیتا ہے اور دل میں کہتا ہے ابھی توبہ کر لوں گا۔ ابھی کافی وقت ہے۔ میں ابھی جوان ہوں۔ میں ابھی کم عمر ہوں۔ توبہ ہر وقت میرے اختیار میں ہے جب چاہوں گا کر لوں گا۔ اسی طرح کے بیہودہ خیالات میں پڑ جاتا ہے اور اصلاح احوال سے پہلے ہی موت اچانک آکر اچک لیتی ہے۔ اور وہ خسرالدنیا والآخرہ ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز مال جمع کرنے کی حرص ہے جو طول امل سے اور بڑھ جاتی ہے۔ اس حرص کے نشہ میں انسان آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور اشغال دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔ اور حرص میں مبتلا ہو کر اپنے آپ سے یوں کہتا ہے "شاید میں بڑھاپے میں جا کر محتاج ہو جاؤں ضعف پیری اور کمزوری کے باعث شاید خود نہ کما سکوں لہٰذا میرے پاس فاضل ذخیرے کا ہونا ضروری ہے تاکہ بیماری یا بڑھاپے یا تنگ دستی کے وقت کام آسکے۔ اسی طرح کے ہزاروں خیالات اسے دنیا کی حرص کی طرف اور زیادہ راغب کرتے رہتے ہیں۔ ایسا انسان کھانے پینے کی چیزوں کا بڑا اہتمام کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے میں کیا کھاؤں، کبھی کہتا ہے کیا پیوں، کبھی لباس کی فکر میں ہوتا ہے۔ کبھی کہتا ہے گرمی سردی سر پر ہے اور میرے پاس کوئی شے نہیں کبھی یہ سوچتا ہے شاید میری عمر لمبی ہو۔ اور آخر عمر میں جا کر تنگدست ہو جاؤں اور پچھلی عمر میں محتاجی زیادہ غلبہ کرتی ہے۔ ایسے نازک وقت کے لیے کچھ نہ کچھ پاس ہونا ضروری ہے تاکہ اس وقت لوگوں کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں توہمات اس کو طلب و رغبت دنیا۔ موجود سامان دنیا میں بخل کرنے اور مزید جمع کرنے پر ابھارتے رہتے ہیں۔ ان بیہودہ خیالات کا کم از کم اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان دنیا کی اُمیدوں میں پھنس جاتا ہے۔ اس کی قیمتی عمر اور اس کا وقت عزیز ان امیدوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ بے فائدہ اور لغو غم و تفکرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

قتلنی هم یوم لم ادرکه قیل — آنے والے دن کی فکر نے مجھے پریشان کر رکھا ہے

وکیف ذٰلک یا اباذر فال ان — کسی نے عرض کیا وہ کیسے؟ تو آپ نے فرمایا کہ میری

امّلی جاوز اجلی۔ — لمبی امیدیں میری مدت سے تجاوز کر چکی ہیں۔

چوتھی چیز قساوت قلب اور غفلت آخرت ہے جس میں طول امل سے اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جب انسان کے دل میں عیش و عشرت کی لمبی امیدیں بس جاتی ہیں تو موت بھول جاتی ہے۔ قبر یاد نہیں رہتی۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان اخوف ما اخاف علیکم اثنتان طول الامل واتباع الھوی الا وان طول الامل ینسی الاخرۃ واتباع الھوی یصد عن الحق۔

تمہارے دو چیزوں میں مبتلا ہو جانے کا مجھے بہت زیادہ ڈر ہے۔ ایک طول امل، دوسری اتباع خواہشات طول امل تو آخرت کو بھلا دیتی ہے اور خواہشات کی پیروی انسان کو حق سے روک دیتی ہے۔

طول امل کا شکار ہونے کے بعد انسان کے نزدیک سب سے اہم اور اس کی توجہات کا مرکز دنیا اور دنیا میں عیش و عشرت کے اسباب و ذرائع بن جاتے ہیں۔ لوگوں سے میل جول اور خلط ملط کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اس طرح انسان کے دل پر قساوت چھا جاتی ہے۔ کیونکہ رقت اور صفائی قلب تو موت کو یاد رکھنے، قبر کی وحشت و تنہائی پیش نظر رہنے، آخرت کے ثواب و عذاب اور وہاں کے خوفناک مناظر و واقعات یاد رکھنے سے ہوتی ہے۔ اور جب ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو صفائی کیسے پیدا ہو؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ

ان کو زندہ رہتے عرصہ دراز گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے۔

تو جوں جوں امیدیں لمبی ہوتی جائیں گی طاعت کا جذبہ کم ہوتا جائے گا۔ توبہ کا خیال دل سے نکل جائے گا گناہوں کی کثرت ہو جائے گی۔ حرص بڑھ جائے گی، دل سخت ہو جائے گا، اور اپنا انجام بالکل بھول جائے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہوئی تو ایسے شخص کی آخرت برباد ہو جائے گی۔ تو اس سے بدحالی اور کیا ہوگی۔ اور اس سے بڑی آفت اور بلا اور کیا ہوگی؟ اور یہ سب خرابی طول امل کے باعث پیدا ہوتی۔ لہٰذا اپنی امیدیں کوتاہ رکھو، اپنی جان کو موت کے قریب تصور کرو، اپنے اقارب اور سابقین کا حال یاد کرو جنہیں موت نے ایسے وقت آ دبوچا جبکہ انہیں کوئی وہم و گمان نہ تھا اور شاید تمہارا بھی ایسا ہی حال ہو۔ اور اپنے نفس مغرور کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤ۔ اور عوف بن عبداللہ کا یہ قول یاد کرو:

کم من مستقبل یوما لم یستکمہ و منتظر غدا لم یدرکہ۔	کتنے ایسے ہیں جو صبح کو پاتے ہیں مگر شام سے قبل موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ اور کتنے ہی آئندہ کل کی انتظار میں ہوتے ہیں مگر وہ انہیں نصیب نہیں ہوتا۔

اگر تمہیں فی الواقع موت اور اس کے شدائد کا احساس ہوتا تو تم طولِ امل اور اس کی فریب کاریوں سے نفرت کرتے۔ تم نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول نہیں سنا؟ آپ نے فرمایا ہے:

الدنیا ثلاثۃ ایام امس مضی، ما بیدك منه شیء وغدا لا تدری اتدرکہ املا۔ ویوم انت فیہ، فاغتنمہ۔	دنیا تین روز ہے۔ ایک وہ جو گزر گیا۔ اس کا کچھ بھی تیرے قبضہ میں نہیں۔ ایک آئندہ کل، جس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ تجھے نصیب ہو یا نہ ہو۔ اور ایک آج کا دن جس میں تم موجود ہو۔ تو اس کو غنیمت جانو۔

نیز کیا تم نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نہیں سنا؟ آپ فرماتے ہیں:

الدنیا ثلاث ساعات۔ ساعۃ مضت وساعۃ انت فیھا وساعۃ اتدرکھا املا۔	دنیا صرف تین ساعت ہے۔ ایک وہ ساعت جو گزر گئی۔ اور ایک وہ جس میں تم اب ہو۔ اور تیسری وہ جو شاید تمہیں نصیب ہو یا نہ ہو۔

تو حقیقت میں تمہارے پاس صرف ایک ہی گھڑی ہے۔ میرے شیخ قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

"دنیا تین سانس ہے۔ ایک جو گزر گیا۔ تم نے جو عمل اس میں کرنا کر لیا۔ ایک وہ جو اب تم لے رہے ہو۔ اور ایک آئندہ جس کے پانے کا کوئی علم نہیں۔ کیونکہ کئی ایسے سانس لینے والے ہیں جن کو موت نے دوسرے سانس کی مہلت نہ دی۔" تو درحقیقت انسان ایک ہی سانس کا مالک ہے۔ ایک دن یا پوری ایک گھڑی کا بھی مالک نہیں۔ لہٰذا اس ایک سانس میں طاعت و عبادت کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی فوت ہو جائے۔ اور توبہ کرنے میں بھی جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور موت آنے والے سانس کی فرصت نہ دے۔ آنے والی گھڑی کے لیے رزق کی فکر نہ کرو۔ شاید اگلی ساعت تک زندگی وفا نہ کرے اور خواہ مخواہ فکرِ معاش میں مبتلا ہو کر یہ وقت بھی

ضائع ہو جائے اور کوشش عبث جائے لیکن انسان رزق کی تگ و دو میں مصروف ہو کر اپنا وقت عزیز ضائع کر دیتا ہے۔ کیا تمہیں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا وہ ارشاد یاد نہیں جو آپ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق فرمایا:

'ما تعجبون من اسامة المشتری	اے لوگو! تم اسامہ پر تعجب نہیں کرتے جو ایک ماہ
بصبر شہران اسامة لطویل	کے لیے خرید رہا ہے بیشک اُسامہ لمبی
الامل۔ واللہ ما وضعت قدمًا	امیدوں کا شکار ہو گیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے
فظننت انی ارفعها' ولقمة	جب بھی زمین پر قدم رکھا تو میرا یہی گمان تھا
فظننت انی اسیغها حتی یدرکنی	کہ شاید اُٹھانے سے پہلے موت آجائے۔ اور میں نے
الموت۔ والذی نفسی بیدہ	جب بھی منہ میں لقمہ ڈالا تو یہی گمان تھا کہ شاید حلق
ان ما توعدون لآت وما انتم	سے اتارنا نصیب ہو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ
بمعجزین۔	قدرت میں میری جان ہے بیشک جن باتوں کا تم سے

وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور آکر رہیں گی، اور تم اللہ تعالیٰ کو عاجز و بے بس نہیں کر سکتے۔

اے عزیز! جب تو ان باتوں کو یاد رکھے گا اور ہمیشہ یہ باتیں تیرے ذہن میں موجود رہیں گی تو یا تو ضرور تیری دنیوی امیدیں کوتاہ ہو جائیں گی۔ اس وقت تیرا نفس طاعات کی طرف جلد مائل ہو گا اور تجھے جلد توبہ کرنے کا خیال پیدا ہو گا۔ توبہ سے گناہ جھڑ جائیں گے اور تجھے دنیا سے نفرت ہو جائے گی، اور آخرت میں حساب کے اندر آسانی پیدا ہو جائے گی اور وہاں پشیمانی نہیں ہو گی۔ تیرا دل آخرت اور اس کے خوفناک مناظر کے دھیان میں لگا رہے گا۔ تیرے نفس کی حالت تبدیل ہو جائے گی۔ اسی طرح جب تم ایک ایک کر کے آخرت کے حالات کا اپنے ذہن میں معائنہ کرتے رہو گے تو تم سے قساوت قلبی دور ہو جائے گی۔ قساوت کی بجائے دل میں رقت اور صفائی پیدا ہو جائے گی۔ اور اس رقت اور صفائی کی برکت سے تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کا ڈر پیدا ہو جائے گا۔ اور یوں عبادت میں استقامت نصیب ہو جائے گی۔ اور اپنی عاقبت اور آخرت میں کامیابی کی امید قوی ہو جائے گی ——— یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل اور امیدیں کوتاہ کرنے سے ہو گا۔

روایت ہے کہ کسی شخص نے حضرت زرارہ بن اوفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ان کی وفات کے بعد

خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا "اے برزخ میں بسنے والو! تمہارے نزدیک کونسا عمل بہتر ہے"؟ تو آپ نے جواب دیا "رضائے الٰہی اور امیدوں کو کوتاہ رکھنا"۔

اے عزیز! تو بھی اپنے حال پر نظر کر، اور یہ بلند مقام حاصل کرنے میں پوری کوشش کر۔ کیوں کہ طول امل سے بچنا بڑی نیکی کی بات ہے، جس سے قلب اور نفس کی اصلاح ہوتی ہے ——— واللہ تعالیٰ ولی التوفیق بفضلہ وبرحمتہ۔

دوسری آفت، حسد:

بے شک حسد نیکیوں کو تباہ کرتا ہے اور گناہوں پر راغب کرتا ہے۔ یہ بڑا برا مرض ہے جس میں بڑے بڑے علماء وقراء مبتلا ہیں، عوام اور جہلاء کا کیا ذکر۔ اس حسد نے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور نار دوزخ میں ڈال دیا۔ کیا تم نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ ارشاد نہیں سنا؟ آپ نے فرمایا ہے:

ستۃ یدخلون النار بستۃ: العرب بالعصبیۃ، والامراءُ بالجور، والدھاقین بالکبر، والتجار بالخیانۃ واھل الرساتیق بالجھل والعلماء بالحسد

چھ قسم کے لوگ چھ وجہ سے دوزخ میں جائیں گے عرب عصبیت کی وجہ سے۔ اُمراء ظلم کے باعث چوہدری لوگ تکبر کی وجہ سے، تاجر لوگ خیانت اور بددیانتی کے باعث، اہلِ دیہات جہالت کے باعث اور علماء حسد کی وجہ سے۔

بے شک جو آفت علماء کو بھی دوزخ میں لے جانے کا باعث اور سبب ہے اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

اے عزیز! جان لے کہ حسد سے پانچ خرابیاں اُبھرتی ہیں:

(۱) طاعات میں خرابی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔

حسد نیکیوں کو اس طرح برباد کرتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔

حسد سے دوسری چیز جو پیدا ہوتی ہے وہ گناہ اور برائیاں ہیں۔ حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں: حاسد کی تین نشانیاں ہیں:

يتملق اذا شهد. و يغتاب اذا غاب و يشمت بالمصيبة اذا نزلت

جب سامنے آتا ہے تو چاپلوسی کرتا ہے۔ پشت پیچھے غیبت کرتا ہے۔ اور جب دوسرے پر مصیبت آتی ہے تو خوش ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں حسد کی برائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حاسد کے شر سے پناہ میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔

اور حاسد کے شر سے پناہ میں رکھ جب وہ حسد کرنے پر اُتر آئے۔

اللہ تعالیٰ نے حسد کے شر کو شیطان اور ساحر کے ساتھ ملا کر بیان کیا اور فرمایا ان سب سے پناہ مانگو۔ تو غور کر لو کہ حسد کتنا بڑا فتنہ اور اس کا شر کتنا بڑا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اس سے تحفظ کے لیے مجھ سے مدد طلب کرو اور میری پناہ میں آؤ۔

حسد سے تیسری چیز بے چینی اور بے مقصد غم و فکر کا لاحق ہونا ہے۔ بلکہ غم و فکر کے ساتھ طبیعت پر بوجھ اور معصیت کی رغبت بھی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت ابن سماک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے:

لم ارى ظالما اشبه بالمظلوم من الحاسد۔ نفس دائم وعقل هائم وغم لازم۔

میں نے حاسد کے سوا کسی ظالم کو مظلوم کے ساتھ زیادہ مشابہت والا نہیں دیکھا۔ بیچارہ ہر وقت افسردہ طبیعت رہتا ہے۔ پریشان خیال رہتا ہے اور ہر وقت غم میں مبتلا رہتا ہے۔

حسد سے چوتھی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ دل اندھا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"ہمیشہ خاموش رہنا اختیار کر۔ کہ اس سے تیرے اندر ورع پیدا ہوگا۔ لالچی نہ بن تاکہ فتنوں سے محفوظ رہے۔ نکتہ چین نہ بن، تاکہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے محفوظ رہے۔ حاسد نہ بن تاکہ تجھے فہم کی تیزی نصیب ہو۔"

حسد سے پانچویں خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسان ذلت اور محرومی کی لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اپنی کسی مراد میں کامیاب نہیں ہوتا، اور نہ اپنے کسی دشمن پر غالب آسکتا ہے۔ حضرت حاتم اصم

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے:

"کینہ پرور دین دار نہیں ہوتا۔ لوگوں کے عیب نکالنے والا عبادت گزار نہیں ہو سکتا۔ چغل خور کو امن نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور حاسد شخص نصرت خداوندی سے محروم رہتا ہے۔

میں کہتا ہوں حاسد شخص اپنی مراد میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کی مراد تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں سے خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں چھن جائیں اور مجھے مل جائیں۔ اور حاسد آدمی اپنے دشمنوں پر کیسے غالب آ سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے دشمن تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہوتے ہیں۔ حضرت ابو یعقوب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

"اے اللہ! تو نے اپنے بندوں پر جو نعمتیں کی ہیں ہمیں ان کے حسد سے محفوظ رکھ۔ بندوں کے حالات مزید بہتر کر"۔

اور حسد ایک ایسی بیماری ہے جو عبادات کے اجر و ثواب کو تباہ کرتی ہے۔ شر و معصیت کی تخم ریزی کرتی ہے۔ آرام اور سکون کو ختم کر دیتی ہے۔ دین کی سمجھ سے محروم کرتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے انسان اپنے دشمن پر غالب نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اپنی مراد میں انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ حسد سے زیادہ کوئی خطرناک بیماری ایسی نہیں جس کے علاج کی فوری ضرورت ہو۔ لہٰذا اس مرض کے علاج سے غفلت نہ کرو بلکہ جلد اس مرض حسد کو دور کرنے کی فکر کرو ——— واللہ تعالیٰ ولی التوفیق بمنہ وکرمہ۔

عجلت یعنی جلد بازی کے نقصانات:

جلد بازی نیک مقاصد کو فوت کرتی ہے اور معاصی میں مبتلا کرتی ہے۔ اس سے چار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:

پہلی آفت اور خرابی یہ کہ عابد شخص جب خیر اور استقامت کا مرتبہ حاصل کرنے کا قصد کرتا ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بسا اوقات اس کے حصول میں جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ حالانکہ ابھی اس مرتبے کے حاصل کرنے کا وقت علم الٰہی میں نہیں ہوتا، تو فوری طور پر وہ مرتبہ و مقام حاصل نہ ہونے کے باعث یا تو وہ سست و مایوس ہو کر کوشش و مجاہدہ ترک کر دیتا ہے۔ اور اس طرح اس مرتبہ

سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور بار بار ریاضت و مجاہدہ میں غلو کرتا ہے۔ اور اس افراط کے باعث اس مرتبہ کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور یہ دونوں خرابیاں جلد بازی کا نتیجہ ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

ان دیننا هذا متین فاوغل فیه برفق فان المنبت لا ارضا قطع ولا ظهرا ابقی۔

ہمارا یہ دین بڑا مستحکم دین ہے اس کو نرمی اور متانت سے حاصل کرو جس طرح فصل حاصل کرنے والا کسان نہ تو زمین کو بالکل اکھیڑ ہی دیتا ہے اور نہ اس کی ظاہری سطح کو ہی پہلی حالت میں باقی رہنے دیتا ہے۔

اور عربی کی مشہور مثل ہے:

ان لم تستعجل تصل۔

اگر تم جلد بازی نہیں کرو گے تو اپنی منزل مقصود کو پہنچ جاؤ گے۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے:

قد یدرک التانی بعض حاجته وقد یکون مع المستعجل الزلل

بردبار شخص تو اپنے مقاصد پا لیتا ہے۔ مگر جلد باز اکثر اوقات پھسل جاتا ہے۔

دوسری خرابی اور آفت یہ ہے کہ جب عابد شخص کو کوئی حاجت اور ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا و التجا کرتا ہے اور دعا میں بہت کوشش کرتا ہے۔ اور بسا اوقات اس کی قبولیت میں عجلت کرتا ہے۔ حالانکہ علم الٰہی کے اندر اس دعا کی قبولیت میں ابھی کچھ دیر ہوتی ہے۔ تو فوراً دعا قبول نہ ہونے کی وجہ سے وہ دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ کوشش و سعی ترک کر دیتا ہے، اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے، اور اس طرح اپنے مقصد اور اپنی حاجت کو نہیں پا سکتا۔

عجلت کی تیسری خرابی اور آفت یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس عابد پر ظلم کرتا ہے تو یہ غضب ناک ہو کر بددعا کرتا ہے، تو وہ ظالم مسلمان اس بددعا کے اثر سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح بددعا کرنے والا عابد حد سے تجاوز کر جاتا ہے، اور ہلاکت و معصیت میں پڑ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ۝

دوقت مصیبت) انسان بددعائیں شروع کر دیتا ہے جس طرح آرام کے وقت نیک دعائیں۔ اور انسان بڑا جلد باز ہے۔

عجلت کی چوتھی خرابی اور آفت یہ ہے کہ عبادت کا اصل اور اس کا دارومدار ورع پر ہے۔ اور ورع ہر شے کی تہ تک پہنچنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر چیز مثلاً کھانے پینے، گفتگو کرنے کی حقیقت کے انکشاف کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ اور جب انسان جلد باز ہو، بردبار نہ ہو، اور نہ متحمل مزاج ہو تو وہ کسی کام کے اندر توقف، تحمل، بردباری، ضروری غور و فکر سے کام نہیں لے گا، بلکہ ہر کام کی انجام دہی میں جلد بازی کا ارتکاب کرے گا۔ تو اس طرح ضرور لغزش کھائے گا اور کھانے پینے کے معاملے میں بھی یہی جلد بازی کا وطیرہ اختیار کرے گا۔ اس طرح بعض اوقات حرام غذا بھی پیٹ میں ڈال لے گا۔ تو اس جلد بازی اور عجلت کے باعث اس کا ورع فوت ہو جائے گا۔ اور اس عبادت و بندگی میں کوئی خوبی نہیں جس میں ورع ملحوظ نہ ہو۔ تو جس آفت کے باعث انسان مراتب و منازل خیر سے رہ جائے، اپنی ضروری حاجات کے حاصل کرنے سے محروم رہے، اپنے آپ اور دوسرے مسلمانوں کی ہلاکت کا باعث بنے، اور پھر ورع کے فوت ہونے کا بھی خطرہ ہو، جو مقصودِ عبادت ہے، تو ایسی آفت کا ازالہ اور ازالہ کے بعد اصلاح نفس نہایت ضروری ہے ——— واللہ ولی التوفیق بمنہ و فضلہ۔

کبر کا بیان :

کبر ایک ایسی آفت ہے جو نیکی کا نام و نشان ہی مٹا دیتی ہے۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا؟ :

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ (ابلیس نے) انکار اور تکبر کیا اور کافروں میں ہو گیا۔

اعمال اور فروعات دینیہ کو نقصان دینے والی تمام آفات اتنی مضر اور خراب نہیں جتنا کبر ہے۔ کیونکہ یہ تو اصل بنیاد (دین) اور اعتقاد میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اور جب یہ مرض کبر بڑھ جاتا ہے تو اس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس سے اور ہزاروں طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چار خرابیاں تو ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ ایک حق سے محروم ہو جانا، دل کا اللہ تعالیٰ کی آیات معرفت سے اندھا ہو جانا۔ اور احکام خداوندی کے فہم کے متعلق ذہن کا کند ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۔	میں عنقریب اپنی آیات کے فہم سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو ناحق تکبر کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔	اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر اور سرکش کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔

تکبر سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے پر غصے اور اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ ۔	بیشک اللہ تعالیٰ متکبر لوگوں کو دوست نہیں رکھتا

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ اے خدائے قدوس! تو سب سے زیادہ کس پر ناراض ہوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

من تکبر قلبہٗ ، وغلظ لسانہٗ وصفق جبینہٗ وبخلت یدہٗ و ساء خلقہٗ ۔	جس کے دل میں تکبر ہو جس کی زبان ترش ہو، جس کی آنکھوں میں حیا نہ ہو جس کے ہاتھ بخیل ہوں اور جو بداخلاق ہو۔

تکبر سے پیدا ہونے والی تیسری خرابی دنیا و آخرت میں ذلت و خواری ہے۔ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

اجتنب ان یدرکک الموت علی ثلاثۃ علی الکبر والحرص والخیلاء فان المتکبر لا یخرجہ اللہ من الدنیا حتی یریہ الھوان من ارذل اھلہ وخدمہ والحریص لا یخرجہ اللہ تعالیٰ من الدنیا حتی یحوجہ الی کسرۃ او شربۃ ولا یجد مساغا والمختال لا یخرجہ اللہ تعالیٰ	تین حالتوں پر موت آنے سے بچ۔ تکبر پر۔ حرص پر۔ شیخی پر۔ اس لیے کہ متکبر شخص کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک موت نہیں دیتا جب تک اسے اپنے رذیل اہل وعیال اور خادموں سے ذلیل وخوار نہ کرلے۔ اور حریص کو اس وقت تک موت نہیں دیتا جب تک اُسے روٹی کے ایک ٹکڑے اور پانی کے ایک گھونٹ کے لیے نہ ترسالے۔ اور شیخی بگھارنے والے کو اس وقت تک

حتی یمرغہ ببولہ وقذرہ	موت نہیں دیتا جب تک اسے اس کے بول و پیشاب میں آلودگی کی ذلت نہ دکھائے۔

روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ متکبر کو اللہ تعالیٰ ضرور ذلیل وخوار کرتا ہے۔
متکبر شخص پر چوتھی مصیبت و آفت یہ ٹوٹتی ہے کہ وہ آخرت میں دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ ایک حدیث قدسی میں یوں وارد ہوا ہے:

الکبریاء ردائی، والعظمۃ ازاری	بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے۔
فمن نازعنی فی واحد منھما	تو جو شخص ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی مجھ سے
ادخلتہ نار جھنم۔	لینے کی کوشش کرے گا میں اسے نار دوزخ میں داخل کروں گا۔

مطلب یہ ہے کہ بڑائی اور عظمت اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ میں سے ہیں۔ کسی دوسرے کو لائق نہیں تو جو چیز تم سے خدا تعالیٰ کی معرفت زائل کرے، احکام خداوندی کے فہم سے محروم کرے (جو تمام نیکیوں کا اصل ہے)، پھر جس کے باعث اللہ تعالیٰ ناراض ہو، دنیا میں ذلت وخواری اور آخرت میں عذاب دوزخ حصہ میں آئے، ایسی خطرناک اور مہلک آفت سے بچنا اور دور رہنا نہایت ضروری ہے۔ کسی عقلمند کو زیبا نہیں کہ ایسی نقصان دہ چیز سے غفلت برتے۔ بلکہ اس سے پرہیز کرکے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آکر اس سے اپنے آپ کو بچائے ـــــ واللہ تعالیٰ ولی العصمۃ والتوفیق بمنہ ـــــ یہ ان آفات اربعہ کی تفصیل کا کچھ حصہ ہے۔ اور عقلمند آدمی جو اپنے قلب کی اصلاح کی اہمیت کو جانتا ہے، اس کے نزدیک تو ان آفات اربعہ میں سے ہر ایک آفت بھی نہایت نہایت خطرناک ہے ـــــ واللہ الموفق۔

سوال

جب آفات وامراض قلب کی نزاکت اور خطرے کا یہ عالم ہے، اور جب ان سے بچنا اس قدر ضروری ہے، اور جب ہمارے لیے ان آفات کی حقیقت وماہیت سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے، تو ازراہِ مہربانی ان کی حقیقت اور تفصیل بیان کیجیے اور وہ تدابیر اور راستے بھی بتائیے جن کو اختیار کرکے ہم ان سے محفوظ رہ سکیں۔

جواب: ان آفات وامراض کا پورا بیان بڑی طویل وعریض تفصیل چاہتا ہے۔ ہم نے ان کی

پوری تفصیلات "احیاء العلوم" اور "اسرار معاملات دین" میں لکھ دی ہیں۔ اور اس کتاب میں ہم صرف ضروری گفتگو پر ہی کفایت کریں گے ——— وباللہ التوفیق

اَمل کی حقیقت کا بیان:

ہمارے اکثر علماء کرام نے فرمایا ہے کہ اَمل اِس پختہ خیال کا نام ہے کہ میں تادیر زندہ رہوں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو، بلکہ دل میں یہ بات جاگزیں ہو کہ میری زندگی اور حیات اللہ تعالیٰ کی مشیت و علم کے ساتھ وابستہ ہے اور اس دنیا میں مجھے نیک کام کرنے کے لیے رہنا چاہیے۔ تو اس طرح کی نیت اور عزم وارادے کا نام قصرِ اَمل ہے۔ یعنی امیدوں کو کوتاہ رکھنا۔ تو جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ مجھے اس سانس کے بعد دوسرے سانس کا ضرور موقع ملے گا۔ یا آنے والی گھڑی تک میں ضرور زندہ رہوں گا۔ تو ایسے شخص کو آمِل کہیں گے یعنی لمبی اُمیدوں میں گرفتار۔ ایسا عقیدہ اور خیال گناہ ہے۔ کیونکہ یہ ایک پوشیدہ معاملے پر حکم لگانا ہے۔ لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی مشیت سے مقید کرے اور یوں کہے کہ میں ان شاء اللہ زندہ رہوں گا۔ یا اللہ تعالیٰ کے علم میں اگر میری زندگی باقی ہے تو میں زندہ رہوں گا۔ تو ایسے شخص کو آمِل نہیں کہتے۔ بلکہ ایسے شخص کو تارکِ اَمل کہا جائے گا۔ یوں ہی اگر کوئی نیک ارادوں کے ساتھ ایسی امید رکھے تو اسے طولِ امل میں گرفتار نہیں کہیں گے۔ بلکہ ایسا شخص قاصر الامل (امیدیں کوتاہ رکھنے والا) کہلائے گا۔ کیونکہ ایسا شخص کسی معاملے میں بھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر رہا۔ تم بھی یہی روش اختیار کرو۔ اور ہر وقت طولِ امل کے نتائج و عواقبِ بد کو پیشِ نظر رکھو۔ اور دل کو امیدیں کوتاہ رکھنے پر مضبوط اور قائم رکھو۔

پھر اُمید دو قسم ہے: (۱) عام لوگوں کی امیدیں۔ اور (۲) خاص لوگوں کی امیدیں۔

عام لوگوں کی امیدیں یہ ہیں: سامانِ دنیا جمع کرنے کے لیے زندگی کی آرزو، اور یہاں طویل عمر تک زندہ رہنے کا ارادہ اور پروگرام۔ اس طرح کی امیدیں سراسر گناہ ہیں۔ اس کے برعکس ثواب یہ ہے کہ انسان دنیا سے متعلق معاملات میں اپنی امیدیں کوتاہ کرے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَ	آپ ان غافل لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دیں
يُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ	کہ کھائیں، سامانِ زیست سے نفع اُٹھائیں اور

يَعْلَمُوْنَ ۝ دنیوی آرزوؤں اور امیدوں کی غفلت میں پڑے رہیں تو انہیں عنقریب اپنے طرزِ زندگی کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

اور خاص قسم کی امید یہ ہے کہ انسان ایسے نیک کاموں کی بجا آوری کے لیے دنیا میں رہنے کی آس و اُمید لگائے جن میں خطرے کا اندیشہ ہو اور درستی کی امید کم ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک معین نیکی اس کے سامنے ہوتی ہے لیکن اسے بجا لانے کی اس میں صلاحیت اور استعداد نہیں ہوتی۔ وہ اس طرح کہ اسے عمل میں لانے کی صورت میں انسان عُجب یا ریا میں پڑ جاتا ہے اور اس نیکی کا اجر و ثواب محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے یہ درست نہیں کہ جب انسان نماز یا روزہ یا کوئی اور نیک کام شروع کرے تو وہ دل میں یہ یقین اور اعتقاد رکھے کہ میں اسے ضرور پورا کروں گا۔ کیونکہ یہ ایک پوشیدہ چیز پر حکم لگانا ہے، جو درست نہیں۔ اس قسم کا کوئی قطعی ارادہ کر لینا بندے کے لیے روا نہیں۔ بلکہ درست بات یہ ہے کہ ہر نیک کام شروع کرتے وقت یہ خیال کرے کہ اگر یہ کام میرے لائق اور میرے حق میں بہتر ہو تو خدا تعالیٰ مجھے اسے کرنے کی توفیق و ہمت دے۔ یا میں اس کام کو اِن شاء اللہ تعالیٰ پورا کروں گا۔ یا یہ اعتقاد رکھے کہ میں اس کام کو اسی صورت میں پورا کر سکتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو۔ یہ قیود و شرائط اس لیے ملحوظ رکھے تاکہ درازیٔ امید کے عیب سے بچ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ	اس طرح ہرگز نہ کہنا کہ یہ کام میں کل ضرور کروں گا
غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۝	بلکہ یوں کہو اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں یہ کام کروں گا۔

علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ طولِ اَمل کے مقابلہ میں مجازی طور پر نیت محمودہ کو قرار دیا گیا ہے، کیونکہ نیت محمودہ والا انسان عموماً طول امل سے بچا ہوتا ہے۔ چونکہ نیت محمودہ کی بہت ضرورت ہے اور اس کی معرفت اور پہچان کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک جامع اور مناسب تعریف بیان کی ہے۔ اور وہ تعریف یہ ہے: "کسی نیک کام کو شروع کرنے کا پختہ ارادہ کرنا اور ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھنا کہ اس کا اتمام و اختتام اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت سے ہے۔

سوال:

کام شروع کرنے کا ارادہ تو پختہ کیا جائے، مگر پھر اس کے اختتام و اتمام کو خدا تعالیٰ کی مشیت و مرضی

پر موقوف کرنا کیوں ضروری ہے۔ جب کہ اس کا اتمام خدا تعالیٰ کی مشیّت و مرضی پر موقوف ہے تو چاہیے کہ آغاز کام کے وقت بھی خدا کی مشیّت ہی ملحوظ رہے۔ نہ کہ اپنی طرف سے پختہ ارادہ کر لیا جائے۔

جواب :

آغاز کام میں پختہ ارادہ کر لینا اس لیے درست اور روا ہے کہ اس وقت کام وجود میں نہیں آیا ہوتا۔ لہٰذا ابتداء میں ریا اور عجب وغیرہ کا خطرہ نہیں۔ مگر اتمام و اختتام کے وقت چونکہ کام اور فعل کا وجود ہے اس لیے اس وقت دو خطرے ہیں۔ ایک یہ کہ شاید یہ کام مجھ سے اتمام و اختتام کے آخری نقطے تک پہنچنا ہے یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ درمیان میں ریا اور عجب لاحق ہو جائے اور وہ عمل برباد ہو جائے۔ اس لیے اس کے اچھے اتمام کے لیے ان شاء اللہ کہنا اور اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ ان شاء اللہ تو اس لیے کہ یہ کام منزلِ تکمیل تک پہنچے۔ اور اللہ کے حوالے اس لیے کرے تاکہ ریا و عجب وغیرہ آفات سے محفوظ رہ سکے۔ ہر عمل خیر کے لیے اس قسم کے ارادے کا نام نیت محمودہ ہے ——— اس مضمون کو خوب غور سے سمجھو۔

اے عزیز! جان لے کہ امیدیں کوتاہ رکھنے کا قلعہ موت کی یاد ہے۔ اور موت کو یاد رکھنے کا ذریعہ اچانک موت آجانے کا خیال ہے۔ نیز یہ خیال رکھنا کہ موت کہیں غفلت، بے خبری اور غرور کی حالت میں نہ آجائے۔ اس بیان کا ذہن نشین رہنا بہت ضروری ہے۔ تاکہ تمہارا وقتِ عزیز فضول قیل و قال اور گپ بازی میں نہ گزرے۔ اور لوگوں سے بے مقصد میل و ملاقات کی وجہ سے ضائع نہ ہو ——— واللہ الموفق بفضلہ

حسد کی حقیقت کا بیان :

اپنے مسلمان بھائی سے ایسی نعمت چھن جانے کے ارادے کا نام حسد ہے جس میں اس مسلمان کے لیے بہتری اور بھلائی ہو۔ اور اگر چھن جانے کا ارادہ نہ ہو، بلکہ یہ ارادہ ہو کہ ایسی ہی نعمت مجھے بھی مل جائے تو یہ حسد نہیں بلکہ اسے غبطہ کہتے ہیں۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول میں کہ "حسد جائز نہیں مگر دو چیزوں میں"۔ حسد سے مراد غبطہ ہے۔ آپ نے مجازاً غبطہ کو حسد سے تعبیر کر دیا۔ کیونکہ دونوں معنی کے لحاظ سے قریب ہیں۔

اور اگر ایسی نعمت کے زوال کا ارادہ ہو جس میں مسلمان کے لیے بہتری نہ ہو تو ایسے ارادے کا نام "غیرت" ہے۔ حسد، غبطہ اور غیرت میں یہی فرق ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

حسد کے مقابلہ میں "نصیحت" ہے۔ مسلمان کے لیے ایسی نعمت کے باقی رہنے کے خیال کا نام نصیحت ہے۔

سوال :

ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ مسلمان کے لیے اس نعمت میں بھلائی ہے؟ تا کہ اس سے نصیحت کا اظہار کریں یا حسد کریں۔

جواب :

بسا اوقات ہمیں ظن غالب ہوتا ہے کہ اس کام میں مسلمان کے لیے بھلائی ہے۔ ایسی صورت میں نصیحت پر عمل کرنا چاہیے اور حسد سے بچنا چاہیے۔ اور اگر اُس نعمت کی بھلائی اور بہتری مشتبہ ہو، تو اس کے زوال یا بقاء کا ارادہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اُسے اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی مشیت کے سپرد کرنا چاہیے: تا کہ حسد سے پرہیز اور نصیحت پر عمل ہو سکے۔

حسد سے دُور رکھنے والی چیز (نصیحت اور خیر خواہی) کے جذبے کو برقرار رکھنے کی صورت یہ ہے کہ انسان مسلمانوں کے ساتھ دوستی اور موالات کی تاکیدات کو یاد کرے جو اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہو چکی ہیں۔ اور اس یاد کو پختہ کرنے والی چیز یہ ہے کہ انسان مومن بھائی کے حقوق کا تصور کرے۔ اس کے مرتبے کی بلندی اور اس کے مال کی حرمت جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے؛ نگاہ میں رکھے اور مومن کی ان بزرگیوں اور عظمتوں کا تصور کرے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کو عطا کرے گا۔ اور اس بات کا خیال کرے کہ مجھے دنیا میں مومنین کے ساتھ تعاون، ان کی مدد، اور ان کے ساتھ جمعہ و جماعات میں شرکت کے اندر کیا کیا عظیم فائدے ہیں۔ پھر اہلِ ایمان کے ساتھ تعاون اور ان کی امداد کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ آخرت میں تمہاری شفاعت کریں گے۔

تو اس قسم کے خیالات و تصورات انسان کو اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ خیر خواہی پر اُبھارتے ہیں اور حسد سے بچاتے ہیں ——— واللہ ولی التوفیق بفضلہ۔

عُجلت یعنی جلد بازی کی حقیقت :

عجلت دراصل دل میں ایک موجود قائم معنی کا نام ہے جو انسان کو بے سوچے سمجھے اور بلا غور و فکر کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور عمل میں جلد بازی کا باعث بنتا ہے۔ اور اس عجلت کے مقابل وصفِ اناءت ہے یعنی تحمل و بُردباری سے کام کرنا۔ اور اناءت دل میں موجود ایک ایسے معنی کا نام ہے جو بندے کے کاموں میں احتیاط، غور و فکر اور تحمل و بُردباری پیدا کرتا ہے۔ اور توقف کی ضد اور مقابل وصف تعسف ہے یعنی بے سوچے سمجھے کام شروع کر دینا۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے توقف و اناءت میں یہ فرق بتایا ہے کہ کام شروع کرنے سے قبل اس کے متعلق غور و فکر اور سوچ و بچار کرنے کو توقف کہتے ہیں اور کام شروع کر کے اس میں آہستگی اختیار کرنے کو تاکہ کام بہتر طریقہ سے انجام کو پہنچے، اناءت کہتے ہیں۔

پھر اناءت اور تحمل پیدا ہونے کا یہ طریقہ ہے کہ انسان جلد بازی کی آفات اور نقصانات و خرابیوں کو خیال میں حاضر کرے۔ اور تعسف یعنی بے سوچے کام کرنے اور جلد بازی کرنے سے جو ندامت و ملامت ہوگی اسے ذہن میں لائے۔ اس طرح کرنے سے ضرور ان شاء اللہ بندے میں توقف و تحمل کی صفت پیدا ہوگی۔ نیز تعسف و عجلت سے بھی نجات حاصل ہوگی ـــــــ واللہ تعالیٰ ولی العصمۃ۔

کبر کی حقیقت :

نفس کی بلندی و عظمت کے خیال کو کبر کہتے ہیں۔ اس خیال سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ کو حقیر و کمتر خیال کرنے کا نام فروتنی ہے اور فروتنی سے تواضع پیدا ہوتی ہے۔ پھر تواضع و تکبر ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں :

(۱) تواضع عام۔ (۲) تواضع خاص۔

(۱) تکبر عام۔ (۲) تکبر خاص۔

تواضع عام تو یہ ہے کہ بندہ معمولی حیثیت کے لباس، مقام رہائش اور سواری پر اکتفا کرے۔ اور تکبر عام یہ ہے کہ انسان معمولی نوعیت کے لباس، مکان اور سواری وغیرہ پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس میں بلند و

ارفع حیثیت کا طلب گار ہو۔ اور تواضع خاص یہ ہے کہ ہر درجے کا انسان اپنے نفس کو حق کے تابع کرنے کی کوشش کرے۔ اور تکبر خاص یہ ہے کہ اس طرح کی کوشش نہ کرے۔ ایسا تکبر گناہ کبیرہ و معصیت ہے

اور تواضع عام کو اپنے اندر مضبوط و مستحکم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنی ابتدائی حالت، پیدائش، موت اور اس موجودہ وقت کی پریشانیوں اور آلودگیوں کو یاد کرے۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے:

اولك نطفة مذرة وآخرك	تیری ابتدا تو رحم میں پڑا ہوا قطرہ ہے اور تیری انتہا
جيفة قذرة وانت فيما بينهما	ناپاک مردار ہے۔ اور اس وقت تو ان دو حالتوں کے
حامل العذرة۔	درمیان اپنے پیٹ میں پاخانے کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے

تواضع خاص کو مستحکم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ حق سے عدول کرنے اور باطل میں منہمک ہونے والے شخص کے انجام اور اس کے عذاب و سزا کو یاد کرے۔ ایک صاحب بصیرت انسان کے لیے آفاتِ قلب پر مطلع ہونے کے لیے اس قدر وضاحت اور بیان کافی ہے۔ واللہ الموفق ولی التوفیق

پانچویں فصل شکم کی حفاظت کے بیان میں:

اے طالب عبادت! تجھ پر اپنے شکم کی حفاظت بھی لازم و ضروری ہے۔ پیٹ کی اصلاح اور حفاظت ایک نہایت اہم مشکل ہے۔ لہٰذا اس کی اصلاح و حفاظت کے لیے زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ اس کے بگاڑ کا اثر بہت گہرا اور اس کی خرابی کا نقصان بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ یہ تمام جسمانی قوتوں کا منبع اور معدن ہے۔ اسی شکم سے ہی جسم میں کمزوری یا قوت، عفت یا سرکشی وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لیے اگر تم صحیح اور بامقصد عبادت کا عزم و ارادہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہو تو تم پر حرام غذا، شبہ کے کھانے اور فضول حلال سے اپنے پیٹ کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔

حرام اور شبہ کی چیزوں سے تین وجہ سے بچنا ضروری ہے:

اوّل، دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى	جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے طریقوں سے کھاتے
ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ	ہیں ایسے لوگ بیشک اپنے شکموں میں آگ جھونک
نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔	رہے ہیں اور عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ (نار دوزخ)

میں داخل ہوں گے

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا:

کل لحم نبت من سحت فالنار اولیٰ بہ۔	جو گوشت غذائے حرام سے تیار ہوا ہو اس کے لیے آگ میں جلنا ہی بہتر ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حرام اور شبہ کی غذا کھانے والا مردود بارگاہِ خداوندی ہے۔ ایسے شخص کو رب تعالیٰ کی صحیح اور کارآمد عبادت کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک پاک اور طاہر انسان ہی اللہ تعالیٰ کی خدمت کے لائق اور سزاوار ہے۔ میں کہتا ہوں کیا اللہ تعالیٰ نے ایک جنبی انسان کو اپنے گھر یعنی مسجد میں داخل ہونے اور بے وضو شخص کو قرآن مجید کو چھونے اور ہاتھ لگانے سے منع نہیں کیا؟ ضرور منع کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا:

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا۔	مجبوراً راستہ عبور کرنے والے شخص کے علاوہ کسی جنبی شخص کو نہائے بغیر مسجد میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں

دوسری جگہ فرمایا:

لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۔	اس مقدس کتاب (قرآن) کو ہاتھ نہ لگائیں مگر باوضو لوگ۔

جنبی اور بے وضو ہونا شرعاً مباح ہے۔ تو غور کرو، جب ایک مباح امر کی وجہ سے مسجد میں قدم رکھنا یا قرآن کریم کو ہاتھ لگانا منع اور ناروا ہے۔ تو وہ شخص مسجد میں کیسے آسکتا ہے جو حرام اور شبہ کی نجاست سے آلودہ ہے۔ اور ایسا شخص کس طرح رب تعالیٰ کی خدمت گزاری کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ یا اس کے ذکر اور اس کی یاد سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ ایسے شخص کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوسکتی۔

حضرت مناد رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے:

الطاعة مخزونة من خزائن الله تعالیٰ ومفتاحها الدعاء واسنانه الحلال فاذا لم يكن للمفتاح اسنان فلا يفتح الباب واذا لم يفتح باب الخزانة	طاعت اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی چابی دعا ہے اور چابی کے دندانے رزق حلال ہے۔ تو جب چابی کے دندانے نہ ہوں تو دروازہ نہیں کھل سکتا۔ اور جب تک دروازہ نہ کھلے خزانے تک پہنچنا

كيف يصل الى ما فيها من الطاعة	ناممکن ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ حرام اور شبہ کی غذا کھانے والا شخص نیک کام کرنے سے محروم ہوتا ہے۔ اور اگر اتفاقاً کوئی کارِ خیر اس سے ہو جائے تو وہ عنداللہ مقبول و منظور نہیں ہوتا۔ بلکہ رد کر دیا جاتا ہے تو ایسا شخص نیک کام کی انجام دہی میں جو وقت اور قوت صرف کرتا ہے اس سے بے فائدہ مشقت، فضول رنج و محنت اور وقت ضائع کرنے کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشادِ گرامی ہے:

كم من قائم ليس له من قيامه الا السهر وكم من صائم ليس له من صيامه الا الجوع و الظمأ۔	بہت سے رات عبادت میں کاٹنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کو بیداری کی مشقت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں جن کو دن بھر کے روزے سے سوا بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے:

لا يقبل الله صلوٰة امرء في جوفه حرام	اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جس کے شکم میں غذائے حرام پڑی ہو۔

باقی رہا فضول اور ضرورت سے زائد حلال، تو اس کا استعمال بھی بندوں کے لیے آفت اور اہلِ مجاہدہ کے لیے بلا ہے۔ مجھے اس میں غور کرنے سے دس آفتیں معلوم ہوئی ہیں۔ جن کو اصول کی حیثیت دی جا سکتی ہے

پہلی آفت: حلال طعام زیادہ کھانے سے قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے اور نور زائل ہو جاتا ہے۔ نبی کریم علیہ وعلیٰ آلہ الف الف صلوٰۃ وتسلیم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا تميتوا القلب بكثرة الطعام والشراب فان القلب يموت كالزرع اذا كثر عليه الماء۔	حاجت اور ضرورت سے زیادہ کھانے پینے سے گریز کرو کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے جس طرح ضرورت سے زیادہ پانی سے کھیتی تباہ ہو جاتی ہے۔

بعض صالحین نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ معدہ دل کے نیچے ایک اُبلتی ہوئی ہنڈیا کی طرح ہے۔ تو معدہ سے بخارات دل کو چڑھتے ہیں' اور ان کی وجہ سے دل میلا اور خراب ہو جاتا ہے۔

دوسری آفت یہ ہے کہ زیادہ کھانے سے اعضاء میں فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ فساد برپا کرنے اور بیہودہ کاموں کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جب انسان خوب پیٹ بھر کر کھاتا ہے' تو اس کے جسم میں تکبر اور آنکھوں میں بدنظری کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کان بُری باتیں سننے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ زبان بیہودہ گوئی پر آمادہ ہوتی ہے۔ شرمگاہ شہوت رانی کا تقاضا کرتی ہے' اور پاؤں ناجائز مقامات کی طرف حرکت کرنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان پیٹ غذا سے پُر نہ کرے بلکہ بھوک باقی رہنے دے تو تمام اعضاء سکون و آرام اختیار کریں گے۔ نہ تو کسی بُرائی کا لالچ کریں گے اور نہ بُرائی کو دیکھ کر مسرور اور خوش ہوں گے۔ اُستاد ابو جعفر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے

ان البطن عضوان جاء هو شبع	شکم ایک ایسا عضو ہے کہ اگر وہ بھوکا ہو تو
سائر الاعضاء يعني تسكن	جسم کے باقی اعضاء سیر ہوتے ہیں یعنی سکون پذیر
فلا تطلبك بشئ وان شبع	ہوتے ہیں' کسی شے کا مطالبہ نہیں کرتے۔ اور اگر
هو جاع سائر الاعضاء۔	شکم سیر ہو تو دوسرے اعضاء بھوکے ہوتے

ہیں یعنی مختلف بُرائیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے افعال و اقوال و اعمال کی اچھائی بُرائی کا انحصار غذا پر ہے۔ اگر پیٹ میں حرام غذا جائے گی تو حرام کاموں کی صورت میں ہی برآمد ہوگی۔ اور اگر فضول اور ضرورت سے زیادہ غذا پیٹ میں داخل ہوگی تو وہ فضولیات کے ارتکاب کی صورت میں ہی برآمد ہوگی۔ غذا گویا تخم ہے۔ اور افعال و اقوال اس تخم کا پودا ہیں جو تخم کے مطابق اُگتا ہے۔

تیسری آفت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانے سے علم و فہم میں کمی واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ شکم پُری دانائی اور زیرکی کو ختم کر دیتی ہے۔ حضرت دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ کہ اگر تو دنیا اور آخرت کی حاجت و ضرورت پورا کرنے کا خواہش مند ہے تو خالی پیٹ اسے پورا کرنے کی کوشش کر۔ پیٹ بھر کر کھا لینے کے بعد عقل اور فہم میں فتور پیدا ہو جائے گا۔ یہ بات ہر تجربہ کار پر ظاہر و واضح ہے۔

چوتھی آفت، پیٹ بھر کر کھانے سے عبادت میں کمی واقع ہوتی ہے کیونکہ انسان جب خوب سیر ہو کر کھا لیتا ہے تو اس کا بدن بوجھل ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں نیند بھر جاتی ہے اور اعضاء سست پڑ جاتے ہیں۔ کوشش کے باوجود کوئی کام نہیں کر سکتا۔ ہر وقت زمین پر مُردار کی طرح پڑا رہتا ہے کہا گیا ہے:

اذا کنت بطینا فعد نفسک	جب تو پیٹو بن جائے تو پھر اپنے آپ کو
زمینًا۔	پابہ زنجیر سمجھ۔

مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت یحییٰ علیہ السّلام نے ابلیس کو دیکھا کہ بہت سے جال اُٹھائے ہوئے ہے آپ نے ان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ابلیس نے جواب دیا یہ شہوات کے جال ہیں جن سے میں بنی آدم کو شکار کرتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کیا مجھے پھانسنے کے لیے بھی ان میں سے کوئی جال ہے؟ تو اس نے کہا نہیں، صرف ایک رات آپ نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، تو میں نے اس رات آپ پر نماز کو بھاری کر دیا۔ یحییٰ علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا "قسم خدا کی، آئندہ میں کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھاؤں گا"۔ تو ابلیس نے کہا "میں بھی آئندہ کبھی کسی کو ایسی بات نہیں بتاؤں گا"۔

یہ اس ہستی کا حال ہے جس نے ساری عمر میں ایک دفعہ سیر ہو کر کھایا، تو اس کا کیا حال ہو گا جس نے ساری عمر میں صرف ایک دفعہ شکم کو بھوکا رکھا؟ کیا ایسا شخص عبادت کی امید کر سکتا ہے؟

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

العبادۃ حرفۃ وحانوتھا الخلوۃ	عبادت ایک فن ہے جس کے سیکھنے کی جگہ تنہائی
والتھا المجاعۃ۔	اور خلوت ہے اور اس کا ہتھیار بھوک ہے۔

پانچویں آفت: پیٹ بھر کر کھانے سے عبادت کی حلاوت مفقود ہو جاتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ما شبعت منذ اسلمت لاجد	جب سے مسلمان ہوا ہوں کبھی پیٹ بھر کر نہیں
حلاوۃ عبادۃ ربی وما رویت	کھایا تاکہ عبادت کی حلاوت نصیب ہو۔ اور
منذ اسلمت اشتیاقا الی لقاء	جب سے میں مسلمان ہوا ہوں کبھی سیر ہو کر نہیں پیا رب
ربی۔	تعالیٰ کی ملاقات کے شوق سے۔

اور یہ صفات اہل کشف کی ہیں۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مکاشفین میں سے تھے۔ اسی مکاشفہ

کی طرف حضور علیہ السلام نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:

ما فضلکم ابو بکر بفضل صوم و	ابو بکر نماز روزے کی بنا پر تم سے افضل نہیں بلکہ
لا صلوۃ و انما ھو شئ وقر فی	ان کے اندر ایک شے ہے جو ان کی افضلیت کا
نفسہ	باعث ہے۔

حضرت دارانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

احلی ما تکون العبادۃ اذا التزق	میں عبادت میں حلاوت سب سے زیادہ اس وقت
بطنی بظھری۔	محسوس کرتا ہوں جب بھوک کی وجہ سے میرا پیٹ
	پیٹھ سے لگا ہوا ہو۔

چھٹی آفت: خوب پیٹ بھر کر کھانے میں حرام یا شبہے کے طعام میں پڑنے کا خطرہ ہے کیونکہ حلال اتنا وافر نہیں ملتا بلکہ معمولی گزارے کے موافق ملتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان الحلال لا یاتیك الا قوتا، و	حلال غذا تجھے نہیں ملے گی مگر معمولی گزارے
الحرام یاتیك جزافا جزافا۔	کے موافق اور حرام تیرے پاس بے تحاشا آئے گا

ساتویں آفت: فضول حلال کو جمع کرنے پھر اسے تیار کرنے اور پھر کھانے میں دل اور بدن مشغول رہتا ہے۔ پھر اس سے فارغ ہونے اور خلاصی پانے میں مصروف رہتا ہے۔ پھر اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں سے سلامتی کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ زیادہ کھانے سے بدن میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ دینی لحاظ سے تو اس سے ہزاروں خرابیاں اور آفات پیدا ہوتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اصل کل داءِ البردۃ و اصل کل	ہر بیماری کی اصل بدہضمی ہے اور ہر علاج کی
دواءِ الازمۃ۔	اصل بھوک اور کم خوراک ہے۔

حضرت مالک بن دینار فرمایا کرتے تھے:

یا ھؤلاء لقد اختلفت الی الخلاء	اے لوگو! مجھے بیت الخلا کی طرف زیادہ آنا جانا
حتی استحییت ربی بسبب کثرۃ	پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ زیادہ کھانے سے مجھے

الاکل۔ یا لیت ان اللہ جعل رزق	اپنے رب سے شرم آئی۔ کاش اللہ تعالیٰ میری روزی
فی حصاۃ امصہا حتی اموت	کنکریوں میں کر دیتا کہ میں انہیں چوس لیا کرتا یہاں تک
	کہ مجھے موت آجاتی۔

پھر اس مرض کی رو سے دنیا کی طلب کرنی پڑتی ہے۔ لوگوں سے طمع اور لالچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی خورد و نوش کی فکر میں وقت عزیز ضائع ہو جاتا ہے۔

آٹھویں آفت: آخرت میں حساب وکتاب کی مولناکیوں اور سکرات موت کی شدت کا باعث بھی پیٹ بھر کر کھانا ہے۔ روایات میں آیا ہے:

ان شدۃ سکرات الموت علیٰ	بیشک سکرات موت کی شدت دنیا کی لذتوں
قدر لذات الدنیا۔ فمن اکثر من	کے مطابق ہے۔ تو جس نے زیادہ لذتیں اٹھائیں
ھذہ اکثر لہ من تلک	اسے نزع کی تکلیف بھی زیادہ ہوگی۔

نویں آفت: اس سے آخرت کے ثواب میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ	تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل
الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ	کر چکے اور ان کو خوب برت چکے سو آج تم کو
تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ	ذلت کی سزا دی جائے گی۔ اس وجہ سے کہ تم
تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ	دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے
وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۔	کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔

تو جس قدر تم دنیا کی لذتیں حاصل کرلو گے اتنا حصہ آخرت سے کم ہو جائے گا۔ اسی لیے جب رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک علیہ السلام پر دنیا پیش کی تو فرمایا اگر تو اس کی لذت اٹھائے تو اس کے عوض تیری لذتیں آخرت میں کم نہیں کروں گا۔" اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ حضور کی خصوصیت تھی۔ دوسرے اگر یہاں لذتیں حاصل کریں گے تو ان کے عوض ان کا آخرت کا حصہ کاٹ لیا جائے گا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جائے تو دوسری بات ہے۔

مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت کی جب آپ کھانے لگے تو کھانے کو دیکھ کر فرمایا یہ تو ہمارے لیے ہے۔ اُن فقراء

مہاجرین کے بیے کیا ہے جو فوت ہو چکے اور جو کی روٹی سے بھی سیر نہ ہوئے ؛ حضرت خالدؓ نے عرض کیا کہ ان کے لیے جنت فردوس ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر وہ جنت پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے اس کے عوض اپنا حصہ یہاں دنیا میں لے لیا ہے تو ان کے اور ہمارے مرتبے میں بہت فرق ہے۔

منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیاس محسوس ہوئی۔ آپ نے ایک شخص سے پانی مانگا۔ اس شخص نے آپ کو ایک برتن دیا جس میں کھجوروں کا پانی تھا جب آپ نے اس سے منہ لگایا تو اسے ٹھنڈا اور میٹھا پایا۔ آپ رُک گئے اور آہ کھینچی۔ اُس شخص نے کہا خدا کی قسم میں نے اسے میٹھا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ تو آپ نے فرمایا اسی مٹھاس نے ہی تو مجھے اس کے پینے سے باز رکھا اگر آخرت کا خیال نہ ہوتا تو ہم بھی تمہاری اس عیش و عشرت میں شریک ہوتے۔

دسویں آفت: ضرورت سے زیادہ غذا استعمال کر کے جو ترک ادب کا ارتکاب ہوتا ہے اس پر روز حشر موقف میں روکا جائے گا۔ پوری طرح حساب لیا جائے گا اور ضرورت سے زائد غذا استعمال کرنے پر شرم و عار دلائی جائے گی اور ملامت کی جائے گی، اور شہوات کی طلب پر کوسا جائے گا۔ دنیا کی حلال چیزوں کے استعمال کا حساب اور اتباع شہوات پر زجر و توبیخ کی جائے گی اور حرام پر عذاب اور اس کی زینت اختیار کرنے پر ہلاکت و بربادی پیش آئے گی۔

یہ دس آفات ہیں جن میں سے اہلِ نظر کے لیے مضرت میں صرف ایک بھی کافی ہے۔

اسے عبادت میں کوشش کرنے والے! تجھ پر حرام اور شبہہ کی غذا سے پرہیز کرنا ضروری ہے اور رزق کے معاملہ میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ دوزخ کے عذاب سے نجات رہے۔ اسی طرح ضرورت سے زیادہ حلال کے استعمال سے بھی اجتناب لازم ہے تاکہ بندہ کسی شر اور برائی میں مبتلا نہ ہو۔ اور تاکہ قیامت کے دن حساب کے لیے محشر میں روک نہ لیا جائے ——— واللہ ولی التوفیق۔

سوال:

جب حرام اور شبہ سے بچنا اتنا ضروری ہے تو ہمیں حرام و شبہ کے حکم اور اس کی حقیقت سے بھی پورے طور پر آگاہ کیجیے

جواب:

میں کہتا ہوں (اللہ تعالیٰ تیری عمر دراز کرے) کہ میں نے حرام و شبہ کی تفصیلات پورے طور پر

اپنی کتاب "اسرار معاملات دین" میں بیان کر دی ہیں، اور کتاب احیاء العلوم میں بھی ان تفصیلات میں ایک مستقل باب لکھا ہے لیکن اس کتاب "منہاج العابدین" میں ہم چند ضروری کلمات لکھتے ہیں جن کو مبتدی اور ضعیف العمل شخص آسانی سے ذہن میں بٹھا سکے کیونکہ اس مختصر کتاب سے ہمارا مقصود یہی ہے کہ مبتدی کو خاص طور پر فائدہ ہو اور اسی طرح ہر طالب راہِ آخرت اس سے استفادہ کر سکے۔

بعض حکماء نے حرام کے متعلق یہ کہا ہے کہ:

کل ما تیقنت کونہ ملکا للغیر منھیا عنہ فی الشرع فھو حرام۔

ہر وہ شے جس کے متعلق تجھے یقین ہو کہ یہ غیر کی ملک ہے اور بغیر اجازت شرع اس میں تصرف ناجائز ہے، تو ایسی چیز حرام ہے۔

لیکن اگر اس کا یقین نہ ہو بلکہ ظن غالب ہو کہ یہ غیر کی ملک ہے تو ایسی چیز شبے والی چیز ہے۔

اور بعض نے حرام کے متعلق یہ کہا ہے کہ "ہر وہ شے جس کے متعلق یقین ہو یا ظن غالب ہو کہ یہ غیر کی ہے تو اس کا استعمال حرام ہے۔ کیونکہ شرع نے بہت احکام میں ظن غالب کو بھی یقین کے قائم مقام کیا ہے۔

اور اگر کسی شے کے حرام یا حلال ہونے میں شک ہو اور اس کے جواز یا عدم جواز کی دونوں جانب برابر ہوں۔ یہاں تک کہ تم اس حد تک شک میں پڑ جاؤ کہ حلت و حرمت کسی طرف کو ترجیح نہ دے سکو تو یہ شبے کی غذا ہے کیونکہ اس میں یہ بھی شبہ ہے کہ حرام ہو۔ لہٰذا ایسی غذا کا معاملہ مشتبہ اور اس کا حال غیر واضح ہے۔

پھر جس کی حرمت واضح ہے اس سے اجتناب فرض ہے اور جس کی حرمت میں شبہ ہو اس سے پرہیز کرنا ورع اور تقویٰ ہے۔ ہمارے نزدیک ان دونوں اقوال میں سے اس دوسرے قول کو فوقیت حاصل ہے۔

سوال:

اس زمانے کے بادشاہوں کے انعامات و تحائف قبول کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب:

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس مال کا حرام ہونا یقینی نہیں اس کے لینے اور قبول کرنے میں حرج نہیں۔ اس کے برعکس بعض دوسرے علماء کرام یہ فرماتے ہیں جس مال کا حلال ہونا واضح اور یقینی نہ ہو اسے لینا اور قبول کرنا درست نہیں۔ کیونکہ اس زمانہ کے سلاطین کے پاس اغلب حرام مال

ہوتا ہے۔ ان کے پاس مال حلال یا تو بالکل نایاب ہے، یا بالکل نادر ہے۔

اور علماء کی تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ سلاطین وقت کا مال غنی اور فقیر سب کے لیے قبول کرنا درست ہے جبکہ اس کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو۔ اگر اس مال میں کوئی خرابی ہو گی تو اس کا گناہ دینے والے کے سر ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حاکم اسکندریہ مقوقس کا ہدیہ قبول فرمایا۔ حالانکہ وہ غیر مسلم تھا نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہود مدینہ سے قرض مال لیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق فرمایا: اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ یعنی یہود مدینہ انتہا درجے کے حرام خور ہیں۔ ان حضرات کی یہ دلیل بھی ہے کہ بعض صحابہ نے ظالم حکام کا زمانہ پایا اور ان سے ہدیے تحفے وغیرہ قبول کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرے علماء یہ کہتے ہیں کہ ظالم حکام سے مال قبول کرنا کسی غنی و فقیر کو درست و روا نہیں۔ کیونکہ ارتکاب ظلم کی وجہ سے ہی ان کا نام ظالم پڑ چکا ہے، اور ان کا مال غالباً حرام ہی ہوتا ہے۔ اور اعتبار امر غالب کا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے مال سے اجتناب ضروری ہے۔

بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ جس مال کی حرمت یقینی نہ ہو اس کا استعمال فقیر کے لیے درست ہے غنی کے لیے درست نہیں۔ ہاں اس صورت میں فقیر کے لیے لینا بھی درست نہیں جبکہ یقین ہو کہ یہ غصب شدہ مال ہے۔ صرف اس نیت سے یہ مال لینا درست ہے کہ اس سے لے کر مالک کو دے۔

ان علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ فقیر کے لیے سلاطین وقت کا مال قبول کرنا اور استعمال میں لانا درست اور روا ہے۔ کیونکہ وہ مال یا تو سلطان کا اپنا ذاتی ہو گا تو اس کے قبول کرنے میں حرج نہیں۔ اور اگر مال فیء یا خراج یا عشر کا ہو تو اس میں بھی شرعاً فقیر کا حق ہے۔ یوں ہی اہل علم بھی سلاطین وقت کا دیا ہوا مال اپنے تصرف میں لا سکتے ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

"جو شخص اسلام میں بخوشی داخل ہوا، پھر قرآن کریم کی تلاوت علانیہ کرتا ہو وہ مسلمانوں کے بیت المال سے سالانہ دو سو درہم لینے کا حق دار ہے۔ ایک روایت میں دو سو دینار آئے ہیں۔ اگر دنیا میں اسے نہیں ملے گا تو آخرت میں لے گا۔"

اور جب معاملہ یہ ہے تو فقیر اور عالم ایسے مال کے حقدار ہیں۔ تو وہ اپنا حصہ لے سکتے ہیں۔

عطاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی کا مال غصب مال سے اس طرح رل مل چکا ہو کہ تمیز مشکل ہو یا کسی سلطان کے پاس غصب کا ایسا مال ہو جس کے مالک اور مالک کی اولاد مر چکی ہو اور واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو سلطان ایسے مال سے اسی صورت میں خلاصی پا سکتا ہے کہ اسے صدقہ کر دے۔ تو اس صورت میں یہ نہیں کہ اللہ اس سلطان کو صدقے کا حکم دے اور فقیر کو اس کے قبول کرنے سے منع کرے' یا فقیر کو وہ مال قبول کرنے کی اجازت نہ دے۔ حالانکہ وہ مال اس کے لیے حرام ہو۔ تو ایسے مال میں فقیر کو لینے یا نہ لینے کا اختیار ہے۔

مگر ایسے مسائل میں علماء کو تمام شقوق بیان کیے بغیر اور پوری تفصیل بیان کیے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں۔

اگر ہم اس کتاب میں یہاں اسی مسئلے کی تفصیل بیان کرنا شروع کر دیں تو ہم اپنے مقصد سے دور جا پڑیں گے جو شخص اس کی پوری تفصیلات معلوم کرنے کا خواہش مند ہو وہ ہماری کتاب "احیاء العلوم" کے باب حلال و حرام کا مطالعہ کرے۔ اس میں اس مسئلے کی پوری وضاحت مل جائے گی۔

سوال:

امراء اور تاجروں کے تحفہ تحائف کا کیا حکم ہے؟ فقراء اور علماء کو ان کے ہدیے و تحفے قبول کرنے جائز ہیں یا نہیں؟ باوجودیکہ یہ لوگ حصولِ مال میں بے احتیاطی اور اس کی حلت و حرمت میں پوری غور و احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ اور اسی طرح عام دوستوں کے تحفے تحائف کا لینا درست ہے یا نہیں؟

جواب:

جب کسی انسان کا ظاہر حال ٹھیک ہو اور اس میں کوئی شرعی خرابی معلوم نہ ہو تو ایسے شخص کا عطیہ یا صدقہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اس طرح کی کھود کرید شرعی طور پر لازم نہیں کہ زمانہ بگڑ چکا ہے اور لوگوں میں حلال و حرام کا فرق اٹھ گیا ہے' اس لیے شاید یہ صدقہ بھی حرام مال سے ہو۔ کیونکہ ایسا خیال صدقہ دینے والے کے حق میں سوءِ ظنی ہے' جو درست نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے متعلق نیک گمان رکھنے کا حکم ہے۔

پھر عطیات و صدقات کے بارے میں اصولی چیز یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق ایک شرعی حکم اور

ظاہر شریعت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ دوسرا تقویٰ کا حکم اور اس کا حق۔

شرعی حکم تو یہ ہے کہ ہر وہ صدقہ یا عطیہ قبول کر لیا جائے جس کا ظاہر درست ہو۔ اور اس کے بعد کوئی تفتیش نہ کی جائے۔ ہاں، اگر اس مال کے حرام یا غصب ہونے کا یقین ہو تو پھر لینا جائز نہیں۔

مگر تقویٰ یہ ہے کہ پوری تحقیق و تفتیش کے بغیر کسی سے قطعاً کوئی چیز نہ لی جائے۔ اگر اس میں ذرہ بھی شبہ کا گمان ہو تو رد کر دیا جائے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

ان غلاما له اتاه بلبن فشربه	ایک دفعہ آپ کا غلام آپ کی خدمت میں دودھ لایا
فقال الغلام كنت اذا جئت بشئ	آپ نے اسے پی لیا۔ غلام نے عرض کی میں پہلے جب
تسالني عنه ولم تسالني عن	بھی کوئی چیز آپ کے پاس لاتا تھا تو آپ اس کے
هذا اللبن فقال وما قصته فقال	متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے لیکن اس دودھ
رقيت قوما في الجاهلية فاعطوني	کے متعلق آپ نے کوئی استفسار نہیں فرمایا۔ تو اس
هذا فتقيأ ابوبكر الصديق رضي الله	وقت آپ نے پوچھا یہ دودھ کیسا ہے، غلام نے
تعالى عنه وقال اللهم هذا قدرق	جواب دیا کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بیمار
فما بقي في العروق فانت حسبه۔	آدمی پر منتر پھونکا تھا جس کے معاوضے میں یہ

دودھ آج انہوں نے دیا ہے حضرت صدیق اکبر نے یہ سن کر اپنے حلق میں انگلی ڈالی اور اسے قے کر دیا۔ قے کے بعد آپ نے نہایت عاجزی سے دربار الٰہی میں عرض کیا "اے میرے مولیٰ! جس پر میں قادر تھا وہ میں نے کر دیا۔ اس کا تھوڑا بہت حصہ جو رگوں میں رہ گیا ہے وہ معاف فرما دے۔"

یہ روایت اس بات کی قوی دلیل ہے کہ تقویٰ پر نظر رکھنے والے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ غذا کی پوری طرح چھان بین کرے اور پھر اسے استعمال میں لائے۔

سوال:

تمہارے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ حکم شرع کے خلاف ہے؟

جواب:

جاننا چاہیے کہ ظاہر شرع آسانی و سہولت پر مبنی ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ میں آسان اور ہر باطل سے جدا مذہب دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اور تقویٰ شدت و احتیاط پر مبنی ہے۔ کہا گیا ہے کہ متقی کا معاملہ دوسری ہزاروں پیچیدگیوں میں پھنسنے سے زیادہ سخت ہے۔ پھر یہ خیال نہ کرو کہ تقویٰ شرع سے کوئی علیحدہ چیز ہے بلکہ اصل میں دونوں ایک ہیں لیکن شرع کے حکم دو ہیں۔ ایک جواز کا حکم اور ایک احتیاط و فضیلت کا حکم۔ جائز حکم کو حکم شرع' اور افضل و زیادہ با احتیاط حکم کا نام تقویٰ ہے۔ تو یہ دونوں حکم ایک دوسرے سے جدا ہونے کے باوجود اصل میں ایک ہیں۔ اس فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

سوال:

جب ہر شے کی تفتیش اور چھان بین ضروری ہے تو اس زمانہ میں کسی چیز کو بھی استعمال کرنا صاحب تقویٰ کے لیے مشکل اور فساد سے خالی نہیں۔ حالانکہ ضروری چیزوں کا استعمال اس کے لیے لازمی ہے۔

جواب:

جاننا چاہیے کہ تقویٰ ایک سخت راستہ ہے جو شخص اس پر چلنے کا ارادہ کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے نفس اور دل کو مصائب و مشکلات برداشت کرنے پر مجبور کرے۔ ورنہ وہ تقویٰ کا راستہ طے نہیں کر سکتا۔ اسی دقت کے باعث بہت سے اہل تقویٰ اور متقدین صوفیا شہروں و آبادیوں کو چھوڑ کر کوہ لبنان پر چلے گئے۔ اور ساری عمر گھاس اور جنگلی پھل وغیرہ کھا کر گزاری جن میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ تو تقویٰ کا مرتبہ حاصل کرنے کی جس میں ہمت ہو اُسے چاہیے کہ مشکلات و مصائب اور حوادث کو برداشت کرے اور آفات کے پیش آنے پر صبر کرے' اور ان مندرجہ بالا حضرات کا طریقہ اختیار کرے لیکن جو لوگوں میں رہتے اور وہی چیزیں استعمال کرنے پر مجبور ہو جو وہ استعمال کرتے ہیں۔ تو اسے چاہیے کہ اتنا قلیل استعمال کرے جتنا سخت ضرورت کے وقت مردار استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ صرف اسی قدر پر اکتفا کرے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت قائم رکھ سکے۔ اس قدر استعمال پر اُسے معذور سمجھا جائے گا۔ اور یہ اندازہ اس کے لیے مضر نہیں ہو گا۔ اگرچہ اس میں کسی قسم کا شبہ ہو۔ اس لیے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ فسد السوق فعلیکم بالقوت (ترجمہ) چونکہ بازاروں میں حرام و حلال میں تمیز اٹھ چکی ہے۔ اس لیے صرف ضرورتی روزی پر اکتفا کرنا لازم ہے۔

میں نے سنا ہے کہ حضرت وہب بن ورد ایک ایک یا دو دو یا تین تین دن بھوکے رہتے تھے، پھر ایک روٹی پیتے تھے اور دعا کرتے تھے:

اللهم انك تعلم انی لا اقوی على العبادة واخشى الضعف والا لم اكله۔ اللهم ان كان فيه شیء من خبث او حرام فلا تواخذنی به ثم يبل رغيفه بالماء ثم ياكله۔	اے اللہ۔ تو جانتا ہے کہ میں بغیر غذا کے تیری عبادت کی طاقت نہیں رکھتا اور مجھے کمزوری کا ڈر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں یہ بھی نہ کھاتا اے اللہ اگر اس روٹی میں کوئی خرابی یا حرام ہو تو مجھے اس کھانے پہ نہ پکڑنا۔ یہ دعا کرنے کے بعد آپ روٹی کو پانی میں بھگوتے تھے، اور کھاتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دو طریقے اہل تقویٰ میں سب سے بلند تقویٰ والوں کے ہیں۔ لیکن جو لوگ ان سے تقویٰ میں کم ہیں ان کے لیے اپنی وسعت کے مطابق احتیاط ضروری ہے۔ جتنی ان میں احتیاط ہوگی اسی قدر انہیں تقویٰ سے حصہ ملے گا۔ مشہور مثال ہے کہ تم جتنی محنت و کوشش کرو گے اتنی ہی تمہیں اپنی مرادیں کامیابی ہوگی —— اور اللہ تعالیٰ کسی نیک عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اور لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ سب کچھ جانتا ہے۔

سوال:

مندرجہ بالا بیان تو حرام چیزوں کے متعلق تھا۔ ذرا حلال کے متعلق بھی بیان کر دیجیے کہ کس حد تک اس کا استعمال فضول میں داخل نہیں اور کس حد پر جا کر وہ فضول کے حکم میں داخل ہوتا ہے جس کے باعث روز قیامت بندے کو حساب کے لیے روکا جائے گا اور حساب لیا جائے گا۔ اور حلال کے استعمال کی مستحب اور مناسب مقدار کیا ہے جو فضول میں داخل نہیں اور جس کا حساب وغیرہ نہیں ہوگا؟

جواب:

مباح تین قسم ہے۔ ایک وہ جو فخر، مباہات، بڑائی اور نمائش کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ایسے استعمال کا ضرور قیامت کے دن حساب ہوگا اور اس کے حساب کے لیے ضرور وہاں روکا جائے گا اور استعمال کرنے والے کو ملامت اور شرم دلائی جائے گی۔ ایسا استعمال خدا تعالیٰ کو ناپسند اور برا ہے۔

اور ایسا استعمال بندے کے دل میں برائی پیدا کرتا ہے یعنی فخر اور بڑائی وغیرہ جو عذاب دوزخ کا باعث ہے اور اس طرح کے استعمال کا ارادہ معصیت اور گناہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ وَّ زِیْنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌ وَّ تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ۔	دنیا کی زندگی تو محض کھیل کود زینت و زیبائش مال و اولاد میں فخر و غرور اور اس میں کثرت چاہنے کا نام ہے۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من طلب الدنیا حلالا مباھیا مکاثرا مفاخرا مرائیا لقی اللہ تعالیٰ وھو علیہ غضبان۔	جو مباہات، بڑائی، فخر اور نمائش کی غرض سے حلال کی طلب کریگا وہ قیامت کے دن خدا کو اپنے اوپر غصے اور غضب ناک پائے گا۔

تو مندرجہ بالا آیت و حدیث میں ایسے مقصد والا دے پر وعید سنائی گئی ہے۔

مباح کی دوسری قسم وہ ہے جس کا استعمال محض شہوت کے طور پر ہو۔ ایسا استعمال بھی برا ہے جس پر روز قیامت حبس و حساب ہوگا۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا فرمان ہے:

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ۔	پھر تم سے ضرور نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا۔

اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

وَحَلَالُھَا حِسَابٌ۔	اور حلال کے استعمال پر روز قیامت حساب ہوگا۔

حلال و مباح کی تیسری قسم یہ ہے کہ مجبوراً قدر ضرورت شے استعمال کی جائے۔ جس سے رب تعالیٰ کی عبادت بجا لائی جا سکے۔ اتنا اندازہ ہی بہتر مستحب اور مناسب ہے۔ اتنے استعمال پر کوئی حساب و عذاب وغیرہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اتنا قلیل استعمال ثواب اور مدح کا باعث ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا	ان لوگوں کے لیے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کیا۔

اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من طلب الدنیا حلالا استعفافا	جس نے سوال سے بچنے کے لیے اور اپنے ہمسائے

عن المسئلة و تعطفا على جاره	کی امداد کے لیے اور اپنے عیال کی پرورش
و سعیا على عیاله جاء یوم	کے لیے حلال دنیا طلب کی قیامت کے روز اس
القیامة و وجهه کالقمر	کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک
لیلة البدر۔	رہا ہوگا۔

ایسے بندے کی یہ شان وفضیلت اس لیے ہے کہ اس کا قصد وارادہ نیک اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔

سوال:

وہ کیا شرائط ہیں جن کے ملحوظ رکھنے سے مباح کا استعمال خیر اور نیکی بن جاتا ہے؟

جواب:

مباح اور حلال اشیاء کا استعمال دو شرطوں سے نیکی اور خیر بنتا ہے: ایک حال۔ دوسرا قصد وارادہ

حال سے مراد یہ ہے کہ حلال و مباح کو بوقت عذر و مجبوری استعمال کیا جائے۔ عذر اور مجبوری کی صورت یہ ہے کہ ایسا موقع ہو کہ اگر حلال کو استعمال میں نہ لایا جائے تو شرعاً گرفت ہو وہ اس طرح کہ مباح شے کے استعمال نہ کرنے کے باعث بدن اتنا لاغر ہو جائے کہ فرض، سنت یا نفل ادا نہ کر سکے۔ تو ایسی صورت میں مباح کا استعمال ترک مباح سے افضل ہے۔ اگرچہ دنیا کے مباحات کو بھی استعمال میں نہ لانا بہتر اور افضل ہے مگر عذر کی صورت میں استعمال ہی بہتر و افضل ہے۔

مقصد وارادے سے مراد یہ ہے کہ حلال کے استعمال سے مقصود سفر آخرت کا توشہ تیار کرنا اور عبادت خداوندی کی قوت و استطاعت ہو۔ اس طرح کہ استعمال کے وقت دل میں یہ بات لائے کہ اگر میرا مقصود خدا تعالیٰ کی عبادت نہ ہوتا تو میں اس کو استعمال نہ کرتا۔ یہ اس کے استعمال کی دوسری وجہ ہے تو جس مباح کے استعمال میں یہ دونوں امر پائے جائیں گے ایسا استعمال مستحب، نیکی اور خیر شمار ہوگا۔ اور اگر کسی مقام پر حالت عذر تو ہو مگر مندرجہ بالا قصد وارادہ نہ ہو۔ یا قصد وارادہ تو ہو مگر حالت عذر نہ ہو تو وہاں مباح کا استعمال نیکی یا مستحب میں شمار نہیں ہوگا

پھر اس نیکی و درجہ استحباب پر استقامت کے لیے بصیرت اور نیک ارادے کی ضرورت ہے۔

یعنی جب بھی حلال یا مباح شئے کو استعمال میں لانے لگے تو یہ قصد کرے کہ میں عبادت کی قوت کی غرض سے اس کو استعمال کرنے لگا ہوں۔ اگر کہیں خدانخواستہ اس قصد سے سہو ہو جائے تو یاد آنے پر کرے۔

ہمارے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہاں تین امور ہو گئے جن کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ دو تو اس استعمال کو نیکی میں داخل کرنے کے لیے یعنی ارادہ اور حالتِ عذر اور تیسرا ہمیشہ اس قصد و ارادے کو استقامت کے لیے ملحوظ رکھنا ــــــ اس کو اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔

سوال:

حلال کا وہ استعمال جو شہرت کی غرض سے ہو کیا معصیت اور باعث عذاب ہے یا نہیں؟ اور کیا حالتِ عذر میں مباح شئے کا استعمال فرض و ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:

حالتِ عذر میں امر مباح کا استعمال افضل، خیر اور مستحب ہے، فرض اور واجب نہیں۔ اور شہرت کی غرض سے جو استعمال ہو وہ بُرا اور ناپسندیدہ ہے، اور اس سے ممانعت زجر و استحباب کے طور پر ہے۔ یہ معصیت یا عذاب کا باعث نہیں۔ ہاں روزِ قیامت اس کے حساب کے لیے بندے کو روکا جائے گا۔ اور اسے ملامت کی جائے گی اور شرم دلائی جائے گی۔

سوال:

یہ حبس و حساب کیا چیزیں ہیں جن کا بندے کو سامنا کرنا پڑے گا؟

جواب:

حساب یہ ہے کہ قیامت کے دن تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ شے کس طرح حاصل کی اور اسے کہاں خرچ کیا اور کس نیت سے خرچ کیا؟

اور حبس یہ ہے کہ حساب لینے کے لیے جنت میں داخل ہونے سے روک دیا جائے گا۔ اور یہ حبس میدان محشر میں ہوگا۔ جب تمام مخلوق پہ دہشت چھائی ہوگی اور لوگ ننگے اور پیاس کی حالت میں کھڑے ہوں گے۔ اور یہ بہت بڑی آزمائش کا وقت ہوگا۔

سوال:

جب اللہ تعالیٰ نے حلال کے استعمال کی ہمیں اجازت دی ہے تو یہ ملامت اور شرم دلانا کیوں

ہو گا؟

جواب:

یہ ملامت اور عار دلانا ترکِ ادب کی وجہ سے ہو گا۔ جیسے وہ شخص جو بادشاہ کے دسترخوان پر بیٹھے اور ادب کو ملحوظ نہ رکھے تو اسے ملامت کی جاتی ہے اور شرم دلائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ طعام اس کے لیے مباح اور جائز ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو عبادت اور بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے اس لیے بندے پر لازم ہے کہ ہر اعتبار سے اس کا بندہ اور خادم رب اور ہر فعل کو خدا کی مرضی کے مطابق کرے۔ اگر وہ عبادت یا اس کی رضا کا خیال نہ رکھے، بلکہ اپنی شہوت کی پیروی کرے، اور اپنے رب کی عبادت و بندگی سے روگردان ہو جائے، حالانکہ اس میں رب کی بندگی و عبادت کی طاقت بھی موجود ہو کوئی عذر مانع نہ ہو ـــــ اور یہ دنیا ہے بھی عبادت اور خدمت کی جگہ ـــــ تو جو شخص ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے شہوت کی پیروی کرے، وہ ضرور اپنے مالک و مولیٰ کی طرف سے ملامت و عار کا سزاوار ہوتا ہے ـــــ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

یہی تھا وہ مضمون جو ہم نے اس کتاب میں اصلاح نفس کے متعلق بیان کرنا تھا۔ اس لیے اس مضمون کو اپنے ذہنوں میں محفوظ کر دو اور اس پر عمل کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دونوں جہان میں خیر کثیر کے مالک بن جاؤ گے ـــــ فاللہ ولی العصمۃ والتوفیق بفضلہ۔

فصل

تو اے عزیز! تجھ پر لازم ہے کہ اس طویل اور سخت گھاٹی کو عبور کرنے میں پوری کوشش صرف کرے۔ کیونکہ اسے عبور کرنا زیادہ مشکل اور محنت طلب ہے۔ اور یہ گھاٹی فتنوں سے لبریز ہے کیونکہ جو بھی راہ حق سے منحرف ہو کر ہلاک و تباہ ہوا ہے وہ دنیا یا مخلوق سے میل جول یا نفس یا شیطان کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اور ہم نے اپنی کتب "احیاء العلوم"، "کتاب الاسرار" اور "القربۃ الی اللہ" وغیرہ میں اس قسم کے واقعات و مسائل تحریر کیے ہیں، جو اس گھاٹی کو عبور کرنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔

اور اس کتاب میں میرا مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے معالجہ نفس کے راز اور میری اصلاح اور میرے ذریعہ اصلاح کے طریقوں سے آگاہ کر دے۔ اس لیے میں نے اس کتاب میں مختصر مگر تمام معانی کے جامع نکتوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ جو شخص بھی ان میں غور کرے گا وہ انہیں کافی پائے گا۔ اور یہ نفیس نکتے ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور اسے راہ حق کی طرف رہنمائی کریں گے۔

اور یہ فصل دنیا، مخلوق، نفس اور شیطان سے خلاصی دینے والے نکتوں کے ساتھ مخصوص ہے تو اے عزیز! علائق دنیا سے حذر کرنا اور زہد اختیار کرنا تجھ پر لازم اور ضروری ہے۔ کیونکہ تو تین حال سے خالی نہیں:

(۱) یا تو تو صاحب بصیرت اور صاحب عقل ہے ——— تو تیرے لیے یہی کافی ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کی دشمن ہے۔ اور اللہ تیرا دوست اور حبیب ہے۔ اور یہ کہ دنیا تیری عقل کو منتشر کرنے والی ہے۔ حالانکہ عقل ہی انسان کا اصل جوہر ہے۔

(۲) اور یا تو صاحب ہمت اور عبادت میں کوشش کرنے والے لوگوں میں سے ہے ——— تو تیرے لیے یہی کافی ہے کہ دنیا اپنی نحوست میں اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ عبادت کے ارادے سے باز رکھتی ہے۔ اور اس کی فکر تجھے بندگی و اعمال خیر سے روکتی ہے جب دنیا کی فکر باعث رکاوٹ ہے تو خود دنیا کس قدر رکاوٹ کا باعث ہو گی۔

(۳) اور یا تو اہل غفلت میں سے ہے ——— یعنی تجھ میں حقائق کو دیکھنے کی بصیرت نہیں۔ اور نہ تجھ میں اعمال خیر بجالانے کی ہمت ہے۔ اس صورت میں تیرے لیے یہی کافی ہے کہ تجھے ایک دن اس دنیا سے جدا ہونا پڑے گا۔ یا یہ دنیا تجھ سے اچانک جدا ہو جائے گی۔ جیسا کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ان بقيت لك الدنيا لم تبق	اگر دنیا تیرے لیے باقی رہے گی تو اس کے لیے باقی
لها فای فائدة اذا لك فی طلبها	نہیں رہے گا۔ اس لیے طلب دنیا میں کیا فائدہ
وانفاق العمر عزیز علیها۔	یا اپنی عمر عزیز اس کی طلب میں ضائع کرنے سے کیا حاصل؟

ایک عربی شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے:

(۱) ھب الدنیا تساق الیک عفوا　　الیس مصیر ذالک الی زوال

(۲) فما ترجوا بعیش لیس یبقی　　وشیکا قد تغیرہ اللیالی

(۳) وما دنیاک الا مثل ظل　　اظلک ثم اذن بارتحال

(۱) مان لیا کہ دنیا وافر مقدار میں تیری طرف کھنچی چلی آ رہی ہے۔ لیکن کیا یہ ایک دن فنا نہیں ہو گی ؟

(۲) تجھے اس عیش سے حقیقی خوشی کی امید کیا ہو سکتی ہے جو چند دن کے بعد فنا ہو جائیگی اور جس کا آرام عنقریب تکلیف اور رنج میں تبدیل ہو جائے گا۔

(۳) اس دنیا کی مثال بالکل سائے جیسی ہے جس میں تو ذرا آرام کرتا ہے اور پھر وہ سایہ وہاں سے زائل ہو جاتا ہے۔

تو عقل مند کو ہرگز مناسب نہیں کہ اس دنیا کے دھوکے میں آئے۔ ایک عربی شاعر نے بالکل درست کہا ہے ؎

اَضْغَاثُ نَوْمٍ اَوْ کَظِلٍّ زَائِلٍ
اِنَّ اللَّبِیْبَ بِمِثْلِهَا لَا یُخْدَعُ

(ترجمہ) دنیا خواب کی طرح ہے۔ یا زائل اور فنا ہو جانے والے سائے کی طرح۔ اور بیشک عقل مند ایسی ناپائیدار اور فانی شے سے دھوکا نہیں کھاتا۔

ابلیس کے شر سے بچنا ضروری ہے :

باقی رہا شیطان، تو اس کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرمایا :

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝

(اے میرے نبی! دعا کے طور پر) یوں کہہ اے میرے رب! میں شیاطین کے وساوس سے تیرے پاس ہی پناہ لیتا ہوں۔ اور اے میرے رب میں اس بات سے بھی تیرے پاس ہی پناہ لیتا ہوں کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔

تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جو سب سے بہتر، سب سے زیادہ عالم، سب سے زیادہ عقلمند اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ بلند رتبہ والے ہیں وہ اس چیز کے محتاج ہیں کہ شیطان سے پناہ مانگیں، تو تو جو جہالت، عیوب اور غفلت کا مجموعہ ہے، شیطان سے پناہ مانگنے کا محتاج نہیں؟ ——— ضرور محتاج ہے اور سخت محتاج ہے۔

لوگوں سے میل جول کی مذمت:

لیکن لوگوں سے میل جول کا معاملہ، تو اس کی قباحت کے ثبوت کو صرف یہی کافی ہے کہ اگر تو ان سے میل جول کرے گا، اور ان کی خواہشات کی پیروی کرے گا تو گناہ گار ہو جائے گا، اور اپنی آخرت کے معاملے کو خراب کر دے گا۔ اور اگر ان کی خواہشات کی مخالفت کرے گا تو ان کی اذیتوں اور زیادتیوں سے رنجیدہ ہوگا۔ اور تیری دنیا کی زندگی مکدر ہو جائے گی۔ پھر ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ تیرے جانی دشمن بن جائیں۔ اور اس طرح تو ان کے فتنے میں مبتلا ہو جائے۔ اور اگر تو ان سے میل جول اچھا رکھیگا تو وہ تیری مدح اور تعظیم کریں گے۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس طرح تو عُجب اور خود ستائی کے فتنہ میں مبتلا ہو جائے۔ اور اگر وہ تیری مذمت اور بُرائی کریں گے اور تجھے حقیر و ذلیل خیال کریں گے تو اس صورت میں تو کبھی غمناک ہوگا، اور کبھی ناجائز غصہ کرے گا۔ اور یہ مدح یا مذمت دونوں ہلاک کرنے والی آفتیں ہیں۔

پھر تم ذرا یہ تو یاد کرو کہ جب تمہیں قبر میں دفن ہوئے صرف تین یوم ہوں گے تو تجھے بالکل بھلا دیں گے۔ وہاں صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی موجود ہوگی۔ تو کیا یہ واضح نقصان نہیں کہ تو ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے عزیز وقت کو ضائع کر دے جن سے نہ تجھے وفا کی امید ہے اور جن کے ساتھ نہ زیادہ دیر تو نے رہنا ہے۔ اور اپنے پیارے رب کی خدمت و طاعت کو ترک کر دے جس کی طرف آخر تو نے رجوع کرنا ہے۔ مرنے کے بعد صرف وہی ہمیشہ کے لیے تیرا ساتھ دے گا۔ اور حقیقت میں سب کا وہی حاجت روا ہے۔ اور ہر بات میں صرف اسی پر بھروسہ ہونا چاہیے۔ اور ہر حال میں ہر شدت و مشکل کے وقت اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔

اے عاجز انسان! میری ان باتوں اور نصیحتوں کو غور سے سن۔ شاید تجھے اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی

سے راہ ہدایت دکھا دے ــــــ اور اللہ ہی ہدایت کا مالک ہے۔

مذمتِ نفس کا بیان:

نفس کے بُرا ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ جو نفس روز و شب در روز اس کے حالات اس کے بُرے ارادے اور اس کے خلاف شرع امور کے ارتکاب کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ نفس شہوت کے وقت حیوان جیسے افعال کرتا ہے۔ غصے کے وقت درندہ بن جاتا ہے، اور مصیبت و تکلیف کے وقت چھوٹے بچے کی طرح آہ و زاری کرتا ہے اور آرام و آسائش کے وقت فرعون بن جاتا ہے۔ جب بھوکا ہوتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے اور جب سیر ہوتا ہے تو سرکش بن جاتا ہے۔ اگر تو اسے سیر کرے تو سرکشی کرتا ہے اور اگر بھوکا رکھے تو چیختا ہے اور بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

کحمار السوء ان اشبعتہٗ | رمح الناس وان جاع نہق

(یہ نفس منحوس گدھے کی مانند ہے جو سیری کی حالت میں خرمستی میں آ کر لوگوں کو پامال کرتا ہے۔ اور جب بھوکا ہوتا ہے تو ہانکتا ہے)۔

بعض صالحین نے بالکل درست فرمایا ہے کہ:

ان من رداءۃ ھٰذہ النفس و جھلھا بحیث اذا ھمت بمعصیۃ او انبعثت لشھوۃ فنھیتھا او تشفعت الیھا باللہ سبحانہٗ ثم برسولہ علیہ السلام و بجمیع انبیائہ و بکتابہ و بجمیع السلف الصالح من عبادہ و تعرض علیھا الموت والقبر والقیامۃ والجنۃ والنار لا تعطی لا تنفیا دولا تترک

اس نفس خبیث کی خست اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ جب کسی گناہ کا قصد کرے، یا شہوت پر اُٹھ کھڑا ہو تو تو اسے روکنے کی کوشش کرے۔ یا خدا، رسول، تمام انبیاء، کلام مجید یا تمام سلف صالحین کا واسطہ پیش کرے یا اس کے سامنے موت، قبر، قیامت، جنت اور دوزخ تک پیش کرے تب بھی گناہ سے باز نہیں آئے گا اور اپنی شہوت کو ترک نہیں کرے گا۔ پھر اگر ایک روٹی کھا کر دوسری سے اسے

الشھوۃ ثم ان استقبلتھا بمنع	روکے تاکہ یہ ٹھیرے اور طعام کی حرص کو
رغیف تسکن وتترك شھوتھا	چھوڑ دے۔ تو تجھے اس کی کمینگی اور جہالت
لتعلم خستھا وجھلھا	کا اندازہ ہو جائے گا۔

اس لیے اے عزیز! اس سے غفلت نہ کرنا۔ کیونکہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، جو اس کی حقیقت سب سے بہتر جانتا ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ۔	بیشک نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم دیتا ہے۔

حضرت احمد بن ارقم بلخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ ایک دفعہ میرے نفس نے جہاد میں شریک ہونے پر مجھے مجبور کیا۔ میں نے دل میں کہا سبحان اللہ! قرآن میں تو آیا ہے کہ نفس برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ اور میرا نفس مجھے نیک کام کی ترغیب دے' ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں سے میل جول کرکے تنہائی اور گوشہ نشینی کی وحشت کو دور کرے۔ اور لوگوں سے خلط ملط ہو کر راحت حاصل کرے۔ اور ان کے سامنے اپنی گوشہ نشینی اور بزرگی کا چرچا کرکے اپنی تعظیم اور اپنا احترام و اکرام کرائے۔ چنانچہ میں نے نفس کو جواب دیا کہ میں ہرگز تجھے آبادی میں نہیں لے جاؤں گا۔ اور کسی جان پہچان کی جگہ تجھے نہیں لے جاؤں گا۔ تو وہ اس جواب پر راضی ہو گیا۔ لیکن مجھے پھر ظن ہوا کہ یہ اپنے خلاف بات پر کیسے رضامند ہو سکتا ہے۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ خدا کا کلام سچا ہے (کہ نفس برائی کی طرف ہی جاتا ہے)۔ تو میں نے اسے کہا "میں دشمن سے جہاد و قتال کرتے کرتا رہوں۔ لیکن میرا اولیں دشمن تو ہے۔ اس لیے پہلے مقابلہ اور مقاتلہ تجھ سے ہوگا۔ میرے اس جواب پر بھی نفس نے برا نہ منایا۔ میں نے چند اشیاء اور شمار کیں جو اس کے خلاف تھیں۔ لیکن وہ اس پر بھی برافروختہ نہ ہوا۔ میں دل میں حیران ہوا اور دربار ایزدی میں ملتجی ہوا کہ اے باری تعالیٰ! میں نفس کو بہر حال جھوٹا سمجھتا ہوں اور تجھے سچا۔ مجھے اس کی اصل حقیقت بتا۔ تو مکاشفہ میں میں نے سنا کہ نفس کہہ رہا تھا:

"اے احمد! تو مجھے ہر روز شہوتوں سے روک کر قتل کرتا ہے اور ہر بات میں میری مخالفت کرکے تو مجھے تنگ اور پریشان کرتا ہے۔ اور میرے اس قتل اور تکلیف کا کسی کو پتہ نہیں چلتا اگر تو جہاد میں شرکت کرے گا تو صرف ایک بار ہی مجھے قتل کرے گا۔ بعد ازیں مجھے تجھ سے

ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ اور میں لوگوں میں اس بات کا چرچا کروں گا کہ احمد نے شہادت کا درجہ پایا۔ اس طرح میرا چرچا ہوگا اور مجھے بھی شرف حاصل ہوگا۔"

امام احمد بن ارقم فرماتے ہیں کہ اس کے اس جواب سے میں نے تہیہ کر لیا کہ ہرگز جہاد میں شرکت نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے اس سال جہاد میں شرکت نہ کی۔

اے عزیز! ذرا غور کر کہ نفس کتنا دھوکا باز اور مکار ہے کہ بعد الموت بھی تیرے اعمال حسنہ کو ریا کے ذریعہ ضائع کرتا ہے۔ ایک عربی شاعر نے بہت ہی اچھا کہا ہے ؎

توق نفسك لا تامن غوائلها

فالنفس اخبث من سبعين شيطانا

(ترجمہ) اپنے نفس کی عیاریوں سے بچ اور اس کی دھوکا بازیوں سے بے خوف نہ ہو۔ کیونکہ نفس کی خباثت ستر شیطانوں کی خباثت سے بھی زیادہ ہے)۔

اس لیے اس دھوکا باز، گناہوں میں مبتلا کرنے والے نفس خبیث سے چوکنا رہ اور ہر وقت اور ہر حال میں اپنے دل کو اس کی مخالفت پر مضبوط رکھ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا کرنے سے تو اس کی آفات سے محفوظ رہے گا اور تجھے راہ صواب نصیب ہوگا۔

پھر اے عزیز! تجھ پر لازم ہے کہ اسے شہوات و گناہوں سے باز رکھنے کے لیے تقویٰ کی لگام دے۔ اس لگام کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔

اے عزیز! تو جان کہ میں نفس کو گناہوں سے باز رکھنے کا ایک نفیس قاعدہ بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ:

عبادت دو قسم ہے۔ ایک مامورات۔ (یعنی جن کے کرنے کا حکم ہے)۔ دوسرے منہیات۔ (یعنی وہ چیزیں جن سے بچنا ضروری ہے)۔ اور مامورات کے بجا لانے اور منہیات سے اجتناب کے مجموعے کا نام تقویٰ ہے۔

لیکن منہیات سے بچنا ہر حال میں بندے کے لیے افضل، زیادہ باعث حفاظت، زیادہ بہتر اور اعلیٰ ہے۔ مامورات کے مقابلے میں اس پہلو کی اہمیت زیادہ ہے۔ اسی لیے مجاہدہ و ریاضت کے بلندی شروع شروع میں مامورات پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ دن کو روزہ سے ہوتے ہیں، اور

رات کو نوافل میں کھڑے رہتے ہیں وغیر ذلک۔

اور منتہی و اہل بصیرت حضرات منہیات سے اجتناب کی زیادہ پابندی کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے دلوں کو غیر اللہ کے خیال سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے شکموں کو ضرورت سے زائد خوراک سے محفوظ رکھتے ہیں، اپنی زبانوں کو لغویات اور بیہودہ گفتگو سے بچاتے ہیں اور اپنی نظروں کو لایعنی چیزوں سے بچاتے ہیں۔ اسی لیے عابد شامی نے یونس عابد کو کہا (اور ان عابدوں کی کل تعداد سات تھی) کہ:

"اے یونس! بعض لوگ وہ ہیں جن کو سب سے زیادہ پیار نمازوں سے ہے۔ چنانچہ وہ نماز پر کسی اور عمل کو ترجیح نہیں دیتے۔ وہ عبادت کے ستون ہیں۔ وہ پوری طرح صدق و توکل پر قائم رہتے ہیں اور ہر وقت دربار خداوندی میں تضرع و دعا میں مشغول رہتے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جنہیں سب سے زیادہ روزہ سے محبت ہے۔ چنانچہ وہ روزہ پر کسی اور عمل کو ترجیح نہیں دیتے۔ اور بعض وہ ہیں جو صدقہ کو سب سے زیادہ عزیز خیال کرتے ہیں۔ اے یونس! میں تجھے ان تینوں نماز، روزے اور صدقہ کی تفسیر بتاتا ہوں کہ ان سے مراد کیا ہے؟

تو نماز سے مراد یہ ہے کہ تو ہمیشہ تکالیف و مصائب پیش آنے پر صبر کی نماز ادا کرتا رہے اور ہمیشہ احکام خداوندی کی بجا آوری میں قائم رہے۔

روزہ سے مراد یہ ہے کہ تو ہر برائی سے اپنے آپ کو روکے رکھے۔

اور صدقہ سے مراد یہ ہے کہ تیری طرف سے کسی کو اذیت اور تکلیف نہ پہنچے۔ کیونکہ تو اس سے اعلیٰ شے کا صدقہ نہیں کر سکتا۔ کسی کو اذیت نہ دینا ہی بہت بڑا صدقہ ہے اور سب سے زیادہ پاکیزہ فعل ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے جب تجھ پر روشن ہو گیا کہ منہیات سے بچنا زیادہ اہم اور اس کی رعایت اور کوشش زیادہ اولیٰ و مناسب ہے۔ تو اگر تجھے دونوں قسم کی عبادت (اوامر کی بجا آوری اور منہیات سے اجتناب) حاصل ہو جائے اور تو دونوں کا پابند ہو جائے تو تو عبادت کے معاملے میں کمال تک پہنچ گیا، اور تیری مراد حاصل ہو گئی، اور آفات سے محفوظ ہو گیا، اور اصل غنیمت تیرے ہاتھ آ گئی۔

اور اگر دونوں قسم کی عبادت تجھے حاصل نہ ہو سکے، تو چاہیے کہ تو جانب اجتناب کو اختیار

کرے۔ یہ جانب اختیار کرنے سے تو معاصی اور گناہ سے تو سالم اور محفوظ رہے گا، اور اگر تو یہ جانب اختیار نہ کرے اور گناہوں، برائیوں سے نہ بچے تو ساری رات نوافل ادا کرنے، دن کو روزہ رکھنے اور دیگر مستحب امور میں مشغول ہونے سے تجھ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ تیری یہ شب بیداری کی مشقتیں بے سود ہوں گی کیونکہ گناہوں اور برائیوں سے اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے تیری نیکیاں ساتھ ساتھ برباد اور ضائع ہوتی جائیں گی۔ اور دن کو روزہ رکھ کر جب تو غیبت، الکذب اور دوسری بیہودہ گفتگو سے پرہیز نہ کرے گا تو تیرے اس روزے کا کیا فائدہ پہنچے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ ان دو آدمیوں میں افضل کون ہے۔ ایک وہ جو نیکیاں بھی زیادہ کرے اور گناہ بھی زیادہ کرے۔ دوسرا وہ جو نیکیاں بھی کم کرے اور گناہ بھی کم کرے؟ آپ نے جواب دیا کہ دونوں برابر ہیں۔

ہم نے یہ جو کہا ہے کہ زیادہ نیکیاں کرنے کے بجائے گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری اور اہم ہے تو اس کی مثال مریض کی سی ہے کہ اس کے علاج کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو مریض کو دوا دینا دوسرا پہلو مریض کا مضر چیزوں سے پرہیز کرنا۔ تو اگر دونوں چیزیں مریض کے لیے حاصل ہو جائیں تو بیمار جلد صحت مند اور تندرست ہو جائے گا۔ اور اگر دونوں پہلو موجود نہ ہوں تو جانب پرہیز اولیٰ اور افضل ہے۔ اور ایسی دوا، دوا کوئی فائدہ نہیں دیتی جس کے ساتھ بدپرہیزی کو بھی روا رکھا جائے۔ لیکن دوا نہ ہو مگر پرہیز ہو تو یہ ضرور مفید ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَصْلُ كُلِّ دَاءٍ اَلْحِمْيَةُ

ہر بیماری کے علاج کی اصل پرہیز ہے۔

حضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پرہیز بجائے خود ایک بہترین علاج ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور علاج کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی لیے سنا گیا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے نزدیک بیمار کا سب سے بڑا اور اعلیٰ علاج بیمار کو کھانے پینے اور کام کاج سے پرہیز کرانا ہے۔ ان کے ہاں صرف پرہیز سے ہی عموماً مریض تندرست اور صحت یاب ہو جاتا ہے۔

ہمارے اس مندرجہ بالا بیان سے تجھ پر روشن اور واضح ہو گیا کہ تقویٰ ہی اصل جوہر اور نجات آخرت کا ذریعہ ہے۔ انسانوں میں متقی لوگوں کا درجہ ہی سب سے اونچا اور بلند ہے۔ اب اے عزیز! تجھ پر لازم ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے پوری کوشش اور مکمل جدوجہد کرے۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق برحمتہ۔

فصل

پھر تجھ پر چار اعضاء کی نگہداشت بھی لازم اور ضروری ہے۔ کیونکہ جسم میں یہی چار عضو بڑے اور اصل ہیں۔

آنکھ کی حفاظت:

اوّل آنکھ ۔ اس کی نگہداشت اس لیے ضروری اور لازمی ہے کہ دین و دنیا کے کاموں کا دارومدار دل پر ہے۔ اور دل کی خرابی اور اس میں وسوسے وغیرہ اکثر و بیشتر آنکھ کی وجہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی آنکھ کی حفاظت نہیں کرتا اس کا دل بے قیمت ہوتا ہے یعنی اس میں کوئی کمال یا نور وغیرہ نہیں آسکتا۔

زبان کی حفاظت:

دوسرا عضو زبان ۔ اس کی حفاظت اور نگہداشت اس لیے ضروری اور اہم ہے کہ تمہاری عبادت و طاعت کا نفع، پھل اور رسالہ اسی کی نگہداشت سے وابستہ ہے۔ اور عبادت میں وسوسے عبادت کا ضائع اور خراب ہونا بھی اکثر اسی زبان کے باعث ہوتا ہے کیونکہ بناوٹ اور سجا کر گفتگو اور غیبت وغیرہ اگرچہ ایک لفظ ہی ہو، تیری سال کی بلکہ پندرہ سال کی عبادت و ریاضت کو تباہ اور برباد کر دیتی ہے۔ اسی لیے بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ:

ما شیءٌ احق بطول السجن من اللسان۔ — سب سے زیادہ جس چیز کو قید و بند میں رکھنا ضروری ہے وہ زبان ہے۔

مروی ہے کہ سات عابدوں میں سے ایک عابد نے کہا اے یونس! جو لوگ پوری محنت اور کوشش سے عبادت میں مشغول رہتے ہیں ان کو عبادت پر جو استقامت نصیب ہوتی ہے وہ زبان کی پوری طرح نگہداشت کا نتیجہ ہے۔ پھر اس عابد نے کہا حفظ زبان سے زیادہ پسندیدہ تیرے نزدیک کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے کیونکہ دل کو ہر قسم کے وسوسوں سے پاک رکھنے کا ذریعہ یہی ہے۔

پھر تو ذرا زندگی کے وہ قیمتی لمحات تو یاد کر جو تو نے بیہودہ اور لغو گفتگو میں ضائع کیے ہیں اگر تو ان عزیز لمحات میں توبہ و استغفار کرتا تو شاید کسی نیک گھڑی میں تیری توبہ قبول ہو جاتی اور تیرے گناہ بخش دیے جاتے اور تجھے نفع ہوتا۔ یا ان لمحات میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا ورد کرتا رہتا تو تجھے بے حساب اجر و ثواب ملتا۔ یا ان لمحات میں یہ دعا کرتا "اے اللہ! میں تجھ سے عافیت اور سلامتی کا سوال کرتا ہوں" شاید کسی مبارک ساعت میں یہ الفاظ تیرے منہ سے نکلتے اور تیری دعا قبول ہو جاتی۔ اس طرح تو دنیا و آخرت کی آفات سے نجات پا جاتا"۔ تو کیا لغو اور بیہودہ کلام میں لمحاتِ زندگی کو ضائع کرنا واضح اور بین خسارہ نہیں؟ ان اوقات میں اگر زبان کو اوراد و وظائف میں مشغول رکھتا تو بڑے بڑے فائدے حاصل ہوتے۔ اور اپنے نفس اور وقت کو فضول کاموں میں نہ لگا، تاکہ روزِ قیامت تجھے ملامت نہ ہو۔ اور میدانِ محشر میں حساب کے لیے زیادہ دیر نہ رکنا پڑے۔ اس مضمون کو ایک شاعر نے اچھے پیرائے میں ادا کیا ہے ؎

واذا ماھممت بالنطق فی الباطل
فاجعل مکانہ تسبیحا

(جب تو زبان سے کوئی باطل بات کہنے کا قصد کرے۔ تو اس باطل سے زبان کو روک اور اس کی جگہ خدا کی تسبیح کر)۔

پیٹ کی حفاظت:

تیسرا عضو جس کی حفاظت اور نگہداشت ضروری ہے وہ پیٹ ہے۔ اس کی نگہداشت اس واسطے ضروری ہے کہ بندہ دنیا میں عبادت کے لیے آیا ہے۔ اور غذا عمل کے لیے بمنزل بیج اور پانی کے ہے۔ جیسا تخم اور جس تناسب سے اسے پانی دیا جائے گا ویسا ہی بیج اُگے گا۔ اور جب تخم خراب ہو تو اس سے کھیتی اچھی نہیں ہوگی۔ بلکہ ایسے بیج سے یہ خطرہ ہے کہ شاید وہ تیری زمین ہی ہمیشہ کے لیے خراب کر دے اور آئندہ زراعت کے قابل نہ رہے۔ اسی لیے حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے:

اذا صمت فانظر علی ای شیءٍ	جب تو روزہ رکھے تو اس بات کا خیال رکھ کہ کس
تفطر وعند من تفطر طعام	چیز سے اسے افطار کرتا ہے اور کس کے پاس افطار

ومن ياكل اكلة من اهل ياكل اكلة فيتنقلب قلبه عما كان عليه فلا يعود الى حاله ابدا وكم من اكلة حرمت قيام ليلة و كم من نظرة منعت قراءة سورة وان العبد ليأكل اُكلةً فيحرم بها قيام سنة ۔	کرتا ہے اور کس کے کھانے سے افطار کرتا ہے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ صرف ایک خراب لقمے سے دل کی کیفیت خراب ہو جاتی ہے اور پھر ساری عمر وہ اپنی اصلی حالت پر نہیں آ سکتا۔ اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ صرف ایک خراب لقمہ پیٹ میں جانے سے ایک سال تک نماز تہجد ادا کرنے سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔ اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ صرف ایک دفعہ بد نظر دیکھنے سے بندہ ایک عرصہ تک تلاوت قرآن پاک سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس لیے اے عزیز! اگر تو اصلاح قلب اور توفیق عبادت چاہتا ہے تو تجھ پر لازم ہے کہ اپنی غذا کے بارے میں سخت احتیاط کرے۔ یہ اصل غذا کے متعلق حکم ہے پھر اس میں درجۂ استحباب نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تو غذا اُٹھانے والا ٹٹو بن جائے گا اور ابن الوقت ہو جائے گا کیونکہ ہمیں یقین ہے بلکہ ہم نے کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ پیٹ بھر کر کھانے سے عبادت قطعاً نہیں ہو سکتی۔ اور اگر نفس کو مجبور کرکے اور حیلے بہانے سے عبادت کی طرف لگایا بھی جائے تو ایسی عبادت میں بالکل لذت و حلاوت نہیں ہوتی۔ اسی لیے بعض صالحین نے فرمایا ہے:

لا تطمع في حلاوة العبادة مع كثرة الاكل واي نور في نفس بلا عبادة وفي عبادة بلا لذة وحلاوة ۔	اگر تو پیٹ بھر کے کھانے کا عادی ہے تو حلاوت عبادت کی امید نہ رکھ۔ اور دل میں بغیر عبادت نور کیسے آ سکتا ہے یا اس عبادت سے بھی کیسے نور آ سکتا ہے جو بے لذت اور بے ذوق ہو۔

اسی لیے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ میں کوہ لبنان میں بہت سے اولیاء کی صحبت میں رہا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک مجھے یہی وصیت کیا کرتا تھا کہ "اے ابراہیم! جب تو اہل دنیا کے پاس جائے تو ان کو ان چار باتوں کی نصیحت کرنا:

(۱) جو پیٹ بھر کر کھائے گا اسے عبادت میں لذت نصیب نہیں ہوگی۔

(۲) جو زیادہ سوئے گا اس کی عمر میں برکت نہیں ہوگی۔

(۳) جو لوگوں کی خوشنودی چاہے وہ اللہ کی خوشنودی سے ناامید ہو جائے۔

(۴) جو غیبت اور فضول گوئی زیادہ کرے گا وہ دینِ اسلام پر نہیں مرے گا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ تمام نیکیاں انہی چار باتوں میں بند ہیں:

(۱) شکم کو خالی رکھنا (۲) خاموشی (۳) مخلوق سے کنارہ کشی اور (۴) شب بیداری۔

بعض صالحین نے فرمایا ہے کہ:

الجوع راس مالنا۔ بھوک ہمارا سرمایہ ہے۔

اس قول کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں جو فراغت، سلامتی، عبادت، حلاوت، علم اور عمل نافع وغیرہ نصیب ہوتا ہے وہ سب بھوک کے سبب اور صبر کی برکت سے ہوتا ہے۔

دل کی حفاظت:

چوتھا عضو جس کی حفاظت اور نگہداشت از حد ضروری ہے وہ دل ہے کیونکہ یہ تمام جسم کا اصل ہے چنانچہ اگر تیرا دل خراب ہو تو تیرے تمام اعضاء خراب ہوں گے۔ اور اگر تو اس کی اصلاح کرے تو باقی سب اعضاء کی اصلاح ہو جائے گی کیونکہ دل درخت کے تنے کی مانند ہے اور باقی اعضا شاخوں کی طرح۔ اور شاخوں کی اصلاح یا خرابی درخت کے تنے پر موقوف ہے۔ تو اگر تیری آنکھ، زبان، پیٹ وغیرہ درست ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا دل درست اور اصلاح یافتہ ہے۔ اور اگر آنکھ، زبان، شکم وغیرہ گناہوں کی طرف راغب ہوں تو سمجھ لے کہ تیرا دل خراب ہے۔

پھر تجھے یقین کرنا چاہیے کہ دل کا فساد زیادہ اور سنگین ہے۔ اس لیے اصلاح قلب کی طرف پوری توجہ دے تاکہ تمام اعضاء کی اصلاح ہو جائے اور تاکہ تو روحانی راحت محسوس کرے۔

پھر قلب کی اصلاح نہایت مشکل اور دشوار ہے کیونکہ اس کی خرابی خطرات و وساوس پر مبنی ہے جن کا پیدا ہونا بندے کے اختیار میں نہیں۔ اس لیے اس کی اصلاح میں پوری ہوشیاری بیداری اور بہت زیادہ جد و جہد کی ضرورت ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر اصحاب مجاہدہ و ریاضت اصلاح قلب کو زیادہ دشوار خیال کرتے ہیں۔ اور ارباب بصیرت اس کی اصلاح کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں چنانچہ حضرت بایزید

بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

عالجت قلبی عشرًا. ولسانی	میں نے اپنے دل، زبان اور نفس کی اصلاح پر
عشرًا ونفسی عشرًا فکان قلبی	دس دس برس صرف کیے۔ ان میں دل کی اصلاح
اصعب الثلاثۃ۔	مجھے سب سے زیادہ دشوار معلوم ہوئی۔

پھر اصلاح قلب کے سلسلے میں چار امور جو ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں یعنی لمبی امیدوں، اعمال میں جلد بازی، حسد اور تکبر سے بچنا اور احتراز کرنا لازم ہے۔

اس مقام پر ان چار امور سے اجتناب کرنے کی تخصیص ہم نے اس لیے کی ہے کہ اگرچہ عام لوگ بھی ان امور میں مبتلا ہیں، مگر عبادت گزار لوگ خاص طور پر ان میں مبتلا ہیں۔ اس لیے یہ چار امور زیادہ قبیح اور بُرے ہیں۔ ایسا عام ہوتا ہے کہ عبادت کرنے والا کسی لمبی امید میں مبتلا رہتا ہے اور وہ اسے ایک اچھی نیت خیال کر رہا ہوتا ہے۔ اور آخر الامر وہ اس کے باعث عمل میں سستی اور کاہلی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بلند رتبہ حاصل کرنے میں جلد بازی سے کام لیتا ہے۔ اور جلد حاصل نہ ہونے کے باعث ہمیشہ کے لیے اس کا دل سرد پڑ جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ کسی بزرگ سے دعا کراتا ہے۔ مگر جلد قبول نہ ہونے کے باعث اس سے بھی ملول ہوتا ہے۔ یا بعض دفعہ کسی کے حق میں بد دعا کرتا ہے اور بعد میں پشیمان ہوتا ہے۔ اور بعض دفعہ اپنے ہم عمروں سے مال اولاد وغیرہ پر حسد کرتا ہے۔ اور بعض اوقات آفتِ حسد میں گرفتار ہو کر ایسے ایسے قبیح اور برے افعال کر گزرتا ہے جن کے کرنے کی ایک فاسق و فاجر آدمی کو بھی جرأت نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

"مجھے اپنی جان کے متعلق سب سے زیادہ خطرہ علماء اور عبادت گزار لوگوں سے ہے"۔

لوگوں نے آپ کی اس بات کو بُرا منایا تو آپ نے جواب دیا "یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی بلکہ یہ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے"

اور حضرت عطاء سے مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجھے کہا۔ عبادت گزار لوگوں سے خطرے میں رہو۔ اور ان کی طرح مجھ سے بھی خطرے میں رہو۔ کیونکہ بسا اوقات میں ایک انار کے متعلق کہوں گا یہ میٹھا ہے۔ دوسرا کہے گا نہیں یہ ترش ہے۔ اسی معمولی بات سے ہمارا

تکرار بڑھ جائے گا۔ اور کوئی بعید نہیں کہ ایک دوسرے کے قتل تک نوبت پہنچ جائے۔

اور حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میں عبادت گزار لوگوں کی گواہی دوسروں کے حق میں تو قبول کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ان کے اپنے اندر ایک دوسرے کے متعلق ان کی شہادت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے انہیں ایک دوسرے کے متعلق حسد سے بھرا ہوا پایا ہے۔

مذکور ہے کہ حضرت فضیل رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنے لڑکے کو فرمایا کہ مجھے عبادت گزار اور رسمی صوفیوں سے دور کوئی مکان خرید دے۔ کیونکہ مجھے اس قوم میں رہنے سے کیا فائدہ جو میری لغزش دیکھ کر اس کا چرچا کریں، اور مجھے آرام و آسائش میں دیکھ کر حسد کریں"۔

تم نے خود بھی دیکھا ہو گا کہ خشک عابد اور رسمی صوفی تکبر سے پیش آتے ہیں۔ دوسروں کو حقیر خیال کرتے ہیں۔ تکبر کی وجہ سے اپنے رخسارے کو ٹیڑھا رکھتے ہیں اور لوگوں سے منہ بسورے رکھتے ہیں۔ گویا کہ دو رکعت نماز زیادہ پڑھ کر لوگوں پر احسان کرتے ہیں۔ یا شاید انہیں دوزخ سے نجات اور جنت کے داخلے کا سرٹیفکیٹ مل چکا ہے۔ یا ان کو یقین ہو چکا ہے کہ صرف ہم ہی نیک بخت ہیں، باقی سب لوگ بدبخت اور شقی ہیں۔ پھر وہ ان تمام برائیوں کے ہوتے ہوئے لباس عاجز اور متواضع لوگوں جیسا پہنتے ہیں جیسے صوف وغیرہ۔ اور بناوٹ سے خموشی اور کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسے لباس اور خموشی وغیرہ کا تکبر اور غرور سے کیا تعلق۔ بلکہ یہ چیزیں تو تکبر اور غرور کے منافی ہیں۔ لیکن ان اندھوں کو سمجھ نہیں۔

مذکور ہے کہ ایک دفعہ فرقد سنجی حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا۔ وہ اس وقت ایک درویشانہ گودڑی پہنے ہوئے تھا اور حضرت نیا جوڑا پہنے ہوئے تھے۔ وہ بار بار حضرت حسن کے کپڑوں کو دیکھتا تھا اور ہاتھ لگاتا تھا۔ آپ نے فرمایا تو بار بار میرے لباس کو کیا دیکھتا ہے سُن لے! میرا لباس اہلِ جنت کا لباس ہے اور تیرا لباس دوزخیوں کا لباس ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا مجھ تک بات پہنچی ہے کہ اکثر اہلِ دوزخ گودڑی پہنے ہوں گے۔ پھر حضرت حسن نے فرمایا ان لوگوں نے کپڑوں میں تو زُہد اختیار کیا ہے مگر سینوں میں تکبر اور غرور کو جگہ دے رکھی ہے۔ قسم خدا کی، خوش پوش مگر صاف دل لوگ رسمی گودڑی پہننے والوں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

(۱) تصوف فاذ هو بالصوف جهلا	وبعض الناس يلبسه مجانه
(۲) يريك مهانة ويريك كبرا	وليس الكبر من شكل المهانه
(۳) تصوف كي يقال له امين	وما معنى تصوفه الا مانه
(۴) ولم يرد الاله به ولكن	اراد به الطريق الى الخيانه

ترجمہ۔ (۱) بعض لوگ صوفیوں کا سا لباس پہنتے ہیں اور از راہِ جہالت دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو فضول ہی صوف کا لباس پہنتے ہیں۔

(۲) ایسے جاہل صوفی دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو کمزور وناتواں ظاہر کرتے ہیں اور دوسروں کو تکبر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ عاجزی کرنے والوں میں تکبر نہیں ہوتا۔

(۳) ایسے صوفی یہ لباس صرف اس غرض سے پہنتے ہیں تاکہ عوام انھیں امین اور نیک خیال کریں۔ مگر درحقیقت ان کی اس صوفیائی کا مقصد نیکی اور شرافت نہیں ہوتا۔

(۴) درویشانہ لباس سے انہیں خوشنودی خدا مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس طرح عوام کو دھوکا دہی اور ان کے ساتھ خیانت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

تو اے عزیز! تو ان چار مُہلکات سے بچ۔ خاصکر تکبر سے۔ اس لیے کہ دوسری تین آفتیں تو ایسی آفتیں ہیں جن سے تو صرف گناہ اور نافرمانی میں مبتلا ہوگا۔ مگر تکبر ایسا خطرناک مرض ہے جو بسا اوقات انسان کو کفر اور گمراہی تک پہنچا دیتا ہے۔

تکبر کے سلسلے میں تو ابلیس اور اس کی گمراہی کو ہرگز نہ بھول۔ اس کی گمراہی کا آغاز اسی سے ہوا کہ اس نے تکبر کیا اور خدا کے حکم کا انکار کیا ——— اور اللہ ہی کی درگاہ بے کس پناہ میں دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں اپنے فضل سے ہر گمراہی اور لغزش سے بچائے۔

فصل

خلاصہ یہ کہ جب تو عقل و دانش سے دیکھے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا فانی ہے اور اس میں مشغول ہونے کا نقصان نفع سے زیادہ ہے۔ اور دنیا میں پیش آنے والی پریشانیاں اس کی راحت سے زیادہ ہیں۔ جیسے جسمانی تھکن، دل کا امورِ دنیا میں گرفتار رہنا۔ اور پھر آخرت میں ہر ہر چیز کا حساب۔

اور ایسا دردناک عذاب جس کے برداشت کی تجھ میں ہرگز طاقت نہیں۔

تو جب تجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ دنیا اور سامانِ دنیا میں خسارہ ہی خسارہ ہے، تو تجھ پر لازم ہے کہ اس کی چیزیں صرف اسی قدر استعمال میں لائے جس سے خدا تعالیٰ کی عبادت بجا لاتا رہے۔ اور نعمتیں اور لذتیں حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنت کا انتظار کرتا رہے جہاں خداوند تعالیٰ کا قرب بھی حاصل ہو گا۔

اور جب تجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مخلوق میں وفاداری نہیں اور اس کی طرف سے امداد و اعانت کے بجائے تکلیف اور دُکھ زیادہ پہنچتا ہے۔ تو تجھے چاہیے کہ لوگوں سے سوائے سخت ضرورت کے میل جول نہ کرے۔ نیک باتوں میں ان سے نفع حاصل کر مگر نقصان دہ چیزوں میں ان سے اجتناب کر۔ اور اس خدا سے دوستی لگا جس کی دوستی ہر قسم کے خسارے سے پاک ہے۔ اور اس خدا کی طاعت کر جس کی طاعت سے تجھے پشیمانی نہیں ہو گی۔ اور اس کی کتاب مقدس کو اپنی مشعل راہ بنا لے۔ اور اس کے احکام کو پوری پابندی سے بجا لاتا رہ۔ ایسا کرنے سے ضرور وہ تیری ہر حال میں دستگیری کرے گا۔ تجھ پر تیرے وہم و گمان سے زیادہ انعام و اکرام کی بارش کرے گا۔ اور دنیا و آخرت میں ہر مشکل وقت تیری فریاد رسی کرے گا۔ جیسا کہ نبی کریم رؤف و رحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشادِ گرامی ہے:

احفظ اللہ تجدہ تجاھک — ہمیشہ خدا کی ہی یاد میں مستغرق رہ تاکہ جدھر تو متوجہ ہو اُدھر ہی تجھے اس کے جلوے نظر آئیں۔

اور جبکہ تجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ شیطان خبیث ہے اور تیری عداوت پر ہر وقت کمربستہ ہے تو اس لعین کتے سے بچنے کے لیے ہر وقت خدا سے پناہ مانگتا رہ، اور کسی وقت بھی اس کی مکاریوں اور عیاریوں سے غافل نہ ہو۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے ذکر سے اس کتے کو بھگا دے۔ جب تو مردانِ خدا سا عزم و یقین اپنے اندر پیدا کرے گا تو بفضل خدا اس لعین کے داؤ تجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ — بیشک شیطان کا کوئی بس کامل بندوں اور رب تعالیٰ پر توکل کرنے والوں پر نہیں چل سکتا۔

ابو حازم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ دنیا کی حقیقت تو یہ ہے کہ جو گزر گئی

وہ گویا ایک خواب تھا، اور جو باقی ہے وہ نفسانی خواہشات میں صرف ہو رہی ہے۔ اور شیطان کی حقیقت یہ ہے کہ جب تک وہ خدا کا مطیع رہا تو اس سے خدا کا نفع نہ ہوا۔ اور جب نافرمان ہوا تو اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

اور جب تو نے جان لیا کہ یہ نفس انتہائی نادان ہے اور نقصان دہ و ہلاک کن چیزوں پر فریفتہ ہے اور تو نے عقلمند اور نتائج پر نظر رکھنے والے علماء کی طرح نفس کے حالات پر غور کیا۔ ان لوگوں کی طرح اس کی خاطر تواضع نہ کی۔ جو جاہل ہیں اور صرف زمانۂ حال پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ اس کے امراض اور عیوب کو نہیں دیکھتے، اور زہد و تقویٰ کی کڑوی دوا سے بھاگتے ہیں۔ تو جب تو نے نفس کو تقویٰ کی لگام دے دی۔ اس طرح کہ فضول چیزوں سے اسے روکا۔ جیسے فضول کلام، ناجائز نظر، ضرورت سے زائد طعام، اور اسے اُن قبیح چیزوں سے روکا جن میں یہ گرفتار ہے۔ جیسے لمبی اُمیدیں، جلد بازی، مسلمان کے ساتھ حسد، تکبر اور شہوت و حرص کے طور پر کھانا، اور صرف وہی چیزیں اُسے دیں جو ضروری ہیں۔ بے کار باتوں سے اسے بچایا۔ کیونکہ جب انسان زہد و تقویٰ کی زندگی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کی طرح اس انسان کو بھی اپنی رحمت اور اپنے فضل سے اس کے ایمان کو نقصان پہنچانے والی چیز سے محفوظ کر لیتا ہے۔ جب خدا زہد و تقویٰ اختیار کرنے سے انسان کے کاموں کا خود کفیل بن جاتا ہے۔ تو فضول اور بے کار چیزوں میں مشغول ہونے کی کیا حاجت ہے۔

بعض صالحین نے فرمایا ہے میرے لیے تقویٰ آسان ہے۔ کیونکہ جب مجھے کسی چیز کے جائز ناجائز ہونے میں شک ہوتا ہے تو میں اسے ترک کر دیتا ہوں۔ کیونکہ میرا نفس میرا مطیع ہو چکا ہے۔ اور جو عادت میں اسے ڈالوں وہ اس کا عادی بن جاتا ہے اور بے شک نفس کی حالت یہی ہے جو ایک عربی شاعر نے اس شعر میں بیان کی ہے

فالنفس راغبة اذا رغبتها

واذا ترد الی قلیل تقنع!

(ترجمہ) نفس کو جب تو کسی طرف راغب کرے تو راغب ہو جاتا ہے۔ اور جب تھوڑی شے پر کفایت کرنے کا اسے عادی بنائے تو وہ اسی پر صابر ہو جاتا ہے۔

ایک اور شخص نے کہا ہے:

ھی النفس ما حملتہا تتحمل۔ اس نفس کو تو جس چیز کا عادی بنائے گا وہ اسی کا عادی بن جائے گا۔

ایک شاعر نے یوں کہا ہے ؎

(۱) صبرت عن اللذات حتی تولت والزمت نفسی صبرھا فاستمرت

(۲) وما النفس الا حیث یجعلہا الفتیٰ فان اطعمت تاقت والا تسلت

(ترجمہ) (۱) میں نے دُنیوی لذتوں سے اپنے آپ کو روکا، یہاں تک کہ وہ مجھ سے علیحدہ ہوگئیں اور میں نے نفس کو صبر کا عادی بنایا تو وہ اس کا عادی بن گیا۔

(۲) نفس وہی حالت اختیار کرتا ہے جس پر انسان اسے رکھے۔ اگر اسے خوب کھلایا جائے تو اس کی شہوتیں جوش میں آتی ہیں۔ اور اگر بقدر کفایت اسے غذا دی جائے تو اسی پر مطمئن ہو جاتا ہے۔

تو جب تجھے وہ تمام باتیں معلوم ہوگئیں، اور تو ان کا عامل بھی بن گیا جو ہم نے بیان کی ہیں، تو بے شک تو زاہدوں میں شامل ہوگیا۔ اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے والے لوگوں میں سے ہوگیا۔

اے عزیز! تو جان لے، جس پر زاہد کا لفظ بولنا درست ہوگیا۔ گویا وہ ہزار اچھی صفتوں سے متصف ہوگیا۔ اسی طرح جب تو زاہدوں میں شامل ہوگیا۔ تو تو بھی مخلوق سے کنارہ کشی کرنے والے اور رب سے رشتہ محبت جوڑنے والے اور اس کی سچی طاعت کرنے والے لوگوں میں شامل ہوگیا۔ اور تو بھی ان لوگوں میں سے ہو جائے گا جن کی صفت ایک عربی شاعر نے مندرجہ ذیل اشعار میں کی ہے:

(۱) تشاغل قوم بدنیاھم وقوم تخلوا لمولاھم

(۲) فالزمھم باب مرضاتہٖ وعن سائر الخلق اغناھم

(۳) یصفون باللیل اقدامھم وعین المھیمن ترعاھم

(۴) فطوبیٰ لہم ثم طوبیٰ لھم اذا بالتحیۃ حیاھم

(ترجمہ) (۱) ایک قوم وہ ہے جو دنیوی عیش و عشرت میں محو ہے۔ اور ایک وہ خالص بندے ہیں جو سب سے علیحدہ ہو کر صرف اپنے مولیٰ کے ہو گئے ہیں۔

(۲) خدا نے اپنے فضل سے انہیں اپنے آستانہ رضا پر جگہ دے دی ہے۔ اور تمام مخلوق

سے انہیں بے پرواہ کر دیا ہے۔

(۳) رات کو صفیں بنائے اپنے مولیٰ کے دربار میں عبادت کی حالت میں کھڑے رہتے ہیں، اور رب تعالیٰ کی نظر عنایت ان کی نگہبانی کرتی رہتی ہے۔

(۴) انہیں اس وقت کی مبارک ہو۔ جب ان کا مولیٰ انہیں اپنے انعام واکرام سے نوازے گا۔

تو جب تو ہمارے بیان کردہ زہد و تقویٰ کے تمام مقتضیات پر پوری طرح عمل پیرا ہو جائے گا تو تو خدا کی راہ میں نفس سے جہاد کرنے والے زاہدین اور خدا کے ان خاص بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی صفت میں رب تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ۔ اے ابلیس! میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چل سکتا۔

اور اب تیرا ان پرہیز گار لوگوں میں نام درج ہو جائے گا جن کو سعادت دارین حاصل ہے اور اب تو بہت سے ملائکہ مقربین سے بھی افضل واعلیٰ ہو جائے گا۔ کیونکہ ملائکہ شہوات اور نفس خبیث سے پاک ہیں (اس لیے ان کا گناہوں سے بچے رہنا زیادہ کمال نہیں)۔

اور جب تو ہماری بیان کردہ ہدایات کا عامل ہو گیا۔ تو تو نے یہ تیسری لمبی اور مشکل گھاٹی بھی عبور کر لی اور تو تمام رکاوٹوں سے آگے نکل کر اپنے اصل مقصود کے قریب ہو گیا۔ اور جب خدا تعالیٰ کی امداد واعانت شامل حال ہو تو پھر کوئی مشکل مشکل نہیں۔

ہم خدا ہی سے سوال کرتے ہیں۔ وہ بہتر حلّ المشکلات ہے۔ کہ وہ ہمیں اور تمہیں اپنی مدد اور توفیق کے قلعے میں محفوظ کرلے کیونکہ درحقیقت وہی کافی المہمات ہے۔ اور ہر مشکل میں درحقیقت اسی سے امداد طلب کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہی ہر شے کا خالق ہے، اور اسی کے دست قدرت میں حقیقۃً اختیار ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اس تیسرے باب میں جو ضروری امور ہم نے بیان کرنے تھے وہ یہی تھے ——— وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

چوتھا باب چوتھی گھاٹی میں

اور یہ گھاٹی "عَقَبَۃُ العَوَارِض" کے نام سے موسُوم ہے

پھر اے طالب عبادت! (تجھے اللہ تعالیٰ توفیق دے) ان عوارض سے بچنا اور ان کے راستے بند کرنا بھی تجھ پر لازم اور ضروری ہے۔ تاکہ تجھے اصل مقصود سے نہ روکیں ــــ اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ عوارض چار ہیں۔

اوّل عارضہ رزق، اور نفس کا رزق کے متعلق مطالبہ:

اس عارضے سے نجات کی یہ صورت ہے کہ تو رزق کے بارے میں خدائے تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرے ــــ یہ توکّل دو وجہ سے لازم اور ضروری ہے:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تاکہ تو عبادت کے واسطے فارغ ہو سکے، اور کما حقہ نیک کام کر سکے۔ اس لیے کہ جو شخص رزق کے بارے میں خدا تعالیٰ پر متوکل نہ ہو وہ ضرور خدا تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر تلاش روزی، معاشی حاجات اور مصالح رزق میں مشغول ہوگا ــــ یا تو ظاہری جسم سے مشغول ہوگا، یا خیالات کے طور پر۔

ظاہری جسم کے اعتبار سے تو اس طرح ــ کہ تلاش روزی میں مارا مارا پھرے گا، اور بدن سے محنت مزدوری کر کے کمانے کی کوشش کرے گا ــ جیسے عام لوگوں کا حال ہے۔

اور خیالات کے طور پر اس طرح ــ کہ تلاش رزق کی تدبیریں سوچے گا۔ طرح طرح کے ارادے کرے گا۔ اور مختلف نوعیتوں کے وسوسے اس کے دل میں آئیں گے ــ جیسے وہ لوگ جو رزق کی تدبیر سوچنے میں گرفتار ہیں۔

اور عبادت کما حقہ اس وقت ہو سکتی ہے جب دل اور بدن پوری طرح اس کے لیے فارغ ہوں۔ اور ایسی فراغت صرف متوکلین کو ہی میسر آ سکتی ہے۔ بلکہ میں کتا ہوں کہ بہت سے ضعیف الاعتقاد

لوگ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک انھیں رزق یا کچھ روپیہ پیسہ ہاتھ نہ آجائے ۔ تو ایسے ضعیف الاعتقاد لوگ دنیا و آخرت میں اپنے اصل مقصود سے رہ جاتے ہیں ۔ میں نے بارہا اپنے شیخ ابو محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سنا کہ آپ فرمایا کرتے تھے:

"جہان میں دو شخص ہی کامیاب ہوتے ہیں ۔ ایک باجرأت آدمی، اور دوسرا متوکل"۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ایک جامع فقرہ ہے ۔ کیونکہ باجرأت شخص اپنی قوت ارادی اور جرأت قلب سے جس کام کا ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے، اور کوئی چیز اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی ۔ اور متوکل شخص اس لیے کامیاب ہے کہ وہ وعدۂ خداوندی پر اپنی بصیرت اور یقین کامل سے اعتماد رکھتا ہے اور ہر کام کرتے وقت اسے خدائے تعالیٰ پر کامل بھروسہ ہوتا ہے ۔ وہ اپنا ارادہ پورا کرنے میں کسی انسان سے نہیں ڈرتا ۔ اور نہ شیطانی وسوسے اس کے لیے رکاوٹ بن سکتے ہیں ۔ اس لیے وہ اپنے مقاصد و مطالب میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔

لیکن ضعیف الطبع اور ضعیف الاعتقاد آدمی ہمیشہ خدا تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرنے میں متردد رہتا ہے، اور ہمیشہ اس کے دماغ میں فتور اور طبیعت پر پریشانی مسلط رہتی ہے ۔ اور بندھے ہوئے گدھے یا قفس میں بند پرندے کی طرح منتظر رہتا ہے ۔ اسی پراگندہ خیالی میں اس کی عمر گزر جاتی ہے ۔ ایسا شخص کوئی بڑا قابلِ ستائش اور معزز کام نہیں کر سکتا ۔ اگر کبھی کرنے کا ارادہ بھی کرے تو اس میں ناکام رہتا ہے اور اسے پورا نہیں کر سکتا ۔ تم دیکھتے نہیں کہ دُنیوی بلند مراتب حاصل کرنے والے بھی بڑی پوسٹ اور بلند رتبہ اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی جان، اپنے مال اور اپنے اہل و عیال سے توجہ ہٹا کر اپنے مقصد کی طرف متوجہ نہ ہوں ۔

مثلاً وہ لوگ جو کسی خطۂ زمین کے بادشاہ بنتے ہیں انہیں اس کے لیے جنگ و جدال کرنے پڑتے ہیں دشمنوں کو کچلنا پڑتا ہے یعنی یا تو دشمنوں کو ہلاک کرنا پڑتا ہے یا اپنا مطیع بنانا پڑتا ہے، تب جا کر وہ بادشاہ بنتے ہیں ۔ یا اقتدار حاصل کرتے ہیں ۔

منقول ہے کہ جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگ صفین کے دن اپنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صفوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے دیکھا تو فرمایا "جو بڑی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے بڑی بڑی مشکلات پیش آتی ہیں"۔

اور تاجر لوگ خشکی اور تری کے نہایت خطرناک سفر اختیار کرتے ہیں۔ اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک لے جاتے ہیں۔ اور دلوں کو نفع یا نقصان پر قائم کرتے ہیں۔ تب جا کر بڑے منافع، بہت مال اور بڑی بڑی اعلیٰ اور قیمتی اشیاء کے مالک بنتے ہیں۔

باقی رہے چھوٹے درجے کے عام دوکاندار، جو دل کے کمزور اور عزم کے کچے ہیں، وہ اتنی جرأت نہیں کرتے کہ دور دراز کے سفر اختیار کریں۔ بلکہ حقیر مال کے ساتھ ہی دل لگائے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ساری عمر مکان سے دوکان تک اور دوکان سے مکان تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ بادشاہوں جیسے بڑے مرتبے پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور نہ ہی وہ بڑے تاجروں کی طرح کافی سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کو شام کو اگر ایک درہم ہی نفع ہو تو اسے کافی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اتنے قلیل نفع پر اس لیے خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی ہمت اور وسعتِ نظر ہی اتنی ہوتی ہے۔ یہ تو دنیا اور اہلِ دنیا کا حال ہے۔ لیکن وہ مقدس لوگ جو آخرت کی نجات چاہتے ہیں ان کا اصل سرمایہ یہی توکل اور دل کو خدا کے سوا دوسری چیزوں سے ہٹا لینا ہے۔

جب یہ لوگ توکل کی صفت کما حقہٗ اپنے اندر حاصل کر لیتے ہیں اور اس پر مضبوطی سے قائم ہو جاتے ہیں تو وہ خدا کی عبادت میں ہر چیز سے فارغ ہو کر مشغول ہو جاتے ہیں۔ خلق سے کنارہ کشی کو اپنا دستور بنا لیتے ہیں۔ لق و دق صحراؤں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور خطرناک گھاٹیوں میں زندگی بسر کرنا ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ تو ایسے لوگ سب سے طاقتور اور باہمت ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہی باہمت لوگ دین کے ستون، تمام سے معزز اور خدائی زمین کے بادشاہ کہلانے کے حقدار ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں، قیام کرتے ہیں۔ اور علم و عمل کی مشکل ترین منزلوں کو طے کرتے ہیں۔ کوئی چیز ان کے مقصد میں رکاوٹ یا حائل نہیں ہو سکتی ساری زمین ان کے سامنے ہوتی ہے اور ماضی، حال و مستقبل ان کے لیے ایک ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مندرجہ ذیل ارشاد میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

من سرہ ان یکون اقوی الناس	جو شخص یہ چاہے کہ سب سے قوی ہو جائے تو اسے
فلیتوکل علی اللہ۔ و من سرہ ان	چاہیے کہ اللہ پر توکل کرے۔ اور جو چاہے کہ سب

یکون اکرم الناس فلیتق اللہ ومن سرہ ان یکون اغنی الناس فلیکن بما فی ید اللہ اوثق منہ بما فی یدہ۔

باعزت ہو جائے تو اسے چاہیے کہ تقویٰ اختیار کرے۔ اور جو چاہے کہ سب لوگوں سے زیادہ دولتمند ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے پاس موجود شے سے زیادہ اس شے پر اعتماد کرے جو خدا کے دست قدرت میں ہے۔

حضرت سلیمان الخواص ؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص صدق نیت سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر توکل کرے، تو امراء اور غیر امراء سب اس کے محتاج ہو جائیں گے، اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کا مالک تمام زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک ہے۔

حضرت ابراہیم الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے ایک جنگل میں ایک خوبصورت ترین غلام دیکھا۔ تو میں نے اسے کہا، اے غلام! تو کہاں جا رہا ہے؟ اس نے جواب دیا: "مکے"۔ میں نے کہا بغیر سفر خرچ اور بغیر سواری کے؟ تو اس نے کہا "اے ضعیف الیقین، وہ ذات جو سات آسمانوں اور سات زمینوں کی محافظ ہے، اسے یہ طاقت نہیں کہ مجھے بغیر زاد اور بغیر سواری کے مکے پہنچا دے"؟ حضرت ابراہیم خواص ؒ فرماتے ہیں کہ میں جب مکہ معظمہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ غلام طواف کر رہا ہے اور یہ اشعار پڑھ رہا ہے ؎

یا نفس سیحی ابدا ولا تحبی احدًا
الا الجلیل الصمدا یا نفس موتی کمدا

(ترجمہ) اے میری جان! ہمیشہ سیر و سیاحت میں رہ اور خدا کے سوا کسی کو اپنا دوست نہ بنا۔

اور اے نفس! غم آخرت میں اپنی جان دے۔

جب اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا "اے شیخ! تو ابھی تک ضعیف الاعتقادی میں گرفتار ہے۔

حضرت ابو مطیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نہایت خوفناک جنگلوں میں بغیر خرچ کے صرف خدا کے توکل پر پھرتے رہتے ہیں اور طے کرتے رہتے ہیں۔ تو حضرت حاتم اصم ؒ نے فرمایا "میرا زاد سفر چار چیزیں ہیں۔ حضرت ابو مطیع نے پوچھا وہ کونسی ہیں؟ تو حضرت حاتم اصم ؒ نے جواب دیا:

ایکؔ یہ کہ مجھے یقین ہے کہ دنیا و آخرت خدا کی ملک ہیں۔
دوسریؔ یہ کہ تمام مخلوق خدا کی مطیع اور فرماں بردار ہے۔
تیسریؔ یہ کہ رزق اور رزق کے تمام اسباب خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔
چوتھیؔ یہ کہ خدا کی قضا تمام دنیا میں نافذ ہے۔
ایک شاعر نے بہت اچھا کہا ہے:

(۱) اری الزھاد فی روح و راحة — قلوبھم عن الدنیا مزاحه
(۲) اذا ابصرتھم ابصرت قومًا — ملوك الارض سیمتھم سماحه

(ترجمہ) (۱) میں دیکھتا ہوں کہ زاہد لوگ آرام و راحت میں ہیں۔ ان کے دل دنیا کی محبت سے ہٹ چکے ہیں۔
(۲) جب میں انہیں دیکھتا ہوں تو ایک ایسی قوم کو دیکھتا ہوں جو زمین کی بادشاہ ہے ان کی نشانی سخاوت ہے۔

توکل کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے ترک کرنے میں بڑا خطرہ اور بہت نقصان ہے۔ میں کہتا ہوں کیا خدا تعالیٰ نے پیدائش انسان کے ساتھ متصل اس کے رزق کا ذکر نہیں کیا؟ یعنی کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ — خدا نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا۔

اس سے معلوم ہُوا کہ جس طرح وہ خالق ہے، رازق بھی ہے۔ پھر صرف اسی قدر پر کفایت نہ کی، بلکہ صریح طور پر رزق کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ — بے شک اللہ ہی ہر ایک کا رازق ہے۔

پھر صرف اس وعدے پر اکتفا نہ کیا بلکہ صاف طور پر رزق کا ذمہ اپنے پر لیا اور فرمایا:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا — زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اس کا رزق خدا تعالیٰ کے ذمے ہے۔

پھر صرف ذمہ پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس پر قسم کھائی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ — تو آسمان اور زمین کے رب کی قسم، بیشک یہ

لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ؕ	حق ہے ویسی ہی زبان میں جو تم بولتے ہو۔

پھر صرف قسم پر اکتفاء نہ کیا بلکہ نہایت واضح الفاظ میں توکل کا حکم دیا اور توکل کرنے کی تنبیہ فرمائی چنانچہ فرمایا:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ	اس حی و قیوم ذات پر توکل کر جس پر فنا نہیں آسکتی۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	اور خدا ہی پر توکل کرو اگر تم سچے ایماندار ہو۔

تو جو شخص خدا کے قول پر اعتبار نہ کرے، اس کے وعدے کو کافی نہ سمجھے اور اس کے ذمہ لینے پر مطمئن نہ ہو۔ پھر اس کے وعدے، وعید اور حکم کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ تو ایسے شخص کے منحوس اور برے ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ اور ایسا شخص جن معاشی پریشانیوں میں گرفتار ہوتا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہیں۔ یہ ایک بہت سخت بات ہے جس سے عام دنیا غافل ہے۔ ایک دفعہ سرکار دوعالم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا:

کیف انت اذا لقیت بین قوم	اے ابن عمر! تیرا اس وقت کیا حال ہوگا جب تو
یُخبئون رزق سنتھم لضعف	ایسی قوم میں ہوگا جو ضعف یقین کے باعث قحط سالی
الیقین۔	کے خوف سے رزق کا ذخیرہ بنائے گی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ لعنت ہو اس قوم پر جسے خدا کی قسموں پر بھی اعتبار نہ آیا۔ جب آیت فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ الخ نازل ہوئی تو ملائکہ نے کہا ہلاکت ہو ابن آدم کے لیے کہ اس نے رب کو غصے کیا یہاں تک کہ اس نے رزق دینے پر قسم کھائی۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے:

لو عبدت اللہ عبادۃ اھل	اگر تو خدا کی اتنی عبادت کرے جتنی زمین و آسمان
السموٰت والارض لا یقبل	کی تمام مخلوق تو بھی وہ تیری عبادت قبول نہیں کریگا
منک حتی تصدقہ قیل وکیف	جب تک تو اس کی تصدیق نہ کرے۔ کسی نے سوال
تصدقہ۔ قال تکون اٰمنا بما	کیا تصدیق سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے جواب
تکفل اللہ لک من امر رزقک	دیا کہ تو اس کے مربی، رازق اور کفیل ہونے پر

وتری جسدک فارغاً لعبادتہ۔ — مطمئن ہو جائے اور جسم کو اس کی بندگی کے لیے فارغ کر دے۔

جب ہرم بن حیان کی ملاقات حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تو حضرت ہرم نے پوچھا "میں کہاں اقامت اختیار کروں"؟ تو آپ نے اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ فرمایا۔ تو حضرت ہرم نے کہا "شام میں گزراوقات کس طرح ہو گی"؟ تو آپ نے جواب دیا "افسوس ان پر جو شک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اب انہیں کوئی نصیحت فائدہ نہیں دیتی"۔

منقول ہے کہ ایک کفن چور نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ حضرت بایزید نے قبور کے متعلق اس سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا "میں نے تقریباً ہزار قبروں سے کفن چرائے لیکن سوائے دو مردوں کے باقی تمام کے منہ قبلے کی جانب سے پھرے ہوئے تھے۔ تو آپ نے فرمایا ان لوگوں کو رزق کے بارے میں خدا پر توکل نہیں تھا۔ اس لیے قبر میں ان کے چہرے قبلہ سے پھرے ہوئے تھے۔

میرے ایک دوست نے مجھ سے ذکر کیا کہ میری ایک نیک آدمی سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا "حال تو ان کا ہے جن کا ایمان محفوظ ہے۔ اور وہ صرف متوکلین ہی ہیں جن کا ایمان محفوظ ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے اور تمہارے حال کی اصلاح فرمائے۔ اور ہمارے بُرے اعمال کی سزا میں ہمیں نہ پکڑے۔ بلکہ ہمارے ساتھ روزِ حشر وہ سلوک کرے جو اس کی رحمت اور شان کے لائق ہے۔ وہ سب سے بہتر رحم و کرم کرنے والا ہے۔

سوال:

اگر تم کہو کہ توکل کی حقیقت اور اس کا حکم کیا ہے۔ اور رزق کے بارے میں کس حد تک توکل لازم و ضروری ہے؟

جواب:

تو اس سوال کا جواب سمجھنے کے لیے چار چیزوں کا سمجھنا ضروری ہے:

اوّل لفظ توکل کے معنی۔ دوم توکل کے استعمال کا مقام۔ سوم توکل کی تعریف۔ چہارم توکل پیدا کرنے کے اسباب و ذرائع۔

لفظ توکّل تفعّل کے وزن پر مصدر ہے جس کا مادہ وَکَالَۃٌ ہے۔ تو متوکل اسے کہتے ہیں جو کسی دوسرے کو بمنزل وکیل کے تصور کرے جو اس کی طرف سے اس کے کام کاج کو سرانجام دے اور جو اس کے معاملات کی درستی کا ضامن ہو اور جو بغیر تکلف اور بغیر اہتمام اس کی مشکلات کے لیے کافی ہو۔

اس لفظ کا استعمال تین مقام پر کیا جاتا ہے۔ ایک تو قسمت پر۔ قسمت پر توکل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمہاری قسمت میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اطمینان کیا جائے۔ کیونکہ اس کا حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اور شرع کی طرف سے یہ اطمینان لازم اور ضروری ہے۔

اس لفظ کے استعمال کا دوسرا مقام نصرت ہے۔ نصرت (مدد) میں توکّل کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی امداد پر اعتماد اور یقین کیا جائے۔ کیونکہ جب تم اس کے دین کی مدد اور اس کی نشرو اشاعت میں کوشش کرو گے تو وہ بھی ضرور تمہاری امداد کرے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ ۔ جب تو کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے تو خدا کی امداد پر ہی بھروسہ کر۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ۔ اگر تم خدا کے دین کی خدمت کرو گے تو وہ تمہاری امداد کرے گا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور مومنوں کی امداد کرنا ہمارا حق ہے۔

تو امداد کے سلسلے میں بھی اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق اس پر توکل و بھروسہ ضروری ہے۔

اور تیسرا مقام جہاں توکل کرنا چاہیے وہ رزق اور روزمرّہ کی حاجات ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالے اس چیز کا ضامن اور کفیل ہے جس سے تمہارا جسم قائم رہے اور جس کے ذریعہ تم اس کی عبادت پر قادر ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لو توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدوا خماصاً وتروح بطاناً۔

اگر تم خدا پر کما حقہ توکل کرتے تو وہ تمہیں پرندوں کی طرح رزق دیتا جو صبح خالی پیٹ گھونسلوں سے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کے واپس آتے ہیں۔

اور رزق کے سلسلہ میں عقلاً و شرعاً خدا پر توکل کرنا لازم ہے۔ اور رزق کے سلسلے میں ہی خدا پر توکل کرنا صوفیاء کے نزدیک عام طور پر لفظ توکل سے مراد ہوتا ہے۔ اور اس کتاب میں اسی توکل کی بحث مقصود ہے لیکن رزق کے بارے میں خدا پر توکل کرنے کے مفہوم کی اس وقت وضاحت ہو گی جب رزق کے تمام اقسام بیان کیے جائیں گے۔

تو جان لے کہ رزق چار قسم ہے:

رزق مضمون - رزق مقسوم - رزق مملوک - رزق موعود

رزق مضمون سے مراد وہ غذا اور وہ اشیاء ہیں جن سے انسان کا بدن قائم رہے تمام اسباب دنیوی مراد نہیں۔ اور یہ توکل شرعاً و عقلاً واجب ہے۔ کیونکہ جب خدا نے ہمیں اس کی خدمت و عبادت کا مکلف بنایا تو ضرور وہ ہماری ان چیزوں کا کفیل و ضامن ہو گا جن کے ذریعہ ہمارے بدن قائم رہیں اور ہم اس کی عبادت بجا لا سکیں۔ اور بعض مشائخ کرامیہ نے اپنے مسلک کے مطابق اس توکل کے متعلق اچھی گفتگو کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ خدا تعالیٰ کا بندوں کے رزق کا ضامن ہونا تین وجہ سے ضروری ہے:

ایک، اس لیے کہ ہم اس کے غلام ہیں اور وہ ہمارا آقا و مالک ہے۔ تو جس طرح غلاموں پر آقا کی خدمت و اطاعت لازم ہے، اسی طرح آقا پر لازم ہے کہ غلاموں کے رزق اور ان کی دیگر ضروری حاجات کا کفیل ہو۔

دوسرے، اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے بندوں کو رزق کا محتاج پیدا کیا ہے لیکن انہیں تلاش رزق کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں بنایا۔ کیونکہ بندے نہیں جانتے کہ ان کا رزق کون شے ہے، اور کہاں ہے، اور کب میسر آئے گا۔ اس لیے رب تعالیٰ پر لازم ہے کہ وہ ان کے رزق کا کفیل ہو اور ان کے لیے رزق

مہیا کرے۔

تیسرے، اس لیے کہ خدا نے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کی عبادت وطاعت میں مشغول رہیں۔ تو اگر وہ تلاش رزق میں سرگرداں رہیں تو وہ اس کی عبادت کے واسطے فارغ نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے بھی چاہیے کہ رب تعالیٰ ان کے رزق کا کفیل بنے: تاکہ فراغت سے وہ اس کی عبادت و طاعت بجالا سکیں۔

لیکن کرامیہ کا یہ مسلک درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ کہنا کہ بندوں کو رزق دینا خدا پر واجب ہے، غلط ہے۔ اور ایسی گفتگو اسرار ربوبیت سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے اور ہم نے علم کلام کی کتابوں میں ایسے مذہب کی نہایت مدلل طریقہ سے تردید کر دی ہے۔

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ رزق چار قسم ہے۔ اول رزق مضمون —— اس کی مختصر تشریح تم سُن چکے ہو۔

قسم دوم رزق مقسوم ہے۔ اس سے مراد وہ رزق ہے جو خدا نے بندے کی قسمت کر دیا ہوا ہے اور لوح محفوظ میں لکھ دیا ہوا ہے کہ بندہ یہ کھائے گا، یہ پیے گا، یہ پہنے گا۔ اس رزق مقسوم کی مقدار اور اس کا وقت معین ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، اور نہ اس میں تقدیم و تاخیر ہو سکتی ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الرزق مقسوم مفروغ منه ليس تقوی تقی بزائده ولا فجور فاجر بنا قصه۔	رزق روز ازل سے تقسیم کر دیا گیا ہے اور قلم قدرت اسے تحریر کر کے فارغ ہو چکا ہے۔ اب کسی پرہیزگار کی پرہیزگاری اسے زائد نہیں کر سکتی اور نہ کسی فاجر کے فسق و فجور سے وہ کم ہو سکتا ہے۔

تیسری قسم رزق مملوک ہے۔ اس سے مراد وہ رزق اور وہ مال واسباب ہے جس کا بندہ بالفعل دنیا میں مالک ہوتا ہے اور جو اس کے قبضے میں ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں یہی رزق مراد ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ	اور اس رزق سے راہ خدا میں خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔

اس آیت میں لفظ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ کے معنی ہیں مِمَّا مَلَّكْنٰكُمْ یعنی جس کا ہم نے تمہیں مالک بنایا ہے۔

چوتھی قسم رزق موعود ہے۔ اس سے مراد وہ رزق حلال ہے جس کا خدا تعالیٰ نے پرہیزگار لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ انہیں بغیر محنت و مشقت کے دیا جائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا
وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۝

اور جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور پرہیزگاری اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ راہ نکال دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں کا بندے کو گمان تک نہیں ہوتا۔

یہ ہیں رزق کی چار اقسام۔ ان میں سے قسم اوّل میں توکّل واجب ہے۔

توکّل کی تعریف:

توکّل کی تعریف میں مشائخ طریقت کا اختلاف ہے۔ عام مشائخ تو کہتے ہیں کہ صرف خدا پر بھروسہ کرنے اور مخلوق سے ہر قسم کی امیدیں منقطع کرنے کا نام توکّل ہے۔ اور بعض مشائخ کہتے ہیں کہ غیر سے تعلق منقطع کرکے دل کو صرف خدا کی حفاظت میں دینے کا نام توکّل ہے۔

اور امام ابوعمر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ خدا کے سوا ہر شے سے ترک تعلق کا نام توکل ہے اور ترکِ تعلق سے امام موصوف یہ مراد لیتے ہیں کہ بندہ اپنے بدن کے قوام اور تنگی و تکلیف کا خدا کے سوا کسی سے ذکر تک نہ کرے۔

اور میرے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ اپنی ہر تنگی اور تکلیف کا ذکر صرف خدا سے کرنے کا نام توکل ہے۔ اور مخلوق سے تنگی و تکلیف کا ذکر کرنا غیر سے تعلق رکھنا ہے۔

میرے نزدیک مشائخ کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ توکل اس کا نام ہے کہ بندے کو اس امر کا یقین ہو جائے اور اس کا دل اس پر مضبوطی سے قائم ہو جائے کہ میرے جسم اور ڈھانچے کو باقی رکھنا، میری حاجات کو پورا کرنا اور ہر تنگی و تکلیف سے بچانا صرف خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں۔ اور نہ ہی اسباب و وسائل دنیا کے سبب سے ہے۔ خدا اگر چاہے تو میرے جسم کی بقا اور دیگر

حاجات کے لیے کسی مخلوق کو وسیلہ بنا دیتا ہے یا دنیا کی کسی اور شے کو ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو بغیر ظاہری اسباب دنیا اور بغیر کسی مخلوق کے آسرے کے مجھے زندہ رکھ سکتا ہے۔ وہ اسباب و ذرائع کا محتاج نہیں۔

جب تیرا اعتقاد توکل کے اس مفہوم پر ہو جائے اور تیرا دل اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم ہو جائے۔ اور تیرا دل مخلوق اور اسباب دنیا سے بے نیاز ہو جائے تو سمجھ لے کہ کما حقہٗ تجھے وصف توکل حاصل ہو گئی۔ اور تو متوکلین میں شامل ہو گیا۔

توکل پیدا کرنے کا طریقہ:

توکل اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ بندہ رزق اور دیگر ضروریات کے متعلق خدا تعالیٰ کے ضامن اور کفیل ہونے کا تصور رکھے اور خدا کے کمال علم، اس کی کمال قدرت کا تصور کرے اور اس بات پر یقین رکھے کہ خدا تعالیٰ خلاف وعدہ، بھول، عجز اور ہر نقص سے منزہ اور پاک ہے۔ جب ہمیشہ ایسا تصور ذہن میں رکھے گا تو ضرور اسے رزق کے بارے میں رب تعالیٰ پر توکل کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔

سوال:

کیا بندے پر تلاش رزق لازم ہے یا نہیں؟

جواب:

رزق مضمون کی تلاش بندہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس سے مراد ہے جسم کی تربیت اور اس کو نشوو نما دینا۔ اور یہ خدا کا فعل ہے۔ جس طرح موت اور زندگی عطا کرنا رب تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان ان افعال پر قادر نہیں ہے جو خدا کی صفات ہیں۔

اور رزق مقسوم کی تلاش بھی انسان کو لازم نہیں۔ کیونکہ وہ تو رزق مضمون کا محتاج ہے اور رزق مضمون کا ضامن اور کفیل خدا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے:

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

تو اس سے مراد تلاش رزق نہیں بلکہ طلب علم اور طلب ثواب مراد ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ رزق مضمون

اسباب کے ساتھ وابستہ ہے۔ تو کیا اسباب کی تلاش بھی لازم ہے یا نہیں ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسباب کی تلاش بھی لازم نہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ جب رزق مقرر سبب کے ساتھ یا بغیر سبب کے مہیا کر سکتا ہے تو تلاش اسباب کی کیا حاجت ہے ؟ پھر خدا تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا ہے کہ ہم رزق کے ضامن ہیں۔ یہ قید نہیں لگائی کہ نفس رزق کے ہم ضامن ہیں اور اس کے اسباب و ذرائع فراہم کرنا بندوں کے ذمہ ہے چنانچہ فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔

اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ کرم پر ہے۔

پھر انسان وہ شے تلاش بھی کیسے کر سکتا ہے جس کی جگہ کا اسے پتہ نہ ہو کیونکہ یقین سے انسان کو یہ معلوم نہیں کہ اس ذریعہ سے رزق حاصل ہوگا۔ یا یہ شے میری غذا ہے اور اس سے میری نشوونما ہے کوئی فرد بشر یہ نہیں جانتا کہ میرا رزق یقیناً اس ذریعہ سے حاصل ہوگا۔

اس سلسلے میں تیرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء عظام رزق کے معاملے میں خدا پر توکل کرتے تھے۔ اور بہت کم ہی رزق کی تلاش کرتے تھے۔ بلکہ اپنے بدن کو خدا کی عبادت کے لیے فارغ رکھتے تھے۔ اور اس پر اتفاق ہے کہ انہوں نے تلاش رزق کو ترک کر کے خدا تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کی۔ اور نہ ہی وہ کسی حکم خداوندی کے تارک ہوئے۔ تو اس بیان سے واضح ہو گیا کہ رزق اور اسباب رزق کی تلاش کوئی ضروری نہیں۔

سوال:

تلاش سے رزق زیادہ اور تلاش نہ کرنے سے رزق کم ہوتا ہے یا نہیں ؟

جواب:

لوح محفوظ میں رزق کی مقدار اور اس کا وقت معین طور لکھا ہوا ہے۔ اور خدا کے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی تقسیم میں کوئی تغیر ہو سکتا ہے۔ اور یہی علمائے اہل سنت کے نزدیک صحیح ہے۔ صرف حاتم اور شقیق کے پیروکار اس کے خلاف ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ رزق تو تلاش و عدم تلاش سے زیادہ کم نہیں ہو سکتا مگر مال میں تلاش و عدم تلاش سے زیادتی یا کمی ہو سکتی ہے۔ اور یہ فاسد ہے۔ جس طرح رزق میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی اسی طرح مال میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دونوں کی دلیل ایک ہے۔ خدا

تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے:

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ۔ — تاکہ جو ہاتھ سے نکل گیا ہے اس پر غم نہ کرو اور جو مال تمہارے قبضہ میں آیا ہے اس پر خوشی نہ مناؤ۔

اگر تلاش سے رزق میں زیادتی ہوتی اور عدم تلاش سے کمی، تو البتہ غمی یا خوشی کا مقام ہوتا۔ کیوں کہ سستی اور لاپرواہی سے جب کوئی شے ضائع ہو جائے تو اس پر انسان غمناک ہوتا ہے۔ اور کوشش و کمربستہ ہونے سے جب کوئی شے حاصل ہو تو اس پر انسان کو فرحت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک سائل کو فرمایا:

هَاكَ لَوْ لَمْ تَاْتِهَا لَاَتَتْكَ — سُن لے، تو اگر روزی کی تلاش نہ بھی کرتا تو بھی جو تیرے مقدر میں ہے وہ تجھے مل جاتی۔

سوال:

ثواب اور عذاب بھی تو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ پھر بھی ہمیں حکم ہے کہ طلب ثواب کی جائے۔ اور جو اشیاء عذاب کا باعث بنتی ہیں ان سے اجتناب کیا جائے۔ تو کیا طلب سے ثواب زیادہ ہو سکتا ہے۔ یا عذاب کا موجب بننے والی اشیاء سے اجتناب کرنا عذاب میں کمی کا باعث بن سکتا ہے؟

جواب:

جان لے کہ خدا تعالیٰ نے طلب ثواب کا حکم قطعی اور واضح طور پر ہمیں دیا ہے۔ اور اس کے ترک کرنے پر عذاب کا ڈر سنایا ہے۔ اور خدا نے یہ ذمہ نہیں لیا کہ بندہ نیک اعمال نہ کرے تب بھی وہ اسے اچھا اجر دے گا۔ اس لیے عذاب و ثواب کی زیادتی بندے کے فعل پر مبنی ہے اور رزق و ثواب و عذاب میں فرق ہے، جو بعض علماء نے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ رزق اور موت کے متعلق لوح محفوظ میں بغیر کسی شرط و تعلیق کے ایک قطعی فیصلہ لکھا ہوا ہے۔ تم نے قرآن مجید میں دیکھا نہیں، کہ خدا نے کس طرح موت کے متعلق غیر مشروط طور پر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ — اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ کرم پر ہے۔

اور موت کے متعلق فرمایا:

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ٥

جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ایک ساعت آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اربعة قد فرغ منهن۔ الخَلقُ والخُلقُ والرِّزقُ والاَجَلُ۔

چار چیزوں سے فراغت ہو چکی ہوئی ہے انسان کے ڈھانچے کی بناوٹ سے، اس کی عادت و طبیعت سے۔ اس کی موت اور اس کے رزق سے

اور عذاب و ثواب کی تحریر لوح محفوظ میں بندے کے فعل کے ساتھ معلق و مشروط ہے یعنی اگر بندہ نیکی کرے گا تو ثواب پائے گا۔ اور گناہ کرے گا تو عذاب کا سزاوار ہو گا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں مذکور ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم ان کے گناہ معاف کر دیتے اور انہیں نعمت والے باغات میں داخل کرتے۔

سوال:

ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ رزق کی تلاش اور سعی کرتے ہیں ان کے پاس رزق اور مال وافر ہوتا ہے اور جو تلاش اور سعی نہیں کرتے وہ کنگال اور محتاج ہوتے ہیں۔

جواب:

ایسا نہیں، بلکہ دیکھا گیا ہے کہ بعض تلاش اور سعی کرنے والے رزق سے محروم ہوتے ہیں اور بعض تلاش نہ کرنے والے دولت مند اور با نعمت ہوتے ہیں۔ ہاں اکثر یہ ہے کہ سعی کرنے والے فقیر و قلاش نہیں ہوتے۔ اور سعی نہ کرنے والے اکثر و بیشتر فقیر ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ عزت و حکمت والے خدا کی تدبیر و تقدیر اسی طرح جاری ہے۔ ابو بکر محمد بن سابق صقلی واعظ شام نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

(۱) کم من قوی قوی فی تقلبه ! — مهذب الرای عنه الرزق منحرف

(۲) وکم ضعیف ضعیف فی تقلبه — کانه من خلیج البحر یغترف

(۳) ھٰذا دلیل علی ان الالٰہ لہ   فی الخلق سر خفی لیس ینکشف

ترجمہ (۱) بہت سے قوی لوگ جو تدبیریں بہت ہوشیار و چالاک ہوتے ہیں، رزق سے محروم ہوتے ہیں۔

(۲) اور بہت سے ضعیف البدن، تدبیریں نکمے و دنیا ان کے پاس اس طرح آتی ہے جیسے وہ سمندر کی تہ سے دونوں ہاتھوں سے ہیرے اور جواہرات نکال رہے ہیں۔

(۳) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رزق کے بارے میں مخلوق کے ساتھ خدائے تعالیٰ کا ایک مخفی تعلق ہے جسے سمجھنے سے انسانی دماغ قاصر ہے۔

سوال:

کیا کسی صحرا میں بغیر زادِ راہ کے داخل ہونا درست ہے؟ اور بغیر کسی ساز و سامان کے اسے طے کرنے کا ارادہ ٹھیک ہے؟

جواب:

جان لے کہ اگر تیرا دل توکل میں محکم ہو اور تجھے خدا کے وعدے پر مکمل یقین ہو تو تیرے لیے بے زادِ راہ صحرا نوردی درست ہے۔ ورنہ عوام کی طرح تو بھی زادِ راہ لے کر چل۔

اور میں نے امام ابوالمعالی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا کہ آپ فرماتے تھے "جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسی دستور سے پیش آئے جو اس کا لوگوں کے ساتھ ہے، تو خدا بھی اس کے ساتھ اسی طرح پیش آتا ہے جس طرح لوگ اس سے پیش آتے ہیں۔" آپ کا یہ ارشاد بہت درست ہے، اور غور کرنے والے کو اس سے بہت فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

سوال:

تمہارا یہ کہنا کہ بغیر زادِ راہ محض توکل خدا پر سفر اختیار کرنا درست ہے ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں حکم دیا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی۔   اور زادِ راہ لیکر سفر میں نکلو۔ اور بہتر زاد تقویٰ ہے۔

جواب:

اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ زاد سے مراد زادِ آخرت ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ

فرمایا خَیرُ الزَّادِ التَّقوٰی۔ نہ کہ دُنیوی اسباب اور معمولی سفر خرچ وغیرہ۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جب بعض لوگ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانے میں حج کو روانہ ہوتے تھے تو بغیر سفر خرچ روانہ ہوتے تھے۔ راستے میں لوگوں سے مانگتے تھے اور اپنی محتاجی کا شکوہ شکایت کرتے تھے۔ لوگوں کو تنگ کرتے تھے اور امراء کے ساتھ ان سے مانگتے تھے۔ تو ایسے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ زادِ راہ لے کر حج کو جائیں۔ اور انہیں تنبیہ کی گئی کہ خود کمائے ہوئے مال کے ساتھ حج کرنا ہی اصل حج ہے۔ لوگوں کے سہارے پر گھر سے نکل کھڑا ہونا اور راستے میں ہر ایک سے حج کا ذکر کر کے مانگتے پھرنا اور پھر اس ذلت و خواری کے ساتھ حج کرنا بے فائدہ ہے۔

سوال:

کیا متوکل شخص بھی سفر میں زادِ راہ لے کر چلتا ہے؟

جواب:

بسا اوقات متوکل آدمی بھی زادِ راہ اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتا ہے لیکن اس کا دل اس بات پر محکم نہیں ہوتا کہ یہی میرا رزق ہے اور سفر میں اسی پر میرا سہارا ہے، بلکہ اس کا دل خدا کے ساتھ محکم ہوتا ہے، اور اس کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور وہ دل میں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرا رزق روزِ ازل سے میرے حصے میں لکھا جا چکا ہے۔ اور فرشتے میرے حصے کا رزق لکھ کر فارغ ہو چکے ہوئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اس رزق کے ذریعہ میرے بدن کو قائم رکھے، یا سفر میں کوئی اور ذریعہ پیدا کر دے۔

اور بسا اوقات متوکل شخص اپنے ہمراہ زادِ راہ اس نیت سے بھی لے لیتا ہے کہ اس سے کسی مسلمان کی اعانت کرے گا، یا کسی اور شے کو فائدہ پہنچائے گا۔

لیکن درحقیقت زادِ راہ لے کر چلنے میں اصل چیز دل کی حالت ہے۔ تیرے دل میں یہ بات ہونی چاہیے کہ خدا نے ہر حال میں مجھے رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اور وہ میرا کفیل اور ضامن ہے۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خرچ تو لے کر چلتے ہیں، مگر ان کا توکل مکمل طور پر خدا پر ہوتا ہے نہ کہ اس خرچ پر۔ اور بہت سے ظاہراً خرچ لے کر تو نہیں چلتے لیکن ان کا دل اسی میں گرفتار ہوتا ہے، خدا پر انہیں کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ اصل بات دل کی ہے ـــــ اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔ کیونکہ یہ بہت مفید ہے۔

سوال:

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وصحابہ کرام اور سلف صالحین ہمیشہ زادِ راہ لے کر سفر کرتے تھے۔ تم کیسے کہتے ہو کہ زادِ راہ کی ضرورت نہیں؟

جواب:

ہم نے کب کہا ہے کہ سفر میں ضروری سامانِ خورد و نوش لے کر چلنا حرام ہے۔ بلکہ حرام یہ چیز ہے کہ مسافر اس حقیر سامان کو ہی اپنا سہارا سمجھے اور خدا تعالیٰ پر توکل نہ کرے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ خدا نے قرآن مجید میں آپ کو حکم دیا:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ۔ اے حبیب! تو اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھ۔

کیا آپ جو کھانا یا پانی یا درہم یا دینار سا تھ لے کر سفر اختیار کرتے تھے، تو اپنے خدا کے اس مذکورہ حکم کی نافرمانی کی؟ حاشا وکلا، آپ سے قطعاً نافرمانی صادر نہیں ہوئی۔ بلکہ درہم و دینار کے ہوتے ہوئے بھی یقیناً آپ کا دل خدا کے ساتھ تھا اور یقیناً آپ کا توکل خدا پر ہی تھا، جیسا کہ ان کے رب نے انہیں حکم دیا تھا۔ کیونکہ آپ ہی وہ بے مثل ذات ہیں جس نے دنیا کی کسی چیز کی طرف قطعاً التفات نہیں فرمایا، اور تمام زمین کے خزانوں کی چابیوں کی طرف جب کہ آپ کو پیش کی گئیں نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ بلکہ آپ کا اور سلفِ صالحین کا سفر خرچ لے کر چلنا دوسروں کی اعانت و دستگیری کی نیت سے تھا۔ اس لیے نہیں تھا کہ وہ زادِ راہ کو ہی معاذ اللہ اپنا سہارا سمجھتے تھے اور خدا پر انہیں کوئی بھروسہ نہیں تھا۔

تو معلوم ہوا کہ اصل اعتبار ارادے اور قصد کا ہے۔ اس کو خوب ذہن نشین کر اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو، اور بات کو پوری طرح ذہن میں بٹھا تا کہ خدا تجھے نیکی کی راہ دکھائے۔

سوال:

کیا زادِ راہ لے کر چلنا افضل ہے یا نہ لے کر؟

جواب:

زادِ راہ سفر میں لے کر چلنا یا نہ لے کر چلنا حالات و اشخاص کی بنا پر مختلف ہے۔ اگر ایک مقتدائے قوم زادِ راہ اس ارادے سے لے کر چلے کہ لوگوں پر اس کا جواز و اباحت روشن و واضح ہو۔ یا

سفر میں دوسرے مسلمان بھائی کی اعانت کی نیت ہو، یا کسی خستہ حال کی فریادرسی مطلوب ہو، یا اسی قسم کا کوئی اور نیک ارادہ ہو تو زادِ راہ لے کر چلنا افضل ہے۔ اور اگر کوئی شخص اکیلا سفر کو روانہ ہو، جس کا توکل خدا تعالیٰ پر قوی اور مضبوط ہو۔ اور اسے یہ خدشہ ہو کہ زادِ راہ خدا سے غافل نہ کر دے تو ایسے شخص کے لیے ترک زاد بہتر ہے ـــــ اس فرق کو اچھی طرح معلوم کر لے ـــــ خدا تجھے نیکی کی توفیق عنایت کرے۔

دُوسرا عارضہ ـــــ سفر کے خطرات کا تصوّر اور خیال

اس عارضے سے محفوظ رہنے کی صورت یہ ہے کہ تو اپنا معاملہ پورے طور پر خدائے تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ اور یہ دو وجہ سے بہتر ہے۔

ایک تو دل کو اسی وقت اطمینان اور چین نصیب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ وہ امور جو اہم ہوں اور ان کی اچھائی یا بُرائی تم پر واضح نہ ہو تو ایسے امور کی فکر میں مضطرب اور شوریدہ خاطر رہو گے۔ اور جب تم نے اپنے ہر معاملے کو خدا کے حوالے کر دیا تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ صلاح و خیر ہی نصیب ہو گی۔ تو اپنے معاملات سپردِ خدا کرنے میں تم خطرے اور ہر قسم کی تشویش سے محفوظ ہو جاؤ گے اور چین و اطمینان میسر آ جائے گا۔ اور یہ امن و راحت اور دل کا اطمینان بہت بڑی نعمت ہے۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ اکثر دفعہ مجلس میں فرمایا کرتے تھے:

دع التدبیر الی من خلقک تسترح۔	اپنی تدبیر اس ذات کے سپرد کر دے جس نے تجھے پیدا فرمایا تو راحت میں ہو جائے گا۔

میرے شیخ علیہ الرحمۃ نے مندرجہ ذیل تین اشعار بھی اسی سلسلے میں کہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

(۱) ان من کان لیس یدری فی المحبو ب نفع له او المکروہ

(۲) لحری بان یفوض ما یعجز عنه الی الذی یکفیه

(۳) للاله البر الذی هو بالراحة احنی من امه و ابیه

ترجمہ (۱) جو شخص یہ نہ جانتا ہو کہ میرا نفع میری محبوب شئی میں ہے یا اس میں جو مجھے ناپسند ہے۔

(۲) تو چاہیئے کہ اس کام کو جسے وہ حل کرنے سے عاجز ہے اُس ذات کے حوالے کرے جو ہر

(۳) حاجت میں کافی ہے یعنی خدا تعالیٰ کے سپرد کرے جو نیکوکار ہے اور اپنے ماں باپ سے

بھی زیادہ رحیم وشفیق ہے۔

تفویض الی اللہ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آئندہ بھی تم صلاح وخیر میں رہو گے۔ اور یہ اس لیے کہ معاملات وحالات، نتائج وعواقب کے اعتبار سے مبہم اور مخفی ہیں۔ کیونکہ بہت برائیاں ایسی ہیں جو صورۃ خیر معلوم ہوتی ہیں۔ اور بہت سے ایسے نقصان دہ امور ہیں جو بظاہر زیور نفع سے آراستہ دکھائی دیتے ہیں اور بہت ایسے ہیں جو دیکھنے میں شہد معلوم ہوتے ہیں اور تم اسرار وعواقب سے بے خبر ہو۔ تو جب تم کسی امر کو عزم سے اور اپنے اختیار سے شروع کرو گے تو بہت جلد ہلاکت ونباہی میں پڑ جاؤ گے اور تمہیں شعور تک نہیں ہوگا۔

حکایت:

ایک عابد کے متعلق منقول ہے کہ وہ رب تعالیٰ سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ اسے ابلیس لعین دکھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ اس خیال کو چھوڑ اور عافیت وامن کی دعا کیا کر۔ مگر وہ اپنے اسی خیال پر مصر تھا۔ آخر ایک روز اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس عابد پر ظاہر کر دیا۔ جب عابد نے ابلیس کو دیکھا تو اسے مارنے کا ارادہ کیا۔ ابلیس نے کہا اگر تو نے سو سال زندہ نہ رہنا ہوتا تو میں تجھے ہلاک کر دیتا اور تجھے سخت سزا دیتا۔ عابد اپنی عمر سو سال سن کر مغرور ہو گیا اور دل میں کہنے لگا میری عمر بہت ہے۔ ابھی آزادی سے گناہ کرتا ہوں، آخر وقت پر توبہ کر لوں گا۔ چنانچہ وہ فسق وفجور میں مبتلا ہو گیا، عبادت ترک کر دی اور ہلاک ہو گیا۔

اے مخاطب! تیرے لیے اس حکایت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ تو اپنے ارادے کی پیروی نہ کرے اور اپنے مطلوب نفسانی کے حصول میں اصرار سے کام نہ لے۔ اور اس حکایت سے تجھے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ طول اَمل سے بچے۔ کیونکہ طول اَمل عظیم ترین آفت ہے۔ ایک شاعر نے کیا اچھا کہا ہے:

وایاك المطامع والامانی

فكم امنية جلبت منيه

ترجمہ: طمع کی چیزوں اور لمبی امیدوں سے بچو۔ کیونکہ بہت امیدیں ایسی ہوتی ہیں جن کے پیچھے انسان لقمۂ موت بن جاتا ہے۔

لیکن جب تم اپنا معاملہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سپرد کر دو گے اور اس سے سوال کرو گے کہ وہ تمہارے

لیے ایسی شے کا انتخاب کرے جس میں تمہاری بہتری ہو تو ضرور تمہیں خیر اور درستی ہی نصیب ہوگی اور تم نیک کام سے ہی ہمکنار ہوگے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک صالح بندے (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کے الفاظ نقل کرتے ہوئے فرمایا:

وَأُفَوِّضُ أَمْرِيَ إِلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۔ فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۔	میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بیشک وہ بندوں کو دیکھتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی بُری چالوں سے محفوظ رکھا۔ اور فرعونیوں کو دکھ دینے والے عذاب نے آگھیرا۔

تم دیکھتے نہیں کہ رب تعالیٰ نے کس وضاحت سے اپنے معاملات اس کے حوالے کرنے پر حفاظت، دشمنوں کے خلاف امداد اور بندے کا اپنی مرادیں کامیاب ہونے کا ذکر فرمایا ہے؟ ــــــ اس میں خوب غور کرو ــــ اللہ تعالیٰ تمہیں بھلائی کی توفیق بخشے۔

سوال:

تفویض کا معنیٰ اور اس کا حکم واضح فرمایا جائے۔

جواب:

جاننا چاہیے کہ یہاں دو چیزیں ہیں جن کے سمجھ لینے سے بات واضح ہو جائے گی: ایک تو تفویض کا مقام اور اس کا حکم۔ اور دوسری تفویض کا معنیٰ اس کی تعریف اور تفویض کی ضد کا بیان۔

مقامِ تفویض کی تفصیل یہ ہے کہ مرادیں تین قسم ہیں:

ایک وہ مراد جس کو تم یقیناً اور قطعاً بُری اور خراب سمجھتے ہو۔ تمہیں اس کے بُرا ہونے میں ذرا شک نہیں ہوتا۔ جیسے جہنم اور عذاب۔ اور افعال میں کفر اور بدعت اور معصیت وغیرہ۔ ان امور مذکورہ کا ارادہ کرنے کی تو قطعاً کوئی گنجائش اور اجازت نہیں۔

دوسری وہ مراد جس کے اچھا اور بہتر ہونے کا تمہیں مکمل یقین ہے جیسے جنت، ایمان اور سنت وغیرہ۔ ان امور کا ارادہ کرنا ضروری اور لازم ہے۔ یہاں تفویض جائز نہیں۔ اس لیے کہ ان امور میں کوئی خطرہ نہیں اور نہ ہی ان کے بہتر اور اچھا ہونے میں کوئی شک وشبہ ہے۔

تیسری وہ شے ہے جس کے متعلق تم حتماً نہیں جانتے کہ اس میں تمہارے لیے بھلائی ہے یا خرابی

اور فائدہ ہے یا نقصان۔ جیسے نوافل اور مباح امور۔ ان امور کا تم یقینی اور قطعی ارادہ نہیں کر سکتے تو ایسے امور کا ارادہ کرتے وقت ان شاء اللہ ضرور کہا جائے۔ بلا ان شاء اللہ ان امور کا ارادہ درست نہیں۔ بلا ان شاء اللہ ان امور کا ارادہ مذموم ہوگا جس سے شرعاً روکا گیا ہے۔ تو اس تحقیق کی رُو سے تفویض کا مقام اور ہر وہ شے ہے جس کے اندر تمہارے لیے کوئی خطرہ ہو۔ اور تمہیں اس کے بہتر ہونے کا یقین کامل نہ ہو۔

تفویض کے معنی

ہمارے بعض مشائخ نے تفویض کے یہ معنی کیے ہیں:

هو ترك اختيار ما فيه مخاطرة	تفویض کے معنی ہیں ہر وہ شے جس میں خطرہ ہو اس میں
الى المختار المدبر العالم بمصلحة	اپنے ارادے اور اختیار کو ترک کر دینا اور مدبر کائنات
الخلق لا اله الا هو	مختار مطلق اور مخلوق کے مصالح جاننے والے اللہ
	تعالیٰ کے سپرد کر دینا

اور شیخ ابو محمد سنجری رحمۃ اللہ علیہ نے تفویض کے یہ معنی کیے ہیں:

هو ترك اختيارك المخاطرة على	تفویض تیرا خطرے کی شے میں اپنے اختیار کو ترک
المختار ليختار لك ما هو خير	کر دینا اور مختار مطلق کے حوالہ کر دینا ہے تاکہ وہ
لك۔	مختار مطلق تیرے لیے ایسی چیز پسند فرمائے جس میں
	تیری بھلائی اور بہتری ہو۔

اور شیخ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے تفویض کی یہ تعریف کی ہے:

هو ترك الطمع، والطمع هو ارادة	یعنی تفویض ترک طمع کا نام ہے۔ اور طمع ایسی شئی
الشئ المخاطر بالحكم۔	کے ارادے کا نام ہے جس میں خطرہ ہو۔

تفویض کے معنی میں یہ مشائخ کرام کی عبارات تھیں جو نقل کی گئیں۔ اور ہمارے نزدیک تفویض کے یہ معنی ہیں:

ارادة ان يحفظ الله عليك مصالحك	جن امور میں تم کو خطرہ کا خوف ہو ایسے امور میں یہ ارادہ
فيما لا تامن فيه الخطر۔	کرنا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور بہتریوں کی حفاظت

اور نگہداشت کرے' ایسے ارادے کا نام تفویض ہے۔

اور تفویض کی ضد طمع ہے۔ اور طمع دو طرح کا ہے۔ ایک وہ جو رجا کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسی شے کا ارادہ کرنا جس میں کوئی خطرہ نہ ہو۔ یا خطرہ ہو مگر ان شاء اللہ کہہ لیا جائے۔

یہ طمع جو رجاء کے معنی میں ہے' ممدوح اور غیر مذموم ہے۔ جیسا کہ پروردگار عالم جل وعلا نے طمع کو اس معنی میں قرآن مجید میں استعمال فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین۔ — اور وہ ذات جس سے مجھے امید ہے کہ روز قیامت وہ میری تمام خطائیں بخش دے گا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

انا نطمع ان یغفر لنا ربنا خطایانا — ہمیں پوری امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہماری تمام خطائیں معاف کر دے گا۔

اور ہم یہاں اس طمع محمود میں بات نہیں کرتے۔

دُوسرا طمع مذموم ہے۔ جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

ایاکم والطمع فانه فقر حاضر۔ — اپنے آپ کو طمع سے بچاؤ' کیونکہ وہ ایک بالفعل محتاجی اور تنگدستی ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ:

هلاك الدين وفساده الطمع وملاكه الورع — یعنی دین کی ہلاکت اور اس کا فساد طمع میں ہے اور دین کی حفاظت اور پختگی ورع اور تقویٰ میں ہے۔

اور ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ طمع مذموم دو چیزیں ہیں:

سکون القلب الی منفعة مشکوکة والثانی ارادة الشئی المخاطر بالحکم — ایک ایسی شے سے سکون قلب حاصل کرنا جس کا نفع مشکوک ہو۔ دوسری ایسی چیز کا ارادہ کرنا جس میں خطرہ ہو۔

اور یاد رکھو کہ طمع مذموم میں جو ارادہ پایا جاتا ہے یہی تفویض کے متضاد اور مخالف ہے۔

ان امور کا بیان جن کا تصور تفویض الی اللہ کا موجب ہے:

(۱) امور اور معاملات میں خطرہ۔

(۲) ہلاکت کا امکان۔

(۳) فساد اور خرابی کا خوف۔

(۴) انسان کا خطرے کی چیزوں سے محفوظ رہنے سے عاجز ہونا۔

(۵) انسان کی غفلت اور نادانی کے باعث خطرے کی چیزوں سے نہ بچ سکنا۔

اگر تم ان پانچ امور کو سنجیدگی سے ذہن میں حاضر کرو گے تو تمہارے دل میں خواہ مخواہ ارادہ پیدا ہو گا کہ اپنے تمام امور و معاملات احکم الحاکمین کے حوالہ کر دینے چاہییں اور بلا ان شاء اللہ تعالےٰ کہے ان کا ارادہ تعین کرنا چاہیے۔ ہاں اگر ان امور میں خیر و صلاح کا یقین کامل ہو تو پھر بلا تشویش ارادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وباللہ التوفیق۔

سوال:

تم جس خطرے کا بار بار ذکر کرتے ہو کہ اس کی وجہ سے تفویض الامور الی اللہ ضروری ہے آخر وہ خطرہ کیا ہے؟

جواب:

جان لو کہ خطرہ دو طرح کا ہے:

ایک تو خطرہ شک، کہ شاید یہ کام ہو گا یا نہیں۔ اور شاید میں اس تک پہنچ سکوں یا نہ۔ اسی خطرۂ شک کے باعث ان شاء اللہ کہنا ضروری ہے۔

دوسرا خطرہ فساد، کہ تمہیں یہ یقین نہ ہو کہ اس میں تمہارے لیے صلاح اور بہتری ہے۔ اس خطرہ کی بنا پر تفویض ضروری ہے۔

پھر خطرہ کی تعریف میں ائمۂ کرام کی عبارات مختلف ہیں۔ بعض ائمۂ کرام نے یہ تعریف کی ہے کہ "خطرہ وہ شے ہے جس کے بغیر میں نجات ہو اور اس کے کرنے سے ارتکاب گناہ کا امکان ہو۔"

اس معنی کی رُو سے ایمان، استقامت اور سنت میں کوئی خطرہ یا خدشہ نہیں کیونکہ ان کے بغیر نجات ناممکن ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ استقامۃ علی الشرع کسی ارتکاب گناہ کا باعث نہیں۔ لہٰذا ایمان استقامت اور سنت کا ارادہ یقیناً ہونا چاہیے۔

ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے خطر فی الفعل کی یہ تشریح فرمائی ہے کہ:

"خطرہ وہ شے اور وہ امر عارض ہے جسے بعض اوقات اصل فعل ترک کر کے ادا کرنا پڑے اور اس وقت اصل فعل کی بجائے اس امر عارض کو ادا کرنا زیادہ بہتر ہو۔"

خطرہ کی یہ تعریف مباحات، سنن اور فرائض کو بھی شامل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں سمجھو کہ ایک شخص کا وقت نماز تنگ ہو چکا ہو اور اس نے اسے ادا کرنے کا ارادہ کر لیا ہو عین اس وقت وہ شخص کہیں جلتی آگ یا دریا میں گر پڑا، تو ایسی صورت میں اس کا قصدِ نماز کے بجائے اپنے آپ کو بچانا ضروری اور لابدی ہے۔ اس تعریف کے مطابق جب خطرہ کا تعلق مباحات، سنن اور فرائض سے بھی ہو گیا تو ان کا بھی قطعی ارادہ کرنا درست نہیں۔ بلکہ ساتھ ان شاء اللہ کہنا چاہیے۔

سوال:

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رب تعالیٰ بندے پر ایک کام فرض کرے، اور اس کے ترک پر وعید فرمائے بلکہ اس بندے کے لیے اس فعل میں کوئی بھلائی اور بہتری نہ ہو؟

جواب:

ہمارے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ بندے پر جو چیز لازم اور فرض کرتا ہے، بندے کے لیے ضرور اس میں بھلائی اور بہتری ہوتی ہے، جبکہ وہ عوارض اور رکاوٹوں سے خالی ہو۔ ہاں اللہ تعالیٰ کسی لازم اور ضروری فعل میں اس طرح تنگی نہیں فرماتا کہ اس سے کسی اور طرف عدول نہ ہو سکے۔ اور ضرور ہر فرض اور لازم فعل میں بندے کے لیے صلاح اور بہتری مضمر ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس فرض اور لازم فعل سے عدول کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے حالات میں ایک واجب کو ترک کر کے دوسرے واجب کو اختیار کرنا بہتر اور اولیٰ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔ ایسے اسباب کے پیش آنے پر بندہ ترک فرض پر ماخوذ نہیں ہوگا، بلکہ اجر و ثواب ملے گا۔ یہ اجر و ثواب ترکِ فرض سے نہیں بلکہ دوسرا واجب ادا کرنے کی وجہ سے ہے۔

اور میں نے اپنے شیخ اور امام کو کہتے سنا ہے کہ تمام فرائض جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لازم کیے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ۔ ان میں یقیناً بندہ کے لیے صلاح اور خیر ہے۔ اس لیے ان کی بجا آوری کے ارادہ کے وقت اِن شاء اللہ کہنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کا یقیناً اور قطعاً ارادہ

ہونا چاہیے۔ اور ہمارے شیخ علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ آخر کار تمام مشائخ کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے۔ اس اعتبار سے جب فرائض و واجبات خطرہ کے حکم سے خارج ہو گئے تو صرف مباحات و نوافل ہی اس محل خطرہ میں رہے ——— ہماری یہ بحث اس باب میں مشکل ترین بحث ہے۔ وباللہ التوفیق۔

سوال:

کیا اپنے جملہ امور کو حوالہ خدا کرنے والا ہلاکت اور فساد وغیرہ امور سے مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دنیا دار المصائب والآلام ہے؟

جواب:

اغلب یہی ہے کہ ایسا شخص ان خطرات سے محفوظ رہتا ہے۔ ہاں نادر اور قلیل طور پر کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ خذلان و ابتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور درجۂ تفویض سے گر جاتا ہے شیخ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے یوں ہی فرمایا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ ایسے شخص کو ان امور میں جو اس نے حوالہ خدا کیے ہوئے ہیں بھلائی اور درستی ہی پیش آتی ہے۔ نادر طور بھی وہ ذلت و رسوائی وغیرہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ قول زیادہ پسند ہے۔ اس لیے کہ اگر تفویض کے ذریعہ مہالک اور مفاسد سے محفوظ رہنے کی امید نہ ہو تو تفویض (یعنی اپنے امور کو حوالہ خدا کرنے) سے فائدہ ہی کیا۔

سوال:

کیا خدا تعالیٰ پر واجب ہے کہ مفوض کے لیے افضل چیز ہی مہیا کرے؟

جواب:

یہ امر متفق علیہ ہے کہ باری تعالیٰ پر کسی شے کا ایجاب محال اور ناممکن ہے۔ اور بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ پر کوئی شے واجب اور لازم نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بتقاضائے حکمت ایسی چیز مقدر کر دیتا ہے جو حقیقت میں بہتر اور اصلح ہوتی ہے، مگر بظاہر بندے کی نظر میں وہ افضل اور اعلیٰ نہیں ہوتی۔ دیکھیے! نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کبار کے لیے لیلۃ التعریس میں دن چڑھ آنے تک نیند مقرر کر دی۔ یہاں تک کہ آپ کی اور صحابہ کرام کی رات کی نماز (تہجد) اور نماز فجر فوت ہو گئی۔ حالانکہ نیند کے بجائے نماز کی ادائیگی افضل اور بہتر تھی۔ اسی طرح بسا اوقات اللہ تعالیٰ

ایک بندے کے لیے دولت اور نعمت مقرر کر دیتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت فقر اس کے حق میں افضل ہوتا ہے۔

اسی طرح بسا اوقات رب تعالیٰ بندے کے لیے بیویاں اور اولاد مقدر کر دیتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس کے لیے ذکرِ الٰہی اور عبادت زیادہ بہتر اور افضل ہوتے ہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک حاذق اور خیر خواہ طبیب مریض کے لیے جَو کا پانی پسند کرتا ہے اگرچہ مریض گنے کا نچوڑ اور اس کا پانی افضل اور عمدہ خیال کرتا ہو۔ کیونکہ اس طبیب کو معلوم ہے کہ مریض کی اسی میں اصلاح ہے۔ اور بندے کا مقصود بھی تو ہلاکت سے نجات ہے۔ فساد و ہلاکت کے ساتھ محض ظاہری فضل و شرف اور اچھائی حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

سوال:

کیا مُفَوِّض (اپنے جملہ امور حوالۂ خدا کرنے والا) تفویض کے باوجود بھی مختار متصور ہوگا؟

جواب:

علمائے اہل سنت کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ تفویض سے اس کا اختیار باطل اور زائل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ مختار ہی شمار ہوگا۔

تیسرا عارضہ قضاء اور اس کے مختلف اقسام کا انسان پر وارد ہوتا ہے۔

اس کا علاج صرف یہ ہے کہ انسان قضاء الٰہی پر راضی ہو جائے۔ اس لیے تم پر دو وجہ سے قضاء الٰہی پر راضی رہنا ضروری ہے۔

اول، عبادت کے لیے فراغت۔

اور یہ فراغت یوں حاصل ہوگی کہ اگر تم قضاء الٰہی پر راضی نہ ہو تو تمہارا قلب ہمیشہ مغموم اور مشغول رہے گا کہ یہ بات اس طرح کیوں ہوئی ہے۔ اور یہ کام اس طرح کیوں ہو۔ جب اس طرح کے تفکرات میں تمہارا قلب ہر وقت مشغول رہے گا تو عبادت کے لیے فراغت کب نصیب ہوگی۔ اس لیے کہ تمہارے پہلو میں دل تو صرف ایک ہی ہے اور اسے تم نے تفکرات و وساوس سے بھر دیا ہوا ہے۔ جب تمہارے دل کے تمام گوشے دنیوی خیالات سے پُر ہوں گے تو یادِ خدا، اس کی عبادت اور فکرِ آخرت کے لیے کون سا گوشہ ہے جو خالی ہوگا۔

حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

ان حسرۃ الامور الماضیۃ و — تمہاری گزشتہ واقعات پر حسرت اور آئندہ

تدبیر الاٰتیۃ قد ذھبت ببرکۃ — کی تدبیر کے خیالات نے اس موجودہ ساعت

ساعتک ھذہٖ — کی برکت کو تباہ کر دیا ہے۔

قضاءِ الٰہی پر راضی ہونے کی دوسری وجہ:

قضاءِ الٰہی پر اظہارِ ناراضی سے غضبِ خداوندی کا خطرہ ہے۔ روایات اور اخبار میں مذکور ہے کہ کسی نبی نے اپنی کسی تکلیف کا رب تعالیٰ کے دربار میں شکوہ کیا۔ تو رب تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ کیا تو میرا شکوہ کرتا ہے؟ حالانکہ میں مذمت اور شکوہ کا مستحق نہیں ہوں۔ کیا تو ایسی نامناسب بات کا اظہار کر رہا ہے؟ تو میری قضاء پر ناراضگی کا اظہار کیوں کر رہا ہے؛ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں تیری خاطر دنیا بدل دوں، یا تیری خاطر لوح محفوظ میں تبدیلی کروں اور ایسی چیز تیرے واسطے مقدر کروں جسے تو چاہے، اگرچہ میں اس کو نہ چاہوں؟ اور ایسی چیز تیرے لیے مہیا کروں جو تجھے پسند ہو، مجھے پسند نہ ہو؟ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! اگر تیرے سینے میں آئندہ کبھی اس قسم کا خطرہ اور وسوسہ گزرا تو میں ضرور تجھ سے نبوت کا مقدس لباس اتار لوں گا۔ اور تجھے نارِ دوزخ میں ڈال دوں گا، اور مجھے کوئی پرواہ نہیں"۔

میں کہتا ہوں عقل مند شخص کو گوشِ ہوش سے سننا چاہیے کہ رب تعالیٰ کس طرح اپنے نبیوں اور برگزیدہ بندوں سے ایسی گفتگو فرما کر ڈانٹ رہا ہے۔ جب وہ اپنے برگزیدہ اور پاک بندوں کو ایسے کلمات کہہ سکتا ہے، تو غیر انبیاء کے ساتھ بطریقِ اولیٰ ایسی گفتگو کر سکتا ہے۔

پھر رب تعالیٰ کا یہ ارشاد بہت قابلِ غور ہے کہ "اگر تیرے دل میں دوبارہ اس قسم کا خیال آیا تو تیری نبوت چھین لی جائے گی"۔ جب محض ارادے اور خیال پر اس قدر سخت وعید اور ڈانٹ فرمائی تو اس شخص پر اس کے غصہ کا کیا عالم ہوگا جو بے صبری سے چیخے اور چلائے اور بار بار فریاد رسی کے لیے بلائے۔ شکوہ کرے اور رب کو اپنی تباہی اور بربادی کے لیے عام لوگوں کے سامنے پکارے صرف اکیلا نہ پکارے بلکہ اس میں اپنے ساتھی اور دوست بھی شامل کرلے۔ پھر یہ اس کو ڈانٹ ہے جس نے ساری عمر میں صرف ایک بار شکوہ کیا۔ تو جس کی ساری عمر ہی رب تعالیٰ کے شکووں اور

شکایتوں میں گزری ہو اس کا کیا انجام ہوگا؟

پھر اس قسم کی تلخ گفتگو اس کے ساتھ ہے جس نے اس کے دربار میں شکوہ کیا۔ تو جو شخص غیروں کے آگے اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرے وہ تو سخت ترین سزا کا مستحق ہے ——— نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا۔ ونسأله ان یعفو عنا ویغفر لنا سوء ادبنا ویصلحنا بحسن نظره انه ارحم الراحمین۔

سوال :

قضاء پر راضی ہونے کے کیا معنی ہیں اور اس کی حقیقت اور حکم کیا ہے؟

جواب :

ہمارے علمائے کرام نے فرمایا ہے رضا غصہ ترک کر دینے کا نام ہے۔ اور غصہ ایسی چیز کو اولیٰ اور بہتر کہنے کا نام ہے جو قضاء الٰہی کے خلاف ہو اور جس کا بُرا یا اچھا ہونا یقینی نہ ہو۔ سخط اور غصے میں ایسا ذکر اور خیال ضروری ہے تب غصہ متحقق ہوگا۔

سوال :

کیا شرور و معاصی اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر سے نہیں ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ بندے سے شر پر کیسے راضی ہوگا اور اس پر شر کیسے لازم کرے گا؟

جواب :

رضا کا تعلق قضا سے ہے اور قضائے شر بُرا نہیں۔ بلکہ وہ شئے بُری ہے جس کے ساتھ قضا متعلق ہوتی ہے۔ لہٰذا رضا بالشر نہ پائی گئی۔ ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جن امور سے قضا متعلق ہوتی ہے وہ چار قسم ہیں:

(۱) نعمت (۲) شدت (۳) خیر (۴) شر

نعمت میں قاضی یعنی خدا تعالیٰ، قضا اور مقضی یعنی نعمت سب پر راضی ہونا واجب ہے اور اس کے نعمت ہونے کے اعتبار سے اس کا شکر بھی واجب ہے۔ اور اس طور پر اظہار نعمت بھی ضروری ہے جس سے نعمت کے اثر کا اظہار ہو۔

(۲) شدت یعنی مصیبت اور تکلیف۔ اس میں بھی قاضی یعنی اللہ تعالیٰ، اس کی قضا اور

مقضی یعنی اس مصیبت اور تکلیف تینوں پر راضی ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ اور اس کے سختی اور تکلیف ہونے کے اعتبار سے اس پر صبر بھی واجب ہے۔

(۳) خیر یعنی بھلائی اور نیکی۔ اس میں بھی مذکورہ تینوں اشیاء پر رضامند ہونا لازم ہے۔ اور اس میں پروردگار کے احسان کا اعتراف کرنا کہ اس نے خیر کی توفیق دی، بھی ضروری ہے۔

(۴) شر یعنی بُرائی۔ اس میں بھی قاضی یعنی خدا اور قضا اور مقضی یعنی اس بُرائی پر اس اعتبار سے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قضا کا تعلق ہے، رضامند ہونا ضروری ہے۔ ہاں! اس اعتبار سے اس کے ساتھ رضا کا تعلق نہیں ہوسکتا کہ وہ شر اور بُرائی ہے۔ اور اس شر کا فیصلہ شدہ اور قضا شدہ ہونا اصل میں اللہ تعالیٰ کے قاضی ہونے اور اس کی قضا کی جانب ہی رجوع کرتا ہے۔

اس کو یوں سمجھو کہ تم مثلاً کسی بُرے مذہب پر رضا کا اظہار کرو اس اعتبار سے کہ مجھے اس کا علم اور اس کی پہچان ہو جائے۔ نہ اس اعتبار سے کہ وہ تمہارا مذہب ہو جائے۔ تو اس مذہب کا معلوم ہونا دراصل تمہارے علم کی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔ تو رضا اور محبت درحقیقت اس مذہب باطل سے نہیں بلکہ اس کے علم کے ساتھ ہے۔ اسی طرح یہاں شر پر رضامند ہونے کا مطلب اس کی بُرائی پر رضامند ہونا نہیں بلکہ اس پر رضامند ہونا ہے کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے مقدر کرنے سے ہے۔

سوال:

کیا راضی بقضاء شخص کو زیادتی کا طالب ہونا درست ہے؟

جواب:

ہاں، اس نیت سے کہ میرے لیے صلاح اور خیر میں اضافہ ہو، زیادہ کا طالب ہونا درست ہے اور یہ رضا بالقضاء کے خلاف نہیں۔ کیونکہ اس نیت کے ساتھ زیادتی کا طالب ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس پر کلی طور سے راضی ہے۔ انسان اسی وقت زیادتی کا طالب ہوتا ہے جبکہ وہ اس پر خوش ہو۔ لہٰذا وہ زیادہ کا طالب ہوسکتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ کے سامنے دودھ پیش کیا جاتا تو فرماتے:

اللّٰھم بارک لنا فیه وزدنا منه (اے اللہ! ہمیں اس میں برکت دے اور اس میں اضافہ فرما)

اور اگر کوئی اور شے پیش ہوتی تو فرماتے:

وزدنا خیرا منه۔ ہمارے لیے اس سے بہتر میں اضافہ فرما۔

اور ان دونوں مقاموں میں کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مقدر شدہ چیز پر راضی نہیں تھے۔

سوال:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تو منقول نہیں کہ بہ نیت خیر و صلاح زیادتی چاہے۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے؟

جواب:

اس طرح کے امور کا تعلق قلب سے ہوتا ہے۔ اس لیے عموماً انہیں زبان پر نہیں لایا جاتا مگر وہ مراد ضرور ہوتے ہیں۔

چوتھا عارضہ، مصائب اور تکالیف:

ان میں کامیابی کی واحد صورت صبر ہے۔ اس لیے ایسے تمام مقامات پر صبر بہت ضروری ہے۔ اور یہ دو وجہ سے ضروری ہے:

(۱) تاکہ انسان عبادت تک پہنچ سکے اور اپنا مقصود حاصل کر سکے۔ اس لیے کہ عبادت کا دار و مدار صبر اور مشقت برداشت کرنے پر ہے۔ تو جو شخص صابر نہیں ہوگا اس سے فی الحقیقت کوئی نیکی انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اس لیے کہ جو شخص خلوصِ قلب سے عبادت کرے گا، اسے کئی طرح کی مشقتیں، مصیبتیں اور شدائد پیش آئیں گی:

ایک، تو اس بنا پر کہ ایسی کوئی عبادت نہیں جس میں مشقت نہ ہو۔ کیونکہ جب تک خواہش کا قلع قمع اور نفس پر سختی نہ کی جائے عبادت کا کوئی فعل صادر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ خواہش اور نفس، دونوں انسان کو عبادت سے روکتے ہیں۔ اور نفس اور خواہش پر قابو پانا انسان کے لیے مشکل ترین امر ہے۔

دوسرے اس لیے کہ انسان جب کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس میں احتیاط ضروری ہے، اور احتیاط مشقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور کسی کام کو احتیاط و درستی کے ساتھ انجام دینا بھی مشکل

کام ہے۔

تیسرے اس لیے کہ دنیا دارِ محنت ہے۔ تو جو شخص اس میں ہوگا اسے ضرور طرح طرح کی مشکلات مصائب اور تکالیف پیش آئیں گی۔ یہ مصائب کئی طرح کے ہیں:

(۱) اہل و عیال، رشتہ داروں، بھائیوں اور دوستوں کا مرنا، یا ان کا گم ہو جانا، یا ان سے جدائی۔

(۲) اس کی اپنی ذات کا گوناگوں امراض مہلکہ میں مبتلا ہونا۔

(۳) لوگوں کا اسے قتل کرکے اس کی عزت برباد کرنا اور اس کے زن و فرزند پر دست درازی کرنا، اسے حقیر جاننا، اس کی غیبت کرنا، اس پر الزام تراشیاں کرنا۔

(۴) مال کا ضائع اور تباہ ہونا۔

اور یہ مذکورہ مصائب و تکالیف اپنے اپنے معیار اور درجہ کے مطابق انسان کو زخمی کرتی ہیں اور اس کے دل کو جلاتی ہیں۔ تو ان سب تکالیف میں لامحالہ صبر کی ضرورت ہے۔ ورنہ غم و افسوس اور بے صبری انسان کو عبادت سے باز رکھے گی۔

چوتھے یہ کہ طالب آخرت سخت آزمایا جاتا ہے اور اسے شدید محنت میں مبتلا کیا جاتا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اسے مصائب بھی دنیا میں زیادہ درپیش آئیں گے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اشد الناس بلاء الانبیاء ثم العلماء ثم الامثل فالامثل	لوگوں میں سب سے زیادہ انبیاء آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں پھر علماء، پھر جو ان کے قریب ہیں، پھر جو ان کے قریب ہیں۔

جو شخص بھی نیکی کا قصد کرے گا اور راہِ آخرت اختیار کرے گا وہ ضرور ان محنتوں اور مشقتوں میں مبتلا ہوگا۔ تو جو شخص ان پر صبر نہ کر سکا اور انہیں برداشت نہ کر سکا وہ راستے میں ہی رہ جائے گا اور عبادت سے محروم رہ جائے گا۔ تو عبادت میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔

اور خداوند تعالیٰ نے ہم کو بالکل واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ ہم ضرور تم کو مصائب اور تکالیف میں آزمائش کے طور پر مبتلا کریں گے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ	اور تمہاری ضرور آزمائش ہوگی تمہارے مالوں میں
وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	اور تمہاری جانوں میں۔ اور تم ضرور سنو گے یہود و
مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا	نصاریٰ اور مشرکین سے اذیت دینے والی باتیں
اَذًی کَثِیْرًا۔	

پھر فرمایا:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ	تو اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ
مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔	بہت ہمت کے کام ہیں۔

تو گویا اللہ تعالیٰ ان آیات میں یہ فرما رہا ہے کہ اپنی جانوں کو مصائب و تکالیف برداشت کرنے کا خوگر بنا لو۔ تو اگر تم ان مصائب میں صبر کرو گے تو واقعی تم اپنی مردانگی کا ثبوت دو گے اور واقعی تمہارے ارادے مردوں والے ہوں گے۔

پس جو شخص بھی عبادت کا عزم کرے گا اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے صبرِ عظیم کا ارادہ کرے اور نفس کو مسلسل بڑی مشکلات برداشت کرنے کا عادی بنائے، یہاں تک کہ موت آجائے۔ ورنہ وہ ایک ایسی چیز کا ارادہ کر رہا ہے جس کا اس کے پاس ہتھیار نہیں۔ اور جس ذریعہ سے وہ کام انجام کو پہنچ سکتا ہے وہ اس کے عکس کرنے کا قصد کر رہا ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جو شخص طریقِ آخرت طے کرنے کا عزم کرے وہ اپنے اندر پہلے موت کے چار رنگ پیدا کرے: (۱) سفید (۲) سرخ (۳) سیاہ۔ (۴) سبز۔

موت کا سفید رنگ تو بھوک ہے۔ اور سیاہ لوگوں کی مذمت۔ اور سرخ مخالفت شیطان، اور سبز حوادث ایام پر صبر کرنا۔

اور صبر کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہوتی ہے۔ اور نجات و کامیابی سے انسان ہمکنار ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا	جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے
وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔	لیے ذریعہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسی جگہ سے

رزق دے گا جہاں کا اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوگا۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں جو شخص صبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اسے شدائد سے نجات دے گا۔

(۲) صبر کے ذریعہ انسان دشمنوں پر فتح مند ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ آپ صبر کریں بیشک نیک انجام متقین کا ہی ہے

(۳) صبر کے ذریعہ انسان اپنی مراد پالیتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ۔ اللہ تعالیٰ کے نیک کلمات بنی اسرائیل پران کے صبر کی وجہ سے پورے ہوئے۔

کہا گیا ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام نے فراق کے غم واندوہ کا تذکرہ یوسف علیہ السلام کو لکھا تو یوسف علیہ السلام نے جواب میں لکھا:

ان اٰباءك صبروا فظفروا فاصبر كما صبروا تظفر كما ظفروا۔ آپ کے آباواجداد نے صبر کیا تو کامیاب ہوئے۔ آپ بھی صبر کریں جیسا انہوں نے کیا تو آپ بھی کامیاب ہوں گے جیسے وہ ہوئے۔

یہ دو شعر بھی اسی سلسلہ میں کہے گئے ہیں:

(۱) لاتياسن وان طالت مطالبة ‏‏‏‏ اذا استعنت بصبران ترى فرجا

(۲) اخلق بذى الصبران يحظى بحاجته ‏‏‏‏ ومدمن القرع للابواب ان يلجا

ترجمہ (۱) مایوس ہرگز نہ ہو اگرچہ تجھے گزارش کرتے ہوئے عرصہ دراز گزر جائے۔ جبکہ تو نے صبر سے استعانت لی ہو۔ کیونکہ آخر تو ضرور وسعت وکشادگی سے ہمکنار ہوگا۔

(۲) صابر شخص کتنی بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد اور حاجت کو پالیتا ہے۔ اسی طرح درگاہِ ایزدی کو مسلسل دستک دینے والا یہاں تک کہ اس کی مرادوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

(۴) صبر کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے لوگوں کی پیشوائی اور ان کی امامت کا درجہ ملتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ اور ہم نے ان کو ان کے صبر کے باعث لوگوں کا امام بنایا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کی تبلیغ کرتے تھے

(۵) صبر سے انسان اللہ تعالیٰ کی ثنا کا مستحق ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ۔ ہم نے اسے صابر پایا، وہ (ایوب) بہت ہی اچھا بندہ ہے اور بہت ہی رجوع کرنے والا ہے۔

(۶) صبر سے جنت کی بشارت ملتی ہے، اور صابر شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی کا مستحق ہوتا ہے۔ فرمایا:

وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ۔ صبر کرنے والوں کو جنت کی بشارت دو۔

اور فرمایا:

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی صلواتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

(۷) صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انسان سے محبت کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ ۔ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے

(۸) صبر کے ذریعہ جنت میں درجاتِ عالیہ عطا ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا۔ ان لوگوں کو صبر کے صلہ میں جنت کے اندر بالاخانے عنایت ہوں گے۔

(۹) صبر کے طفیل انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرامت اور عزت کا مستحق ہوتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ تمہارے صبر کرنے کے صلہ میں تمہارے رب کا تم کو سلام

(۱۰) صبر کے باعث بندے کو آخرت میں بے حساب و بے شمار ثواب عطا ہوگا جو لوگوں کے وہم و گمان سے بہت ہی بالاتر ہوگا۔ قال اللہ تعالیٰ:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ بِغَيْرِ حِسَابٍ صبر کرنے والوں کو بے حساب ثواب ملے گا۔

سبحان اللہ! اس بزرگ اور برتر ذات نے انسان پر کس قدر کرم فرمایا۔ اور صبر کے صلہ میں

جو مذکورہ دس کرامتیں اور فضیلتیں دنیا و آخرت میں پروردگار انسان کو عطا فرماتا ہے۔ یہ محض ایک لمحہ بھر صبر کے عوض میں، تو تم پر واضح ہو گیا کہ دنیا و آخرت کی خیر اور بھلائی صبر میں مضمر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مَا اُعْطِیَ اَحَدٌ مِّنْ عَطَآءٍ خَیْرٍ اَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ — صبر جیسی کشادہ اور وسیع بھلائی اور خیر اور کرنی انسان کو عطا نہیں کی گئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

جمیع خیر المؤمنین فی صبر ساعة۔ — مومنین کی ہر قسم کی بھلائی ایک لمحہ بھر کے صبر میں ہے۔

ایک شاعر نے اس مضمون کو ذیل کے اشعار میں بہت اعلیٰ پیرایہ میں ادا کیا ہے:

(۱) الصبر مفتاح ما یرجی! وکل خیر بہ یکون

(۲) فاصبروان طالت اللیالی فربما امکن الحرون

ترجمہ: (۱) صبر ہر امید کی چابی ہے، اور ہر بھلائی صبر سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) تم صبر کرو اگرچہ صبر میں عرصہ دراز گزر جائے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک دشوار شے آخر کو ممکن ہو جاتی ہے۔

(۳) ربما نیل باصطبار ما قیل هیهات لا یکون!

(۳) اور بہت دفعہ صبر سے ایسے امور پر کامیابی حاصل کر لی گئی ہے جن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ ان کا ہونا بہت مشکل ہے۔

ایک شاعر اسی مضمون کو یوں ادا کرتا ہے:

(۱) صبرت وکان الصبر منی سجیة وحسبك ان الله اثنی علی الصبر

(۲) ساصبر حتی یحکم الله بیننا فاما الی یسر واما الی عسر

ترجمہ (۱) میں صبر کرتا ہوں اور صبر میری عادت ہو چکا ہے۔ اور تمہارے لیے صبر کی فضیلت میں یہی کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے صبر کی تعریف کی ہے۔

(۲) میں صبر پر قائم رہوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے،

یا آسانی کا یا تنگی کا۔

جب تم معلوم کر چکے کہ صبر کے یہ فضائل ہیں۔ تو تم پر لازم ہے کہ اس نفیس اور عمدہ خصلت کو اپنے میں پیدا کرو۔ اور اس کے حصول کے لیے پوری جدو جہد کرو۔ اس خصلت کے حاصل ہوجانے پر ضرور تم کامیاب لوگوں میں سے ہوجاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق کا مالک ہے۔

سوال:

صبر کی حقیقت اور اس کا حکم بیان کیجیے؟

جواب:

لغت میں صبر کے معنی روکنے کے ہیں۔ جیسے کہ قرآن میں یہ لفظ روکنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ۔ — اپنی ذات کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیے جو دن رات رب کی یاد میں مشغول رہتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کو بھی صابر اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ مجرمین سے عذاب روکے رکھتا ہے اور جلدی ان پر عذاب نازل نہیں کرتا۔

اور اصطلاحاً صبر دل کی کوششوں میں سے ایک کوشش کا نام ہے۔ کیونکہ صبر نفس کو جزع سے روکنے کا نام ہے۔ اور جزع کی علماء نے یہ تعریف کی ہے:

ذکر اضطرابك في الشدة۔ — تکلیف کے وقت اپنی پریشانی اور اضطراب کا ذکر کرنا۔

اور بعض نے جزع کے یہ معنی کیے ہیں کہ اپنے زور سے تنگی سے نکلنے کا قصد کرنا۔ اور صبر اس جزع کے ترک کا نام ہے۔

صبر کس طرح پیدا کیا جائے؟

اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی شدت اور راس کے وقت کو یاد کرے۔ اور یہ خیال کرے کہ نہ تو بے صبری سے اس میں اضافہ ہوگا اور نہ کمی۔ اور نہ اس میں تقدیم ہوگی اور نہ تاخیر۔ تو پھر جزع اور بے صبری سے کیا فائدہ؟ بلکہ اس میں بجائے فائدہ کے نقصان اور خطرہ ہے اور اپنے اندر صبر کا وصف پیدا کرنے کی سب سے اعلیٰ چیز یہ ہے کہ آدمی صبر کے اس عوض کا تصور کرے جس کا پروردگار نے وعدہ فرمایا ہے و باللہ التوفیق

فصل

عبادت کے لیے فراغت حاصل کرنے کی خاطر تم پر لازم ہے کہ ان عوارض اور ان کے اسباب و علل کو اپنے راستے سے ہٹا کر اس اہم اور سخت گھاٹی کو عبور کرو۔ ورنہ اگر تم ان عوارض و موانع مذکورہ میں مبتلا رہے تو تمہیں اپنا مقصود یاد کرنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی چہ جائے کہ تم مقصود کو پاؤ اور اس کو حاصل کرو اور ان عوارض میں سے ہر ایک عارضہ جدا نوعیت کی مشغولیت و مصروفیت رکھتا ہے بعض بہت جلد انسان کو مشغول کر لیتے ہیں اور بعض دیر سے۔

پھر ان چار میں سے سب سے بڑا اور سب سے سخت ترین رزق کا معاملہ ہے۔ اور اس کی تدبیر ہے۔ کیونکہ مخلوق کے لیے سب سے عظیم مصیبت یہ رزق ہی ہے جس کی تگ و دو نے مخلوقات کو درماندہ اور عاجز کر دیا ہے، اور دلوں کو عبادت سے غافل کر رکھا ہے۔ اور لوگوں کو بے پناہ تفکرات اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے اور عمروں کو ضائع کر دیا ہے۔ اور یہ رزق ہی لوگوں کے لیے بڑے بڑے گناہوں اور معاصی کے ارتکاب کا باعث بنا ہے۔ اور یہ رزق کا معاملہ ہی لوگوں کو خدمت پروردگار سے ہٹا کر خدمت دنیا اور خدمت مخلوقات کا باعث بنا ہے۔ تو لوگ اس رزق کے دھندے میں پھنس کر یادِ حق سے غفلت اور گناہوں کی تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں، اور رزق کی تلاش میں سرگردانی، پریشانی، اور ذلت و خواری میں عمر عزیز کو برباد کر دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں اعمال سے مفلس اور قلاش ہو کر پیش ہوتے ہیں۔ اور اگر خدا تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال نہ ہو تو پریشان کن حساب اور جانکاہ عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دیکھیے! اس رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے کس کثرت کے ساتھ آیات نازل فرمائی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے کس قدر وعدے کیے ہیں۔ اور رزق کی ذمہ داری کے متعلق توکل کی تلقین کرتے آئے ہیں۔ اور لوگوں کے لیے صحیح راہ کی وضاحت کرتے آئے ہیں۔ اور علماء نے اس سلسلے میں سینکڑوں تصانیف کی ہیں، اور طرح طرح کی مثالیں دے کر سمجھاتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے غضب و مواخذہ سے ڈراتے رہتے ہیں۔ لیکن افسوس، کہ لوگ اس کے باوجود راہ ہدایت پر نہیں چلتے اور تقویٰ اختیار نہیں کرتے اور رزق کے بارے میں مطمئن نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ رزق کی تلاش میں بے ہوشی کی حد تک پہنچ چکے ہیں ہمیشہ

اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں صبح یا شام کا کھانا فوت نہ ہو جائے۔ اور اس غفلت کی اصل اور بڑی وجہ آیاتِ قرآنی میں قلت تدبر اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں میں قلتِ فکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس کلام سے نصیحت پذیر نہ ہونا، اور سلف کے ارشادات میں غور و فکر نہ کرنا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ لوگ وساوس شیطانی کا شکار ہو چکے ہیں اور جہلاء کے کلام سے مانوس ہو چکے ہیں۔ اور اہلِ غفلت کی عادات سے متصف ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ابلیس لعین ان پر مکمل طور پر مسلط ہو چکا ہے اور غلط عادات ان میں گھر چکی ہیں۔ اس طرح لوگ ضعف اعتقاد اور ضعف یقین کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

لیکن اصحاب بصیرت اور ارباب ریاضت و مجاہدہ جو رب تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کی رضا پر راضی ہیں، اس لیے وہ اسباب دُنیویہ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی رسّی (دین) کو مضبوطی سے تھام لیا ہے اور مخلوق سے کلّی طور پر بے نیاز ہو گئے ہیں۔ انہیں رب تعالیٰ کی آیات پر یقین کامل ہے۔ وہ اس کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم کو ہی نگاہ رکھتے ہیں۔ رزق کے سلسلہ میں وساوس شیطانی، مخلوق کی طرح طرح کی باتوں اور نفس خبیث کے فریب میں نہیں آتے۔ اور جب اس سلسلہ میں شیطان یا کوئی انسان یا ان کا نفس وسوسہ اندازی کی کوشش کرتا ہے تو وہ پوری طرح مقابلہ کرتے ہیں، اور مکمل طور سے مدافعت اور مخالفت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مخلوق ان سے منہ پھیر لیتی ہے اور شیطان ان سے جدا ہو جاتا ہے اور نفس ان کا مطیع ہو جاتا ہے، اور انہیں صراطِ مستقیم پر استحکام اور زیادہ نصیب ہو جاتا ہے۔

اِس سلسلہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ حکایت منقول ہے کہ جب آپ نے زادِ راہ کے بغیر ایک جنگل عبور کرنے کا ارادہ کیا، تو ابلیس نے آکر آپ کو یوں خائف کرنے کی کوشش کی، کہ "یہ ایک خطرناک جنگل ہے۔ اور آپ کے پاس نہ تو زادِ راہ ہے اور نہ ہی اسے طے کرنے کا کوئی اور ذریعہ ہے"۔ شیطان کی طرف سے یہ خوف دلانے پر آپ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں ضرور یہ خوفناک جنگل زادِ راہ کے بغیر طے کروں گا۔ اور صرف بغیر زادِ راہ ہی طے نہیں کروں گا، بلکہ ہر میل پر ایک ہزار رکعت نفل ادا کروں گا۔ چنانچہ آپ نے جو ارادہ فرمایا وہ پورا کر دکھایا، اور آپ بارہ برس اس جنگل میں رہے یہاں تک کہ جب ہارون رشید اس جنگل سے حج بیت اللہ شریف کے ارادے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ آپ ایک جگہ نوافل میں مشغول ہیں۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ نماز پڑھنے والے بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم

ہیں۔ تو اس نے آپ سے کہا "اے ابراسحاق! آپ اس حال میں اپنے آپ کو کیسا پاتے ہیں"؟ تو آپ نے اس کے جواب میں یہ دو شعر پڑھے:

(۱) نُرَقِّعُ دُنْيَانَا بِتَمْزِيقِ دِيْنِنَا! فلا دیننا یبقی ولا ما نرقع

(۲) فطوبیٰ لِعبدٍ آثر الله ربّه! وَجَادَ بِدُنْيَاهُ لِمَا يَتَوَقَّع

ترجمہ (۱) ہم اپنے دین کو برباد کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں، تو نہ ہمارا دین رہتا ہے اور نہ ہی دنیا سنورتی ہے۔

(۲) تو وہ شخص کس قدر مبارک اور خوش قسمت ہے جس نے ہر معاملے میں اپنے رب کی رضا کو ہی ترجیح دی اور آخرت کی نجات کی امید پر دنیا کو قربان کر دیا۔

بعض صالحین کے متعلق منقول ہے کہ وہ کسی جنگل میں تھے کہ ابلیس ان کے پاس آیا اور اس طرح وسوسہ اندازی کرنے لگا کہ آپ اس ویرانے میں زادِ راہ سے تہی دست ہیں۔ اور یہ ایسا جنگل ہے جس میں ہلاکت اشیاء بکثرت ہیں۔ اور اس میں نہ تو کہیں آبادی کا نشان ہے اور نہ ہی اس میں کسی انسان کا گزر ہے۔ تو اس بزرگ نے اس شیطانی وسوسے کو محسوس کر کے عزم مصمم کر لیا کہ میں زادِ راہ کے بغیر ہی اس کو طے کروں گا اور میں اس میں چلتا رہوں گا۔ اور نہ تو کسی سے کوئی شے لوں گا، اور نہ اس وقت تک کچھ کھاؤں گا جب تک کہ میرے منہ میں جبراً گھی اور شہد وغیرہ نہ ڈالا جائے گا۔

یہ ارادہ کر کے آپ نے اس جنگل کے بالکل ہی اجاڑ حصے کی طرف اپنا رخ کر لیا، اور اس کی سیاحت میں مشغول ہو گئے۔

وہ بزرگ فرماتے ہیں "میں اس میں گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک قافلہ راستہ بھول کر میری طرف کو آ رہا ہے میں انہیں دیکھتے ہی زمین پر لیٹ گیا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھ پائیں لیکن خدا کی شان کہ وہ میری طرف ہی سیدھے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے سر پر آ کھڑے ہوئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، تو وہ میرے بالکل ہی قریب کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا سفر خرچ ختم ہو چکا ہے اور بھوک پیاس کی وجہ سے غش کھا کر گرا ہوا ہے اس لیے گھی اور شہد لاؤ، کہ اس کے حلق میں ڈالیں تاکہ وہ ہوش میں آئے چنانچہ وہ گھی اور شہد لائے۔ میں نے اپنا منہ مضبوطی سے بند کر لیا، تو انھوں نے چھری منگوا کر میرا منہ زبردستی سے کھلوا لیا۔ تو میں

ہنس پڑا اور میں نے منہ کھول دیا۔ میری ہنسی کو دیکھ کر وہ کہنے لگے تم تو کوئی پاگل ہو۔ تو میں نے جواب دیا: "خدا کی قسم! میں مجنون یا پاگل ہرگز نہیں ہوں"۔ اور میں نے شیطان کے آنے اور اس کی وسوسہ اندازی کے واقعہ سے انہیں آگاہ کیا، جسے سُن کر وہ بہت ہی متعجب ہوئے۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ "طالب علمی کے زمانہ میں سفر کے دَوران میں نے ایک ایسی مسجد میں قیام کیا جو آبادی سے کافی فاصلے پر تھی۔ اور میں اپنے مشائخ کی سنت کے مطابق سفر خرچ سے خالی ہاتھ تھا۔ ابلیس نے آکر وسوسہ اندازی شروع کی کہ یہ مسجد آبادی سے بہت دور ہے۔ اس مسجد میں قیام کے بجائے اگر تو کسی ایسی مسجد میں قیام کرے جو آبادی میں واقع ہو تو وہاں تیرے خورد و نوش کا انتظام ہو سکے گا۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ میں یہیں رہوں گا۔ اور خدا کی قسم میں حلوے کے سوا کوئی شے کھاؤں گا بھی نہیں۔ اور حلوہ بھی اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک ایک ایک لقمہ کر کے میرے منہ میں نہ ڈالا جائے۔ چنانچہ میں نے وہاں نماز عشاء ادا کی اور مسجد کا دروازہ بند کر دیا۔ جب رات کا ابتدائی حصہ گزر گیا تو اچانک کسی شخص نے جس کے ہاتھ میں شمع تھی مسجد کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب اس نے کافی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا تو میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا میں نے دیکھا کہ ایک بڑھیا ہے جس کے ساتھ ایک نوجوان ہے۔ بڑھیا دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اور میرے سامنے حلوے سے بھرا ہوا ایک تھال رکھ دیا۔ اور کہنے لگی یہ نوجوان میرا لڑکا ہے میں نے یہ حلوہ اس کے لیے تیار کیا تھا۔ اور گفتگو کے دَوران اس نے قسم کھالی کہ میں یہ حلوہ اکیلا نہیں کھاؤں گا۔ بلکہ کسی مسافر کے ساتھ کھاؤں گا، یا اس مسافر کے ساتھ جو اس مسجد میں ہے۔ اس لیے تو اسے کھا، اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے۔ اس کے بعد بڑھیا نے لقمے بنا کر ایک میرے منہ میں اور ایک اپنے لڑکے کے منہ میں دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر وہ نوجوان اور بڑھیا واپس چلے گئے اور میں نے مسجد کا دروازہ بند کر لیا۔ اس واقعہ پر میں دل ہی دل میں دیر تک متعجب ہوتا رہا۔

اے مخاطب! یہ اور اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جو صالحین سے مجاہدے اور مخالفت شیطان کے طور پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ اس طرح کے واقعات سے تمہیں تین طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں:

(۱) اوّل، یہ کہ تم جان لو کہ جو رزق مقدر ہو چکا ہے وہ بہر حال انسان کو ملے گا۔

(۲) دوم، یہ کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ رزق اور اس میں توکل ایک اہم شے ہے۔ اور یہ کہ رزق کے معاملہ میں شیطان کے فریب اور وسوسے نہایت ہولناک اور عظیم ہیں حتیٰ کہ مندرجہ بالا قسم کے زاہدین، ائمہ کرام اور بزرگانِ دین بھی ان وساوس سے محفوظ نہ رہ سکے، اور ان کے اس قدر مجاہدات اور ریاضات شاقہ کے باوجود ابلیس انہیں گمراہ کرنے سے مایوس نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ان ائمہ کرام کو ان وساوس سے محفوظ رہنے کے لیے ایسے ایسے محیر العقول ذرائع اختیار کرنے پڑے۔ اور خدا کی قسم جو شخص ستر برس سے مجاہدات و ریاضات میں مصروف ہو وہ بھی شیطانی وسوسوں سے مامون و محفوظ نہیں ہو سکتا جس طرح مبتدی اور غافل لوگ اس کے وساوس و خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اور اگر نفس و شیطان کا ذرا بھی داؤ چلے تو وہ اسے ہلاک کر کے رکھ دیں جس طرح وہ غافل اور غرور میں مبتلا شخص کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ (ان فی ذلک عبرۃ لاولی الابصار)۔

(۳) ائمہ کرام اور بزرگانِ دین کے اس طرح کے واقعات سے تیسرا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ رزق کے سلسلہ میں توکل کی منزل کوشش شدید اور مجاہدہ بلیغ کے بغیر طے نہیں ہو سکتی اور وہ ائمہ کرام اگرچہ تمہاری طرح گوشت، خون، بدن اور روح کا مجموعہ تھے۔ بلکہ ان کے بدن تم سے زیادہ لاغر اور ان کے اعضاء تم سے زیادہ ضعیف اور ان کی ہڈیاں تم سے زیادہ پتلی تھیں لیکن ان میں قوت علم تھی، نور یقین تھا۔ اور دین کے معاملے میں ان کی ہمت قوی تھی اس لیے وہ اس قدر سخت مجاہدے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان بلند مقامات پر فائز ہوئے ——

—— ان بزرگانِ دین کی زندگیوں کے مقابلے میں ذرا اپنی طرف بھی غور کرو۔

تمہیں چاہیے کہ اس لاعلاج بیماری کی دوا کرو تاکہ آخرت میں فلاح پاسکو۔

فصل

اب میں اس سلسلے میں تمہیں چند ایسے نکتے بتاتا ہوں جو میرے علم میں آئے ہیں۔ اور جو پورا دھیان رکھ کر سننے سے تمہارے قلب میں جاگزیں ہو جائیں گے اور توکل فی الرزق کے مسئلے میں زیادہ کش مکش سے بچ جاؤ گے۔ اور ان پر عمل کرنے اور ان میں غور و تامل کرنے سے تمہیں واضح طور پر راہ حق

کی طرف راہ نمائی نصیب ہو جائے گی ——— واللہ سُبْحَانَہ المُوَفِق۔

پہلا نکتہ:

تمہیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں تمہارے رزق کی ضمانت وکفالت کا ذمہ اُٹھایا ہے۔ اس چیز کو تم یوں سمجھو کہ کوئی دُنیوی بادشاہ تم سے یہ وعدہ کرے کہ آج شام تمہاری میرے ہاں مہمانی ہے۔ اور تمہیں اس کے متعلق یہ حُسن ظن بھی ہو کہ یہ اپنی گفت گو میں سچا ہے جھوٹا نہیں اور وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ بلکہ اگر ایک بازاری یا کوئی یہودی یا نصرانی یا کوئی آتش پرست جس کا ظاہر حال اچھا ہو وہ تم سے اس طرح کا کوئی وعدہ کرے تو تم ضرور اس کی بات پر اعتماد کرو گے اور تم اس کی بات پر مطمئن ہو جاؤ گے اور رات کے طعام کے سلسلے میں اس کی بات پر بھروسہ کر کے بے فکر ہو جاؤ گے۔

جب تم اِن مندرجہ بالا اشخاص کے محض ظاہر حال اور اپنے حسن ظن کے باعث ان پر فوراً اعتماد کر لیتے ہو۔ تو افسوس ہے کہ اپنے پروردگار کی بات پر اعتماد نہیں کرتے جس نے رزق کے متعلق نہایت صریح الفاظ میں ضمانت وکفالت کا وعدہ فرمایا ہے۔ صرف وعدہ ہی نہیں فرمایا بلکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس وعدۂ رزق پر قسمیں کھائی ہیں۔ افسوس! کہ اللہ تعالیٰ کے ان تاکیدی وعدوں کے باوجود رزق کے معاملہ میں تمہارا دل مطمئن نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی کفالت و ضمانت پر سکون پذیر نہیں ہوتا۔ اور تم اللہ تعالیٰ کی تقسیم ازلی پر نظر نہیں کرتے، بلکہ تمہارا قلب مشوش اور مضطرب رہتا ہے۔ کاش! کہ اللہ تعالیٰ کے ان تاکیدی وعدوں پر عدم اعتماد کے وبال کا انکشاف تم پر واضح ہو جائے اور اس کی برائی اور معصیت کا اندازہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

(۱) اتطلب رزق اللہ من عند غیرہ — وتصبح من خوف العواقب امنا

(۲) وترضی بصراف ولو کان مشرکا — ضمینا ولا ترضی بربك ضامنا

(۳) کانك لم تقرء بما فی کتابہ — فاصبحت منحول الیقین مباینا

ترجمہ (۱) کیا تم رب تعالیٰ کے سوا دوسروں سے رزق طلب کرتے پھرتے ہو۔ اور اس طرح تم زمانہ کے عواقب ومصائب سے مامون ومحفوظ ہونے کے خام خیال میں مبتلا ہو۔

(۲) افسوس کہ تم ایک مشرک صراف کے ضامن بننے پر رضا مند ہوجاتے ہو۔ مگر اپنے پروردگار کی ضمانت پر تمہیں اعتماد نہیں۔

(۳) گویا تم نے رزق کے متعلق آیات خداوندی کو پڑھا ہی نہیں۔ اس لیے تم راہِ حق سے جدا اور یقین سے برگشتہ معلوم ہوتے ہو۔

رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر عدمِ اعتماد ایک ایسی تباہ کن چیز ہے جو انسان کو شک و شبہ میں مبتلا کر دیتی ہے اور ایسے شخص کے متعلق خطرہ ہے کہ اس سے اس کا دین اور دین کی معرفت سلب نہ ہو جائے ـــــ العیاذ باللہ ـــــ اسی لیے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم ایماندار ہو۔

اور فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اور مومنوں کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

دین کا صحیح احساس رکھنے والے ایماندار کے لیے صرف یہی ایک نکتہ کافی ہے ـــــ

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

دُوسرا نکتہ:

قرآنی آیات اور ارشادات نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہایت صحت کے ساتھ یہ امر ثابت ہے کہ ہر ایک کا رزق ازل سے تقسیم ہو چکا ہے۔ اس لیے تمہیں اس تقسیم خداوندی پر یقین ہونا چاہیے اور اس امر کا بھی اعتقاد ہونا چاہیے کہ اس کی تقسیم میں تغیر و تبدل اور ترمیم وغیرہ ناممکن ہے۔ تو اگر تم ان دلائل کے باوجود تقسیم ازلی کا انکار کر دو یا اس میں رد و بدل کو جائز خیال کرو تو یہ صریح کفر ہے ـــــ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ ـــــ اور جب تمہیں اس امر کا یقین ہو چکا کہ اس میں رد و بدل ناممکن ہے۔ تو اس سلسلہ میں اہتمام اور طلب و جستجو سے کیا فائدہ۔ اس عقیدہ کے ہوتے ہوئے پھر تلاش و جستجو دنیا میں ذلت اور خواری اور آخرت میں تنگی اور خسران کا باعث ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے:

مکتوب علیٰ ظھر الحوت والثور رزق فلان بن فلان فلا یزداد الحریص الا جھدا۔

مچھلی اور بیل کی پشت پر لکھا ہوا ہے، کہ یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے تو رزق کے معاملہ میں حریص شخص کو بیجا مشقت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ان ما قدر لما ضغیاث ان یمضغا فلا یمضغہ غیرک فکل رزقک ویحک بالعز ولا تاکل بالذل۔

بیشک جن لقموں کا چبانا تیرے مقدر میں ہوچکا ہے انہیں کوئی دوسرا نہیں چبا سکتا۔ تو اپنے حصہ کے رزق کو عزت کے ساتھ کھا ذلت وخواری سے نہ کھا۔

دانش مند شخص کے لیے یہ دوسرا نکتہ بھی ایک جامع نکتہ ہے۔

تیسرا نکتہ:

یہ نکتہ میں نے اپنے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا ہے جسے انہوں نے اپنے کسی استاذ رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ:

"میرے شیخ کے استاذ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: رزق کے معاملہ میں جس چیز سے مجھے سکون ہوا وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے نفس سے کہا کہ "یہ رزق زندہ انسانوں کے لیے ہی تو ہے۔ مُردوں کو رزق سے کیا تعلق۔ اور جس طرح انسانی زندگی اللہ تعالیٰ کے خزانے اور اس کے دست قدرت میں ہے اسی طرح رزق بھی اسی کے دست قدرت میں ہے، چاہے مجھے دے اور چاہے نہ دے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی مشیت میرے علم سے پوشیدہ ہے۔ وہی جیسے چاہتا ہے تدبیر کرتا ہے۔ اور مجھے اپنے نفس کو سکون وقرار میں رکھنا چاہیے۔"

اہل تحقیق کے لیے یہ نکتہ بھی بہت مفید ہے۔

چوتھا نکتہ: اللہ تعالیٰ ہمارے رزق کا ضامن اور کفیل ہے۔ مگر اس حد تک جو غذا اور

تربیت میں کام دے سکے، زیادہ کا نہیں۔

باقی رہا کھانا پینا، تو جب بندہ عبادت الٰہی کے لیے لوگوں سے علیحدگی اختیار کرے، اور اللہ تعالیٰ پر پوری طرح بھروسہ کرے، تو بسا اوقات خورد و نوش کے ظاہری اسباب اس سے روک لیے جاتے ہیں۔ اور ظاہری اسباب کے رُک جانے پر نہ تو بندے کو ملول ہونا چاہیے اور نہ ہی اس کی کچھ پرواہ کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ جب حقیقت امر اس پر منکشف ہے کہ اگر میری زندگی باقی ہے تو اللہ تعالیٰ نے میرے بدن کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اور توکل علی اللہ سے مقصود بھی صرف اسی قدر ہے کہ وہ ہلاک نہ ہو اور اس کا جسم قائم رہے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور اس کی غیبی امداد فرمائے گا تاکہ جب تک اس کی زندگی ہے عبادت اور خدمت حق میں وہ بندہ پوری توجہ سے مشغول رہے۔ اور مقصود بھی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح انسان کا جسم قائم رہے تاکہ وہ رب تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہے۔ اور خدا تعالیٰ کو قدرت ہے کہ جب تک چاہے کسی بندے کا بدن قائم رکھے۔ چاہے غذا کھانے اور پانی پینے کے ذریعہ باقی رکھے یا گارے یا مٹی یا تسبیح و تہلیل کے ذریعہ باقی رکھے، جیسے ملائکہ تسبیح و تہلیل سے زندہ ہیں۔ اور چاہے تو بغیر کسی سبب کے باقی رکھے۔ اور مقصود تو عبادت اور خدمت حق کی خاطر بقائے بدن ہے، چاہے جس طرح بھی باقی رہے۔ بندے کو اکل و شرب، شہوت رانی اور لذات دنیویہ کے لیے تو پیدا نہیں کیا گیا کہ خواہ مخواہ اس کے لیے مرغن غذائیں ہی ضروری ہیں۔

ہمارے اس مذکورہ بیان سے واضح ہو گیا کہ ایسے حالات میں اسباب ظاہری کا چنداں اعتبار نہیں۔ چونکہ یہ چیز بزرگان دین اور زاہدین اُمت کے قلوب میں پوری طرح جاگزیں تھی۔ اس لیے وہ طول طویل مسافتیں کئی کئی راتیں اور دن کھائے پیے بغیر کاٹ لیتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض دس دس روز کچھ نہیں کھاتے تھے اور بعض ایک ایک ماہ اور بعض دو دو ماہ بغیر کچھ کھائے پیے گزار لیتے تھے اور اس کے باوجود ان کی بدنی قوت بحال رہتی تھی۔

اور بعض ایسے بھی تھے جو صرف ریت پھانک لیتے تھے اور وہی ان کو غذا کا کام دے جاتی تھی۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ مکہ معظمہ میں آپ کا خرچ ختم ہو گیا تو آپ مسلسل پندرہ روز ریت پر گزارا کرتے رہے۔

ابو معاویۃ الاسود فرماتے ہیں کہ میں نے اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے

مسلسل بیس روز گار سے پرگزار دیے۔ اور حضرت اعمش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ مجھے ایک دفعہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ملے اور کہنے لگے ایک ماہ سے میں نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ بلکہ دو ماہ سے۔ اور اس دو ماہ کے عرصہ میں صرف ایک دفعہ ایک شخص نے خدا کی قسم دے کر کچھ تھوڑے سے انگور کھلا دیے' اور اس بات پر میں اب تک اپنے شکم کا شاکی ہوں۔

میں کہتا ہوں اے مخاطب! تجھے ایسی حکایات اور بزرگان سلف کے ایسے واقعات سن کر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

اور اس سلسلے میں تمہارا وہم یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ بعض مریض ایک ایک ماہ اور دو دو ماہ کچھ کھائے پیے بغیر زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ بیمار جسمانی طور پر تندرست آدمی سے زیادہ کمزور اور نحیف ہوتا ہے۔ اور جو شخص ایسے توکل میں بھوک سے ہلاک ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی صرف اتنی ہی تھی۔ نہ یہ کہ خدا پر توکل کرنے سے اس پر موت وارد ہو گئی جس طرح بعض لوگ خوب سیر ہو کر کھا لینے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔

اور مجھ تک حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا خدا کے سلسلہ میں میرا دستور تھا کہ ہر تیسرے روز اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے انتظام کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے ایک جنگل عبور کرنا پڑا۔ اس دوران پورے تین روز گزرنے پر کھانے پینے کی کوئی صورت مہیا نہ ہو سکی۔ آخر چوتھے روز میں نے کچھ کمزوری محسوس کی اور ایک جگہ ذرا آرام کے لیے بیٹھ گیا۔ تو اچانک غیب سے آواز سنائی دی "اے ابو سعید! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ضرور تیرے لیے خوراک ہی مہیا ہو' یا تجھے صرف اس قدر کافی ہے کہ تجھے چلنے پھرنے کی قوت دے دی جائے؟ میں نے عرض کیا مجھے صرف قوت کافی ہے۔ چنانچہ اس کے متصل ہی کمزوری جاتی رہی اور میں مسلسل بارہ روز کچھ کھائے پیے بغیر سفر کرتا رہا۔ اور مجھے کچھ تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

تو جب بندہ دیکھے کہ خورد و نوش کے ظاہری اسباب میں رکاوٹ ہو رہی ہے۔ اور اس کا خدا تعالیٰ پر توکل بھی ہو تو اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ضرور غیبی قوت سے امداد فرمائے گا۔ تو بندش اسباب پر ملول خاطر نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ کریم کا اس بات پر کثرت سے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے خصوصی احسان، کرم نوازی اور مہربانی سے مشقت سے بچا کر نصرتِ غیبی سے

سرفراز فرمایا اور مقصودِ اصلی تک پہنچایا۔ اور خورد و نوش کے اسباب ظاہری کی پریشانی اور بوجھ سے نجات عطا فرمائی۔ اور خرقِ عادت کے طور پر اسے قوت مرحمت فرمائی اور کھائے پیئے بغیر اپنی یاد کی قدرت نصیب فرمائی اور اس کے حال کو ملائکہ کرام کے حال کے مشابہ کر دیا۔ اور بہائم اور عامۃ الناس کے حال سے بلند کر لیا۔ اور اسے اپنے قرب کی عزت سے سرفراز فرمایا۔

ہمارے اس بیان میں سنجیدگی سے غور کرو، تاکہ تمہیں نفع کثیر حاصل ہو ــــ اِنْ شَآءَ اللّٰہ تعالیٰ۔

میں کہتا ہوں، شاید تو یہ کہے کہ رزق کے موضوع پر تم نے گفتگو کا سلسلہ خلافِ معمول بہت دراز کر دیا ہے۔ حالانکہ تم کہہ چکے ہو کہ اس کتاب میں اختصار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹے گا۔ تو میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم! رزق کا معاملہ جس قدر اہم اور نازک ہے، اس کی نسبت یہ بیان بہت ہی قلیل اور مختصر ہے۔ کیونکہ رزق ایک ایسی چیز ہے جس پر دنیا و دین کے تمام امور کا دار و مدار ہے۔ تو عبادتِ خداوندی کے لیے جس کی ہمت قوی ہوا سے چاہیے کہ ہماری بیان کردہ باتوں پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو۔ اور اس کے متعلق اسلامی احکام کی پوری رعایت ملحوظ رکھے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو وہ مقصود سے بہت ہی دور رہے۔

اور وہ چیز جس سے تم پر اس امر کا انکشاف ہو کہ رزق کے معاملہ میں علمائے حقانی اور بزرگانِ دین کس قدر بصیرت کاملہ کے مالک تھے، یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کی بنا ہی توکل علی اللہ، عبادت کی طرف پوری توجہ اور مخلوق سے تعلقات منقطع کرنے پر رکھی تھی۔ انہوں نے اس موضوع پر کس کثرت سے کتب تصنیف فرمائیں، اور وصال کے وقت اس معاملہ میں کیا کیا وصیت کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے دین میں ان کے لیے کیسے مخلص معاونین اور دوست مہیا کر دیے تھے کہ خلاف اہلِ سنت وجماعت کے اعتقاد والے عابدوں اور زاہدوں وغیرہ کو ان میں ایک شمہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ جیسے کرامیہ وغیرہ۔ اس لیے کہ ان کے عقائد کی بنیاد ہی اصولِ حقہ کے خلاف پر تھی۔

اور ہم اہلِ سنت وجماعت جب تک اپنے ائمہ دین اور بزرگانِ عظام کی سیرت اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، تو خدا اور مخلوق کی نظروں میں مکرم و معظم رہے۔ اور مدارس اسلامیہ اور اپنی عبادت گاہوں سے علم و اخلاق کے چیکر بن بن کر نکلتے رہے۔

چنانچہ علم میں استاذ ابو اسحاق، ابو حامد، ابو الطیب، ابن فورک اور میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ جیسے متبحر لوگ ہمارے امام اور پیشوا ہیں۔ اور عبادت میں ابو اسحاق شیرازی، ابو سعید الصوفی اور ابو نصر مقدس جیسے پاکیزہ حضرات ہمارے رہبر ہیں۔ یہ لوگ علم و زہد میں فائق ترین لوگ تھے۔ افسوس کہ ہمارے قلوب ان حضرات کی متابعت سے کمزور و ضعیف ہو گئے۔ اور ہم ایسے علائق میں مبتلا ہو گئے جن کا ضرر نفع سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں دین کے معاملہ میں رجعت واقع ہو گئی ہمتیں پست ہو گئیں۔ برکات اُڑ گئیں۔ اور عبادت کی لذتیں اور حلاوتیں چلی گئیں۔ اب یہ امید مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے کہ عبادت میں کسی کا حال پھر درست ہو جائے اور اسے صحیح علم نصیب ہو جائے۔ اور جس جس میں اس وقت دین و معرفت کی معمولی روشنی موجود ہے وہ صرف حارث محاسبی۔ محمد بن ادریس شافعی، مزنی اور حرملہ وغیرہ ائمۂ متقدمین کی اقتداء اور پیروی کا صدقہ ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ جیسا کہ ایک شاعر نے اسلاف کی ان اشعار میں صفت بیان کی ہے:

(۱) وما صحبوا الایام الا تعففا — وما وجدوا من حب سیدهم بُدّا

(۲) افاضل صدیقون اهل ولایة — الی سید السادات قد جعلوا القصدا

(۳) تحلل عقد الصبر من کل صابر — وما حلت الایام من عقدهم عقدا

ترجمہ (۱) وہ زمانے میں نہایت عفت اور پاکیزگی کے ساتھ رہے۔ اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت کے سوا کوئی چیز بھی باعثِ اطمینان اور سکون نہ بنی۔

(۲) بڑے بڑے فاضل اور صدیق اسلاف جو اہل ولایت تھے۔ ہمیشہ ان کی توجہ سید السادات یعنی رب تعالیٰ کی طرف ہی رہی۔

(۳) زمانہ کے مصائب اور حوادث نے بڑے بڑوں کے صبر کی گرہیں کھول ڈالیں مگر ان مقدس نفوس نے صبر کی ایک گرہ بھی نہ کھول سکے۔

ہم (اہل اسلام) صدر اول میں دینِ اسلام کی پیروی کے باعث بادشاہ تھے۔ لیکن اس سے روگردانی کی وجہ سے اب ہماری پوزیشن ایک بازاری شخص سے زیادہ نہیں۔ ہم دینی و دنیوی کمالات کے میدان کے شہسوار تھے۔ مگر اب پیدلوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اور اب خطرہ ہے کہ کہیں راستہ سے بھٹک ہی نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہی مصائب پر ہمارا مددگار ہے۔ اور اسی سے خلوص قلب کے ساتھ

التجا ہے کہ دین کی جو معمولی رمق ہم میں باقی ہے وہ سلب نہ کرے۔ اِنَّہٗ جَوَادٌ کَرِیْمٌ مَنَّانٌ رَحِیْمٌ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

تفویض کا بیان

تفویض کے معنی ہیں جملہ امور خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دینا۔ تفویض کی پوری حقیقت اور تفصیل سمجھنے کے لیے دو چیزوں کا سمجھنا ضروری ہے:

ایک، یہ کہ کسی چیز کے پسند یا ناپسند کا امتیاز وہی کر سکتا ہے جو ہر معاملے کو ہر جہت سے جانتا ہو، اور اس کے ظاہر، باطن، حال اور انجام سے پوری طرح آگاہ ہو۔ جس شخص کو اس امتیاز کا علم نہ ہو وہ اچھی بری چیز اور غلط صحیح میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ کسی بدوی یا دیہاتی یا چرواہے کو آپ کبھی نہیں کہیں گے کہ یہ درہم دیکھنا، کھوٹے ہیں یا کھرے؟ کیونکہ وہ اس وصف سے خالی ہے۔ اسی طرح آپ کسی شہری سے بھی یہ بات نہیں کہیں گے جو صراف نہ ہو۔ کیونکہ وہ بھی یہ کام مشکل ہی سے سرانجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا تم اس کام کے لیے اسی شخص کی طرف رجوع کرو گے جو ماہر صراف ہو اور سونے چاندی کے اسرار و خواص سے پوری طرح واقف ہو۔

اور ہر شے کے متعلق اس طرح کا علم محیط ہر جہت سے صرف ذات رب العالمین کو ہی حاصل ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو لائق نہیں کہ امور کی تدبیر، اور کسی امر کے پسند یا ناپسند کا فیصلہ خود ہی اپنے طور پر کر لے۔ بلکہ تدبیر و اختیار کا یہ جامع وصف اللہ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ ہی مختص ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے مقدس کلام میں فرماتا ہے:

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۔

اور تیرا رب ہی جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے پسند کرتا ہے۔ لوگوں کو پسند و ناپسند کا کوئی اختیار نہیں۔

پھر دوسرے مقام پر فرمایا:

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝

اور تیرا رب ہی جانتا ہے جسے لوگ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جسے ظاہر کرتے ہیں۔

نقل ہے کہ کسی بزرگ کو خدا کی طرف سے اشارہ ہوا "آپ جو چاہیں مجھ سے مانگیں آپ کو عطا کیا جائے گا"۔ اور وہ بزرگ مستجاب الدعاء تھے۔ تو آپ نے جواباً عرض کیا؟ سبحان اللہ! وہ ذات جو جمیع علوم پر حاوی ہے، ایک ایسے جاہل سے فرماتی ہے مانگ جو مانگنا چاہتا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ میرے لیے فلاں شے بہتر ہے اور فلاں بہتر نہیں۔ بلکہ جو تجھے پسند ہے وہی مجھے پسند ہے"

تفویض کے لیے دوسری اس چیز کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے کہ اگر ایک شخص تجھ سے یہ کہے کہ تیرے سب امور میں انجام دیتا ہوں اور تیری تمام حاجات کی تدبیر میں کرتا ہوں اس لیے تو اپنے جملہ امور میرے حوالے کر دے، اور تو اپنے کسی اہم کام کو سرانجام دینے میں مشغول رہ۔ اور یہ کہنے والا شخص تیرے نزدیک واقعی تمام امور سے واقف ہو، اور بہترین قوت حاکمہ کا مالک ہو۔ اور اپنے ارادے کو پورا کرنے کی قوت رکھتا ہو، اور وہ تجھ پر رحیم و کریم بھی ہو، اس کے ساتھ ساتھ وہ شخص متقی اور پرہیزگار اور صادق القول بھی ہو۔ تو کیا تو اس شخص کی اس عظیم پیشکش کو اپنے حق میں عظیم ترین غنیمت نہیں سمجھے گا اور بہت بڑی نعمت خیال نہیں کرے گا، اور اس کی انتہائی احسان مندی کا معتقد نہیں ہوگا، اور اس کے شکریے اور صفت و ثنا میں انتہا نہیں کر دے گا؟ یقیناً ضرور کرے گا۔

پھر جب وہ کوئی شے تیرے لیے پسند کرے گا جس کی اچھائی تجھ پر واضح نہ ہو تو تو اس کی اس پسندیدگی پر ہرگز ملول اور کبیدہ خاطر نہیں ہوگا۔ بلکہ تجھے اس پر پورا اعتماد ہوگا۔ اور تیرا دل کامل طور پر مطمئن ہوگا۔ اور تجھے یقین ہوگا یہ شخص وہی چیز میرے لیے منتخب کرے گا جو میرے لیے مفید اور میرے حق میں بہتر ہو۔ اگرچہ بعد میں اس کا انجام کچھ ہی ہو لیکن تم کو اس پر کامل اعتماد ہوگا۔

جب تم ایک انسان پر اس طرح کا اعتماد کر سکتے ہو تو تمہیں کیا ہے کہ اپنے جملہ امور اپنے پروردگار جل وعلا کے حوالے نہیں کرتے۔ حالانکہ وہی ہے جو زمین و آسمان کے نظام کی تدبیر کرتا ہے، اور وہ ہر عالم سے زیادہ عالم ہے اور ہر قادر سے زیادہ قادر ہے، اور ہر رحم کرنے والے سے زیادہ رحیم ہے، اور ہر غنی سے زیادہ غنی ہے۔ وہ اپنے کامل علم اور حسن تدبیر سے وہ شے تمہارے لیے منتخب کرے گا جس تک تمہارا وہم و گمان نہیں جا سکتا۔

تو جب خدا تعالیٰ ہی تیرے جملہ امور کا کفیل اور ضامن ہے۔ تو تجھے چاہیے کہ تمام تعلقات سے منقطع ہو کر ہمہ تن اپنی آخرت کی اصلاح میں مشغول ہو جائے۔ اور جو چیز اللہ تعالیٰ تیرے سامنے

لاتا رہے ان پر راضی رہے۔ اگرچہ اس کا حسن و قبح تجھ پر منکشف نہ ہو۔ کیونکہ خدا کی طرف سے جو چیز ہو گی وہ تیرے حق میں بہتر اور خیر ہی ہو گی ——— باللہ التوفیق۔

رضا بالقضاء کا بیان

رضا بالقضاء کے سلسلے میں بھی دو امر ذہن نشین کرنے ضروری ہیں۔ تاکہ حقیقت حال کی وضاحت ہو جائے۔

ایک تو یہ کہ رضا بالقضاء کا حال اور مآل میں کیا فائدہ ہے؟

فی الحال تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ فراغتِ قلب اور بے کار فکر و تشویش سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ بعض زہاد نے اسی لیے فرمایا ہے کہ جب قضاء و قدر حق ہے تو معاملات زندگی میں غم و فکر بے معنی ہے۔ اور اس کی اصل وہ حدیث شریف ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے کہ حضور نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

لِیُقِلَّ هَمَّكَ وَمَا قُدِّرَ یکن وَمَا لَمْ یُقَدَّرْ لَمْ یَاْتِكَ — اے ابن مسعود) تجھے کسی معاملے میں فکر و تشویش نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ آکر رہے گا! اور جو تیرے لیے مقدر نہیں ہے وہ ہرگز تجھ پر وارد نہیں ہو گا۔

یہ کلام نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کلام مبارک ہے، جو نہایت جامع اور بلیغ ہے کہ الفاظ بالکل مختصر ہیں مگر بے شمار معانی پر مشتمل ہے۔

اور رضا بالقضاء کا انجام کے اعتبار سے یہ فائدہ ہے کہ قضاء پر راضی ہونے والے انسان کو اللہ تعالیٰ اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ اور ایسے شخص کو اپنے رب کی رضا اور خوشنودی بھی حاصل ہو گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ — اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے۔

اس کے برعکس خداوند قدوس کی ناراضگی اس دنیا میں تو فکر، غم اور پریشانی وغیرہ پیدا کرتی ہے اور آخرت میں بھی خواہ مخواہ بوجھ اور عذاب کا سبب بنے گی۔ کیونکہ قضاء الٰہی تو بہرحال نافذ ہو کر رہے گی، تیری ناراضگی اور تیرے ارادے سے وہ بدل نہیں سکتی۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار میں کہا گیا ہے:

(۱) ما قد قضی یا نفس فاصطبری له ولك الامان من الذی لم یقدر

(۲) وتحققی ان المقدر کائن حتم علیك صبرت ام لم تصبر

ترجمہ (۱) اے نفس! تیرے لیے جو کچھ مقدر ہو چکا ہے اس پر صبر کر، اور جو کچھ تیرے لیے مقدر نہیں اس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ تجھ پر وارد نہیں ہو سکتا۔

(۲) اور اس بات پر یقین رکھ کہ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ ضرور مل کر رہے گا، چاہے تو صبر کرے یا بے صبری کا مظاہرہ کرے۔

اور عقلمند انسان راحت قلب اور ثواب جنت کو چھوڑ کر اس چیز کو اختیار نہیں کرتا جو آخرت میں بوجھ اور عذاب کا باعث بنے اور جس سے بے فائدہ فکر اور تشویش لاحق رہے۔

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی میں نقصان کا اندیشہ اور عظیم خطرہ مضمر ہے اور خدا تعالیٰ مہربان نہ ہو تو اسے اپنے پر ناراض کرنے والا انسان بعض اوقات کفر و نفاق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس کلام میں غور کرو:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

اے حبیب! ہمیں تیرے رب کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو اپنے تمام تنازعات میں اپنا حاکم مطلق تسلیم نہ کریں پھر آپ کے فیصلے کے خلاف اپنے قلوب میں ذرہ برابر رنجش بھی محسوس نہ کریں بلکہ دل و جان اور رضا و رغبت سے اُسے تسلیم کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں اس شخص کے ایمان کی ہی نفی کر دی اور نفی ایمان پر قسم کھائی ہے جو فیصلۂ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پسند نہ کرے۔ اور نبی کا فیصلہ سُن کر دل میں تنگی اور بے چینی محسوس کرے۔ تو جو شخص فیصلۂ خداوندی کو تسلیم نہ کرے بلکہ اُلٹا اس سے ناراض ہو وہ کیسے مومن ہو سکتا ہے؟

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ایک قدسی حدیث مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

من لم یرض بقضائی ولم یصبر علی بلائی ولم یشکر علی نعمائی

جو شخص میری تقدیر پر راضی نہ ہو اور میری جانب سے آنے والی مصیبتوں پر صابر نہ ہو اور میری عطا

فلیتخذ الٰھا سوائی۔ کردہ نعمتوں کا شکر نہ ادا کرے تو ایسا شخص میرے بجائے کسی اور کو رب بنالے۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ گویا یوں فرماتا ہے کہ یہ شخص جب مجھ سے راضی نہیں کیونکہ تقدیر پہ ناک منہ چڑھاتا ہے تو پھر یہ اپنا رب کوئی اور بنالے جو اس کو اچھا لگے۔ عقلمند جانتا ہے کہ یہ انتہائی زجر اور ڈانٹ کے الفاظ ہیں۔ ایک بزرگ سے جب عبودیت اور ربوبیت کا معنی دریافت کیا گیا، تو اس نے کیا ہی اچھا جواب دیا۔ چنانچہ فرمایا:

"ربوبیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ جو چاہے حکم کرے۔ اور عبودیت یہ ہے کہ بندہ اس کے ہر حکم اور قضا کو بلا چون وچرا تسلیم کرے۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم دے اور بندہ نہ تو اس کی تعمیل کرے اور نہ اس کو پسند کرے تو وہاں عبودیت اور ربوبیت کچھ بھی نہیں"۔

اس میں غور کرو اور اپنے حال کو عبودیت کے مطابق کرو۔ تاکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی مدد توفیق سے سلامتی نصیب ہو۔

صبر کا بیان

صبر ایک کڑوی دوا ہے اور ناخوشگوار شربت ہے۔ مگر نہایت بابرکت اور ہر طرح کی منفعت کا موجب اور ذریعہ ہے، اور ہر طرح کی مضرت کو دفع کرتا ہے جب دوا ایسی بابرکت اور نافع ہو، تو عقلمند انسان طبیعت پر جبر کر کے بھی ایسی دوا استعمال کرتا ہے اور گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے پیٹ میں ڈال لیتا ہے، اور اس کی تلخی اور تیزی کو برداشت کرتا ہے۔ اور یوں کہتا ہے کہ اس دوا کی تلخی تو ایک گھڑی بھر کے لیے ہے مگر اس کا نفع سالہا سال تک باقی رہنے والا ہے۔

اب ہم ان منافع کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو صبر سے حاصل ہوتے ہیں۔

جان لو کہ صبر چار طرح کا ہے:۔

(۱) صبر علی الطاعۃ۔ (۲) صبر عن المعصیۃ۔

(۳) صبر عن فضول الدنیا۔ (۴) دنیا کے مصائب و آلام پر صبر۔

جب کوئی شخص صبر کی تلخی برداشت کرے اور مذکورہ چاروں قسم کے صبر پر کاربند ہوجائے،

تو اسے طاعات اور طاعات پر استقامت کی نعمتِ عظمیٰ نصیب ہوتی ہے، آخرت میں ثوابِ عظیم کا مستحق بنتا ہے اور ایسے شخص کو دنیا میں گناہوں اور گناہوں کے نتائجِ بد سے حفاظت نصیب ہو جاتی ہے، اور آخرت میں گناہوں کے وبال میں مبتلا ہونے سے بھی بچ جاتا ہے۔ نیز ایسا شخص طلبِ دنیا کو ترک کر دیتا ہے اور اس پانچ روزہ زندگی میں مشاغلِ دُنیوی سے الگ رہتا ہے۔ ایسا شخص اِنْ شاء اللہ تعالیٰ عذابِ اُخروی سے بھی محفوظ رہے گا۔ اس کے اعمالِ خیر بھی ضائع نہیں ہوتے اور دنیوی ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدم رہتا ہے اور آسائشِ دنیا حاصل نہ ہونے پر رنجیدہ خاطر نہیں ہوتا۔ تو اس صبر سے انسان کو طاعت، اس کے درجاتِ عالیہ، طاعت کا ثواب، تقویٰ، زہد اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھا بدلہ، اچھی جزا اور ثوابِ کثیر حاصل ہوتا ہے۔ اور فوائدِ صبر کی پوری تفصیل درحقیقت خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

صبر ضرر رساں چیزوں کو دور کر دیتا ہے:

صبر کی وجہ سے ایک تو انسان بے صبری سے پیدا ہونے والی جزع فزع کی مشقت سے بچ جاتا ہے، اور دنیا میں بے صبری کا رنج برداشت کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ پھر آخرت میں ترکِ صبر پر دیے جانے والے عذاب سے حفاظت میں رہتا ہے۔ لیکن اگر انسان بے صبری کرے، گلہ شکوہ کی زبان دراز کرے، تو اس کی ہر منفعت فوت ہو جاتی ہے اور وہ انواع و اقسام کی مضرات و تکالیف میں پھنس جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت و بندگی بجا لانے کی مشقت پر صبر نہیں کرے گا تو طاعت اور بندگیِ مولیٰ تعالیٰ کی نعمت سے محروم رہے گا اور طاعت پر کاربند نہ ہو سکے گا یا بے صبری کے باعث طاعت پر اسے دوام نصیب نہیں ہوگا، تو مرتبۂ استقامت نہیں پا سکے گا جو ایک اعلیٰ مرتبہ ہے۔ یا فقدانِ صبر کے باعث فضولیات و لغویاتِ دنیا سے نہیں بچے گا۔ اور گناہ و معصیت میں پڑ جائے گا۔ یا فقدانِ صبر کی بنا پر دُنیوی تکلیف و مصیبت کے وقت شکوہ شکایت کی زبان دراز کرے گا اور اس طرح صبر کے ثواب سے محروم رہے گا۔ اور بسا اوقات زیادہ بے صبری دکھانے پر آخرت کے ثواب کے علاوہ صبر کرنے پر دنیا میں جو نعمت ملنے والی تھی وہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور بے صبری کا مظاہرہ کر کے ایک مصیبت کے بجائے کئی مصیبتیں مول لے لیتا ہے، کہ دنیا کی نعمتیں بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور آخرت کا ثواب بھی فوت ہو جاتا ہے۔ کئی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ صبر جیسی عمدہ نعمت

سے محروم ہو جاتا ہے۔ بعض بزرگوں کا قول ہے:

حرمان الصبر علی المصیبۃ اشد من المصیبۃ — مصیبت کے وقت صبر نہ کرنا مصیبت سے زیادہ بدتر مصیبت ہے۔

لہٰذا اس چیز کو اختیار کرنے کا کیا فائدہ جو حاصل شدہ شے کو بھی فوت کر دے۔ اور گم شدہ شے کو واپس نہ لا سکے۔ لہٰذا کوشش کرو کہ اگر ایک شے (نعمت دنیوی) فوت ہو جائے تو دوسری تو فوت نہ ہو۔ یعنی صبر۔

فضیلت صبر کے متعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک نہایت جامع قول منقول ہے۔ آپ نے ایک شخص کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

ان صبرت جرت علیک المقادیر — تجھ پر تقدیر الٰہی ضرور جاری ہو کر رہے گی۔
وانت ماجور وان جزعت — ہاں اگر تو صبر کرے گا تو اجر و ثواب پائے گا۔
جرت علیک المقادیر وانت — اور اگر بے صبری کا شیوہ اختیار کرے گا تو گنہگار
مأزور۔ — ہو گا۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات برحق پر توکل و بھروسہ کرتے ہوئے دل کو اس کی چاہت کی چیزوں سے الگ کرنا، نفس امارہ کو اس کی بری عادات سے روکنا، دنیوی معاملات کی تدابیر و تجاویز کو ترک کر دینا، اپنے متعلق نفع و نقصان کی چیزوں سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا، نفس امارہ کی نگرانی کرنا، کسی امر کے فوت ہو جانے پر نفس کو بے صبری سے روکنا جبکہ ایسے موقع پر بے صبری کرنا اس کی فطرت و سرشت میں داخل ہے، نیز نفس کو رضا کی لگام دینا اور نفرت کے باوجود نفس کو صبر کے تلخ اور کڑوے گھونٹ پلانا، یہ سب مندرجہ بالا امور نا قابل برداشت ہیں، اور یہ نہایت بھاری بوجھ اور مشکل ترین طریق علاج ہے۔ لیکن اپنی اصلاح اور درستی کی صحیح تدبیر بھی صرف یہی ہے۔ اور یہی صراط مستقیم ہے۔ اور اسی صراط مستقیم پر چلنے کا انجام اچھا ہے۔ اور سعادت و نیک بختی کے حالات اسی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

تم اُس مالدار باپ کے متعلق کیا کہتے ہو جو اپنے بیمار بیٹے کو کھجور اور سیب وغیرہ پھل کھانے کو نہیں دیتا اور پھل فروٹ کی نعمتیں دینے کے بجائے اس کو ایک سخت طبیعت معلم کے حوالے کر دیتا ہے جو سارا دن

تعلیم کے لیے اسے اپنے پاس روک کے رکھتا ہے اور اسے ڈانٹتا رہتا ہے۔ اور اس کا باپ اس کو سینگھی لگانے کے لیے حجام کے پاس لے جاتا ہے۔ جو اسے اپنے عمل جراحی سے اور تکلیف دیتا ہے۔ کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ اس کا باپ اسے بخل و کنجوسی کی بنا پر کھانے کو پھل نہیں دیتا، جبکہ اس کا باپ اجنبی لوگوں کے ساتھ بھی فیاضی سے پیش آتا ہے اور ہر طرح مالی تعاون کرتا ہے۔ ایسا شخص اپنی اولاد کے حق میں کیسے بخیل ہو سکتا ہے، اور اپنی اولاد سے اپنا مال و دولت کیونکر روک سکتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس جو کچھ ہے اس کی اولاد کے لیے ہی ہے۔

نیز سخت طبیعت معلم کے حوالے کر کے کیا وہ اسے دُکھ اور تکلیف دینا چاہتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ اس کا بیٹا تو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اور اس کے دل کا چین ہے۔ بلکہ بیٹے کو اگر ہوا بھی لگ جائے تو باپ بے چین ہو جاتا ہے۔ درحقیقت وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا سلوک اس لیے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اس میں اس کی بہتری ہے اور تعلیم و تربیت کی اس تھوڑی سی مشقت و تکلیف سے اس کا بیٹا عظیم کمالات اور اعلیٰ صفات کا مالک بن جائے گا۔

نیز اس خیر خواہ، مخلص اور ماہر طبیب کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو ایک لاغر اور نازک حال مریض کو پانی پینے سے روک دیتا ہے۔ حالانکہ اس مریض کو شدید پیاس لگ رہی ہوتی ہے اور شدت پیاس کے باعث اس کا کلیجہ جل رہا ہوتا ہے لیکن وہ طبیب اسے کڑوی دوا دیتا ہے جو اس مریض کی طبیعت اور نفس پر گراں ہوتی ہے۔ تو کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ وہ طبیب مریض سے دشمنی اور عداوت اور اسے اذیت دینے کے لیے ایسی دوا دے رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس میں اُس مریض کے ساتھ سراسر خیر خواہی اور احسان ہے۔ کیونکہ طبیب جانتا ہے کہ مریض بتقاضائے شہوت جو کچھ طلب کرتا ہے اس میں اس کی ہلاکت اور موت ہے۔ اور اسے اس سے روکنے اور باز رکھنے میں ہی اس کی شفا اور بقا ہے۔

تو تمہیں ان مثالوں سے اندازہ لگانا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی وقت ایک روٹی یا ایک درہم تمہیں عطا نہیں کرتا، تو تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ سب کچھ تمہیں عطا کر دے کیونکہ وہ فضل و جود کا مالک ہے۔ تمہاری تنگدستی سے پوری طرح واقف ہے۔ اس سے کوئی شے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود اگر وہ احکم الحاکمین تمہیں تمہاری چاہت کی چیز عطا نہیں کر رہا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ معاذ اللہ وہ شے اس کے پاس نہیں، یا وہ عاجز ہے۔ یا اسے

تمہاری حالت کا پتہ نہیں، یا وہ بخیل ہے۔ وہ تو ان تمام عیوب و نقائص سے پاک اور منزہ ہے۔ وہ تمام غنیوں سے بڑا غنی، تمام قدرت والوں سے بڑا قادر، تمام علم والوں سے بڑھ کر عالم اور تمام اسخیا سے بڑھ کر سخی اور کریم ہے۔ لہٰذا تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ تمہاری چاہت کی چیزیں بسا اوقات وہ تمہیں اس لیے عطا نہیں کرتا کہ اس میں تمہاری اصلاح اور بہتری مضمر ہوتی ہے۔ عطا نہ کرنے کی وجہ عجز یا بخل نہیں۔ بلکہ وہ تو قرآن مجید میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ	زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے
جَمِيعًا ؕ	تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی جانب بخل کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس نے تمہیں اپنی معرفت جیسی نعمت عظمیٰ عطا کی جس کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

انی لاذود اولیائی عن نعیم الدنیا	میں اپنے دوستوں کو دنیا کی نعمتوں سے اس طرح
کما یذود الراعی الشفیق	دور رکھتا ہوں جس طرح مہربان چرواہا اپنے اونٹوں
ابلہ عن مبارك العرة	کو خارش زدہ اونٹوں سے الگ رکھتا ہے۔

اور جب تجھے اللہ تعالیٰ دنیاوی شدائد و مصائب میں رکھے تو اس بات پر یقین رکھ کہ وہ تیرا امتحان لینے اور تیری آزمائش کرنے سے بے نیاز ہے۔ وہ تیرے حال سے واقف ہے۔ تیرے ضعف اور کمزوری کو بھی جانتا ہے۔ اور وہ تجھ پر رؤف و رحیم بھی ہے۔ کیا تو نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول مبارک نہیں سنا؟ آپ فرماتے ہیں:

للہ تعالیٰ ارحم بعبدہ المؤمن من	بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن پر اپنے بچے
الوالدۃ الشفیقۃ بولدھا	پر شفیق ماں سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہے۔

جب تو نے یہ بات جان لی تو پھر تجھے اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تیری اصلاح کے لیے تجھے تکلیف اور مصیبت میں ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تیری اصلاح منظور ہے۔ مگر تو اس سے بے خبر ہے۔ اسی اصلاح اور ترقی درجات کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں اور مقبول بندوں کو ابتلاء و آزمائش میں کثرت سے ڈالے رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ طبقہ اس کی درگاہ میں نہایت باعزت طبقہ ہے۔ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر فرمایا:

اذا احب اللہ قوما ابتلاھم۔	جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنا دوست بناتا ہے تو اس کو مختلف آزمائشوں میں ڈالتا ہے

دوسرے موقع پر فرمایا:

ان اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الشھداء ثم الامثل فالامثل	بیشک سب سے زیادہ انبیاء امتحان اور آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر شہید لوگ، پھر وہ جو اُن کے نزدیک ہیں اور پھر وہ جو اُن کے نزدیک

تو جب تو یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے دنیا کی نعمتوں کو روک رکھا ہے، یا تیرے لیے کثرت سے مصائب و مشکلات پیدا کر رہا ہے، تو یقین رکھ کہ یہ بات اللہ کی درگاہ میں تیرے باعزت اور صاحب مرتبہ ہونے کی علامت ہے، اور وہ تجھے اپنے اولیاء کے راستے پر چلانا چاہتا ہے۔ بیشک وہ پروردگار تیرے تمام حالات سے واقف ہے، اور کسی بات میں تیرا محتاج نہیں۔ (بلکہ ان باتوں سے اسے تیری اصلاح منظور ہے)۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔	اور اپنے رب کے حکم کے مطابق صبر سے کام لو۔ بیشک تم ہماری حفاظت اور نگاہ میں ہو۔

لہٰذا مصائب و مشکلات کے وقت تجھے اللہ تعالیٰ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ تجھے دنیوی لذائذ سے دور رکھ کر گناہوں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے، تیری اصلاح کرنا چاہتا ہے، تجھے زیادہ اجر و ثواب عطا کرنا چاہتا ہے، اور آخرت میں ابرار و مقربین کے مدارج پر فائز کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا بندہ مومن کے حق میں مصائب و مشکلات کا نتیجہ نہایت ہی اچھا ہے۔ اور روحانی عطاؤں کا سرچشمہ ہے ——— واللہ ولی التوفیق بمنہ وفضلہ۔

فصل

خلاصہ یہ کہ جب تجھے یقین سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ تیرے لیے اس قدر روزی کا ضامن ہو چکا ہے جس سے تیری حیاتِ دنیا کی بقا وابستہ ہے، اور جس سے عبادت بجا لا سکے اور وہ اپنے ارادے کے موافق ہر چیز کو جیسے چاہے وجود میں لانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اور وہ تیرے ہر وقت اور ہر گھڑی

اور حالت کی حاجت وضرورت سے بھی واقف ہے۔ تو تجھے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور کفالت پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اس کے وعدے کو سچا جاننا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ پر اس اعتماد اور بھروسے سے تمہارے دل کو سکون واطمینان نصیب ہوگا، اور تمہاری طبیعت علائق واسباب دنیوی سے الگ ہو جائے گی اور دل کا تعلق ان اسباب علائق سے کٹ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلقات اور اسباب دنیوی بھی اس وقت ہی مفید اور کفایت کرتے ہیں جب خدا تعالیٰ کی مشیت ہو۔ غذا کھانے اور اس کے ہضم میں آسانی اور سہولت، اسی طرح پینے کی چیزوں کے استعمال میں سہولت، پھر کھانے پینے کی اشیاء میں طبیعت کے موافق وخوشگوار ہونے کی صفت اللہ تعالیٰ ہی ان میں پیدا کرتا ہے۔ پھر ان اشیاء سے بدن میں قوت اور نفع بھی اللہ تعالیٰ ہی ان میں رکھتا ہے۔ نیز ان خورد ونوش کی اشیاء سے طبیعت پر گرانی اور ان کے نقصان کو اللہ تعالیٰ ہی اپنے ارادے اور مشیت سے دور کرتا ہے۔ تو درحقیقت نافع اسی کی ذات بابرکات ہے اور وہی درحقیقت کافی المہمات ہے۔ تو ہر طرح کا اختیار صرف اسی کی ذات وحدہٗ لاشریک کو ہے، لہٰذا اسی پر توکل اور بھروسہ کرو اور اپنے معاملات میں اپنی تدابیر کو اہمیت نہ دو۔ بلکہ اس ذات کی تدابیر وانتظام پر کفایت و انحصار کرو جو مدبر زمین وآسمان ہے۔ اور اپنے آپ کو آئندہ کے پروگراموں میں غور وفکر سے بھی نجات دو۔ اور یوں نہ سوچو کہ یہ کام کل مجھے کس طرح انجام دینا چاہیے، اور یہ کام کل ہوگا یا نہیں، اور یہ کام انجام دینے کے لیے کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ "شاید" اور "اگر مگر" کے چکر میں نہ پڑو۔ کیونکہ اس سے تضییع وقت اور مصروفیت دل کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ کل ایسے حالات سامنے آجائیں جن کا تمہیں وہم وگمان بھی نہ تھا، اور جو باتیں اور پروگرام تم بنا رہے تھے اور جن معاملات میں تم غور وخوض کر رہے تھے ان میں سے کوئی نہ ہو سکے، اور سوچ وبچار میں بے فائدہ وقت ضائع چلا جائے۔ بلکہ دل کی مصروفیت اور عمر برباد جانے پر خسارہ اور پشیمانی اٹھانی پڑے۔ کسی زاہد نے کہا ہے:

سبقت مقادیر الالٰہ وحکمہ   فارح فؤادک من لعل ومن لو

(ترجمہ) تقدیر خداوندی میں ہر شے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا تفکرات کو خواہ مخواہ اپنے اوپر مسلط نہ کرو۔ اور "شاید واگر مگر" کے چکر سے اپنے آپ کو امن میں رکھو۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں :

(۱) سیکون ماھو کائن فی وقتہٖ ‏ واخوالجھالہ متعب ومحزون

(۲) فلعل ما تخشاہ لیس بکائن ‏ ولعل ما ترجوہ لیس یکون

ترجمہ (۱) جو کچھ ہونا ہے وہ اپنے وقت میں ضرور ہو کر رہے گا۔ اور جاہل و بے خبر انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشقت اور غم میں ڈالے رکھتا ہے۔

(۲) تو ممکن ہے جس کا تجھے خطرہ ہے وہ نہ ہو اور جس کی تجھے امید ہے وہ بھی نہ ہو۔

لہٰذا اپنے نفس کو یوں تلقین کرو :

"اے نفس! ہمارے حصہ میں صرف وہی چیز آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور وہی ہمیں کافی اور ہمارا کارساز ہے۔"

وہ ایسا قدیر ہے کہ اس کی قدرت کی انتہا نہیں، اور وہ ایسا حکیم ہے کہ اس کی حکمتوں کی حد نہیں اور ایسا رحیم ہے کہ اس کی رحمتوں کی انتہا نہیں۔ اور جو ان صفات کا مالک ہے وہی اس بات کا اہل ہے کہ اسی پر بھروسہ اور توکل کیا جائے اور اپنے تمام کام اس کے حوالے کیے جائیں۔ لہٰذا صفت تفویض پر قائم رہو۔ اور یہ عقیدہ بھی رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں میرے لیے جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہوگا سب میرے موافق حال اور بہتر ہے۔ اگرچہ میرا علم اس کی کیفیات اور تفصیلات کو نہیں جانتا۔

اپنے نفس کو یوں بھی تلقین کرو :

اے نفس! نوشتۂ تقدیر ضرور مل کر رہے گا۔ غصہ اور بے چینی فائدہ ہے۔ اور بہتری تو اس میں ہے جو اللہ تعالیٰ کرے۔ لہٰذا غصے اور ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں۔

اے نفس! جب تو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہے تو اس کے حکم اور تقدیر پر کیوں راضی نہیں، حالانکہ قضاء و قدر ربوبیت کی صفات اور اس کے لوازمات میں سے ہیں لہٰذا اس کی رضا کو اختیار کرو۔

اسی طرح اگر تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ یا کوئی ناگوار معاملہ پیش آ جائے تو اپنے نفس کو تحمل و ضبط میں رکھو اور اپنے دل پر بھی قابو رکھو۔ یہ نہ ہو کہ جزع فزع، بے چینی اور گلہ شکایت کا اظہار کرنے لگو۔ خاصکر اول صدمہ کے وقت۔ کیونکہ ابتدائے مصیبت کے وقت صبر و تحمل ایک دشوار امر ہے

اور پہلے صدمے کے وقت نفس پر قابو رکھنا بہت مشکل ہے۔ ایسے وقت میں اپنے نفس سے یوں کہو:

"اے نفس! یہ مصیبت تو سر پر پڑ چکی ہے، اسے دور کرنے کی اب صورت اور تدبیر نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی بڑے بڑے مصائب سے تجھے نجات دے چکا ہے۔ کیونکہ آفات و بلیات کی بے شمار اقسام ہیں۔ اس مصیبت اور تکلیف کو بھی اللہ تعالیٰ دور کر دے گا اور مصیبت کا یہ بادل عنقریب چھٹ جائے گا۔ تو اے نفس! تھوڑی دیر کے لیے صبر کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھ، تجھے اس کے بدلے دائمی سرور اور ثواب عظیم عطا ہوگا۔"

پھر یہ بھی ہے کہ بے صبری سے نازل شدہ آفت دور نہیں ہو سکتی۔ تو جزع فزع بے کار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر و تحمل کے ہوتے ہوئے مصیبت کا برداشت کرنا مشکل نہیں رہتا۔ تو نزول مصیبت کے وقت زبان سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا ورد کرو اور دل میں اس اجر و ثواب کا تصور کرو جو اس پر اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ اور ایسے وقت میں بڑے بڑے مصائب پر اولوا العزم انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے صبر تحمل کو یاد کرو جو اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں عزت و وجاہت کا مقام رکھتے ہیں۔

اور اگر کسی وقت تمہارا پروردگار تم سے دنیا کو روک لے تو اپنے نفس سے یوں کہو:

"اے نفس! اللہ تعالیٰ تیرے حال سے پوری طرح واقف ہے۔ تجھ پر کرم کرنے والا اور مہربان بھی ہے۔ وہ خسیس کتے کو روزی دیتا ہے۔ بلکہ کافر کو بھی روزی دیتا ہے جو اس کا سراسر دشمن اور باغی ہے اور میں تو اس کا بندہ، اس کو پہچاننے والا اور اس کو ایک ماننا ہوں۔ کیا مجھے وہ ایک روٹی بھی نہیں دے سکتا؟ یہ تو ایک محال بات ہے۔ بلکہ وہ ضرور دے سکتا ہے۔ اس کے باوجود اگر اس نے دنیا کو مجھ سے روک لیا ہے تو ضرور اس میں کوئی نفع عظیم پوشیدہ ہے۔ اور ہر تنگی کے بعد سہولت ہے۔ تو اے نفس! تھوڑی دیر کے لیے صبر سے کام لے۔ تو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے عجیب عجیب اور عمدہ عمدہ چیزیں دیکھے گا۔ کسی کہنے والے نے کیا اچھا کہا ہے:

توقع منح ربك سوف يأتي!   بما تهواه من فرج قريب

اپنے رب کے لطف و کرم سے امید وابستہ رکھو۔ عنقریب وہ کشادگی اور سہولت تمہیں مل جائے گی جسے تم چاہتے ہو۔

ولا تياس اذا ما ناب خطب   فكم في الغيب من عجب عجيب

اور مصیبت اور تکلیف کے وقت مایوسی کا شکار نہ ہو جاؤ کیونکہ پردۂ غیب میں بڑے بڑے عجائب و غرائب موجود ہیں۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں:

(۱) الا یا ایھا المرء الذی الھم بہ برح

(۲) اذا اشتدت بک العسریٰ ففکر فی الم نشرح

(۳) فعسر بین یسرین اذا کرتہ فافرح

ترجمہ (۱) اے وہ شخص جس پر غم و فکر مسلط ہو چکا ہے۔

(۲) جب تیرا غم و فکر شدت اختیار کر جائے تو سورۂ الم نشرح کا مضمون ذہن میں لا۔

(۳) اس صورت میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ ایک تنگی دو آسانیوں کے درمیان ہے تو اس مضمون کے تکرار سے فرحت حاصل کر۔

تو جب تم اس طرح کے اذکار اور باتیں اپنے تصور میں لاتے رہو گے اور ان کی مشق کرتے رہو گے تو تمہارا یہ معاملہ آسان ہو جائے گا۔ بشرطیکہ کچھ وقت تک ہمت اور کوشش سے کام لو۔

جب تم اس مقام پر پہنچ گئے تو تم نے ان مذکورہ عوارض اربع کو اپنے نفس سے دور کر لیا اور اس کی مشقت تم نے اٹھالی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تم متوکلین میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں کا مقام پالیا جو اپنا ہر کام اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں اور اس کی تقدیر پر راضی رہتے ہیں۔ اور تم نے صابرین کا درجہ حاصل کر لیا۔ اور دنیا میں تو تمہیں راحتِ قلب و بدن حاصل ہو گئی۔ اور آخرت میں اجرِ عظیم اور ذخیرۂ ثواب جمع کر لیا۔ اور رب العالمین کی درگاہ میں تمہیں بلند مرتبہ حاصل ہو گیا۔ اور خدا تعالیٰ نے تم کو اپنا محبوب و دوست بنا لیا۔ اس طرح تم نے خیریتِ دارین حاصل کر لی اور عبادت کا راہِ مستقیم پالیا۔ کیونکہ اب نہ تو سامنے کوئی رکاوٹ ہے اور نہ دل کو ادھر ادھر مصروف کرنے والی کوئی چیز موجود ہے اور اس وقت تم نے اس مشکل گھاٹی کو عبور کر لیا۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا ہے کہ وہ حسن توفیق سے تیری بھی اور ہماری بھی مدد فرمائے۔ کیونکہ ہر چیز کا مالک و مختار وہی ہے۔ وھو ارحم الراحمین۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

پانچواں باب

پانچویں گھاٹی کے بیان میں

یہ گھاٹی عَقَبَۃُ الْبَوَاعِث کے نام سے موسوم ہے

اے برادر عزیز! جب طریق عبادت درست معلوم ہوگیا۔ اس راہ عبادت پر چلنے میں سہولت اور آسانی حاصل ہوگئی۔ اور موانع اور رکاوٹیں دور ہوگئیں، تو اب تجھے اس راہ پر چلنا ضروری ہے۔ لیکن اس پر چلنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تو اپنے اندر خوف و رجاء کی صفت پیدا نہ کرے اور ان کا شعور حاصل نہ کرے، اور ان دونوں کو کما حقہٗ نہ اپنائے۔

خوف کا التزام دو وجہ سے ضروری ہے: ایک تو اس لیے کہ خوف کے ذریعہ ہی انسان گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ نفس سرکش شر اور برائی کا انتہائی دلدادہ ہے اور فتنہ کی باتوں کا بہت شائق ہے۔ یہ اس وقت تک باز نہیں آسکتا جب تک اپنے اندر زبردست خوف نہ پیدا کیا جائے اور انتہائی زجر و تنبیہ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ کیونکہ نفس امارہ طبعًا صفت وفا اور حیا سے خالی ہے جیسے کسی نے کہا ہے:

العبد یقرع بالعصا　　　والحر تکفیہ الملامۃ

(غلام لاٹھی سے درست ہوتا ہے لیکن دانا اور شریف انسان کو تھوڑی سی ملامت اور تنبیہ کافی ہوتی ہے)۔

لہٰذا اس نفس امارہ کو راہ عبادت پر چلانے کی یہ تدبیر ہے کہ تو قول، فعل، اور فکر، غرض ہر طرح سے اس پر خوف کا کوڑا مستطر رکھے۔ جیسا کہ کسی بزرگ کے متعلق منقول ہے کہ اس کے نفس میں کسی گناہ کی رغبت اور چاہت پیدا ہوئی تو وہ باہر صحرا کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر کپڑے اتارے اور تپتی ریت پر لوٹنا شروع کیا اور نفس سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے رات کے وقت مردار کی طرح چارپائی پر پڑے رہنے والے اور دن لغویات میں ضائع

کرنے والے نفس! اس تپش اور حرارت کو چکھ لے۔ جہنم کی آگ تو اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ جب تیرے لیے یہ حرارت ناقابل برداشت ہے، تو دوزخ کی آگ کی گرمی کس طرح برداشت کرے گا؟"

دوسرے اس لیے خوف ضروری ہے تاکہ بندے کا نفس عُجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو۔ بلکہ راہِ عبادت میں پیش آنے والے خطرات و شدائد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے نفس کو مذموم جانے اس کو عیبناک تصور کرے اور ناقص جانے۔ اور اس طرح نفس سے عجب اور خود پسندی کے مادے کی بیخ کنی کرے۔ اور یہ بات خوف ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جیساکہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لواني وعيسى اوخذنا بما اكتسبت	اگر میں اور عیسیٰ ان اعمال کی وجہ سے پکڑے جاتے
هاتان لعذبنا عذابا لم يعذ به	جو ہم سے صادر ہو چکے ہیں تو ہم کو ایسے عذاب میں
احد من العالمين واشار باصبعيه	ڈالا جاتا جو سب سے سخت ہوتا۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ہم میں سے کوئی شخص اس بات سے بے خوف نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنی زندگی میں کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کیا ہو جس کی وجہ سے بخشش اور مغفرت کا دروازہ بند ہو چکا ہو اور اس کے بعد کے نیک اعمال کسی شمار میں نہ آرہے ہوں"۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے نفس کو یوں عتاب کرتے تھے:

تقولين قول الزاهدين وتعملين	اے نفس! تو باتیں تو درویشوں اور زاہدوں کی
عمل المنافقين وفي الجنة	کرتا ہے لیکن تیرے اعمال منافقوں جیسے ہیں۔

لہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اپنی امت کو خوف اور ڈر کی تعلیم کے طور پر ہے۔ یا حضور نے تواضعاً وانکسارًا فرمایا۔ یا بڑے درجے کی نیکی چھوڑ کر چھوٹے درجے کی اختیار کرنے کو انبیاء کرام علیہم السلام کی شان رفیع کے مطابق گناہ اور معصیت پر محمول کرتے ہوئے اپنی اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف عذاب کی نسبت کر دی۔ کیونکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اس پر بھی عتاب ہو سکتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ معاذ اللہ حضور سے یا حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے گناہ یا معصیت کا صدور ہوا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بالاجماع قبل نبوت اور بعد نبوت صغائر اور کبائر سے معصوم اور پاک ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مترجم عفی عنہ۔

تطمعين هيهات هيهات	اس پر تو جنت کی اُمید لگائے ہوئے ہے۔ اس
ان للجنة قوما اخرين ولهم	حال میں جنت کی امید ایک بعید بات ہے۔ درحقیقت
اعمال غير ما تعملين	جنتی اور لوگ ہیں اور ان کے اعمال تیرے اعمال سے
	بالکل مختلف ہیں۔

تو اس طرح کے واقعات ذہن میں دُہراتے رہو تاکہ عبادت کے دوران نفس امارہ عجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو۔ اور معصیت و نافرمانی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے ——— وباللہ التوفیق۔

رجاء کا بیان

رجاء کا تصور و شعور دو وجہ سے ضروری ہے۔

ایک تو اس لیے کہ طاعات اور نیک کاموں کا جذبہ پیدا ہو۔ کیونکہ نیک عمل کی انجام دہی نفس پر گراں ہوتی ہے۔ شیطان بھی نیکی کی طرف رُخ نہیں کرنے دیتا، اور نفسانی خواہشات بدی کی طرف کھینچتی ہیں۔ اور انسان اہلِ غفلت کے حالات کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو نیک کاموں کو بالکل ترک کر کے سراسر دنیا کی پرستش میں مصروف ہیں۔ اور آخرت میں نیکیوں پر جو ثواب عطا ہوگا وہ اس وقت آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ اور اس ثواب کو پا لینے کا معاملہ بعید ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو نیک کاموں کی طرف نفس کا متوجہ ہونا اور پوری طرح راغب ہونا اور حرکت کرنا ایک مشکل امر ہے۔ تو ایسی شے کا ساتھ ہونا ضروری ہے جو ان موانع کا مقابلہ کر سکے۔ ان کی مدافعت کر سکے۔ بلکہ نیکیوں سے روکنے والی چیزوں کی نسبت نیکیوں کی طرف راغب کرنے والی کی قوت زیادہ ہونی چاہیے۔ اور وہ شے رجاء ہے۔ یعنی رحمت خداوندی کی قوی امید، حسنِ ثواب کی طرف پوری رغبت، اور اجر الٰہی کا پورا یقین۔ ہمارے پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

الحزن يمنع عن الطعام والخوف	غم و فکر کھانے کی رغبت ختم کر دیتا ہے خوف
يمنع عن الذنوب والرجاء يقوى	الٰہی گناہوں سے روک دیتا ہے اور رحمتِ خداوندی
على الطاعات و ذكر الموت يزهد	کی امید نیک کاموں کی رغبت پیدا کرتی ہے۔
في الفضول۔	اور موت کی یاد فضول اور لغو کاموں سے متنفر کر دیتی ہے۔

دوسرے اس لیے رجاء ضروری ہے کہ اس سے عبادت کی مشقت اور صعوبت آسان ہوجاتی ہے معلوم ہونا چاہیے کہ جو شخص اپنی مطلوبہ شے کی اہمیت و ضرورت پہچان لیتا ہے۔ اس پر اس شے کے حصول کے لیے اپنی ہر چیز قربان کر دینا آسان ہوجاتا ہے۔ اور جیسے کوئی چیز پسند آجاتی ہے اور دل و جان سے اس کی چاہت و رغبت رکھتا ہے۔ وہ اس کی شدت و مشقت کو برداشت کر لیتا ہے۔ اور اس کے حصول میں جو محنت و مشقت اسے اٹھانی پڑتی ہے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور جیسے کسی چیز سے پورے طور پر پیار ہوجاتا ہے تو وہ اس کے لیے ہر مشکل و دشواری برداشت کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ بلکہ اپنی محبوب شے کی خاطر مشکلات و تکالیف برداشت کرنے میں کئی طرح کی لذت و فرحت محسوس کرتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ شہد فروخت کرنے والا نفع کی خاطر مکھیوں کے ڈسنے کی تکلیف کو محسوس نہیں کرتا۔ اور مزدور انسان گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں کڑاکے کی دھوپ کے اندر سارا سارا دن دو درہم کی خاطر بھاری بوجھ سر پر اٹھا کر بڑی اونچی اونچی سیڑھیوں پر چڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح کسان اناج کمانے کی خاطر گرمی اور سردی کی تکلیف اور سارا سال مشقت و محنت اٹھانے کو آسان جانتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ان صاحب کوشش بندوں نے جب جنت میں حاصل ہونے والے آرام و آسائش، کھانے پینے، حور و قصور، خوشنما زیور و لباس اور اللہ تعالیٰ کی ان تمام بیان کردہ نعمتوں پر یقین کیا اور ان کی یاد ذہن میں رکھی تو ان پر حق تعالیٰ کی عبادت و طاعت میں پیش آنے والی مشقتیں آسان ہوگئیں۔ اور دنیا کی لذتیں اور نعمتیں فوت ہوجانے پر انہیں رنج اور کوفت محسوس نہ ہوئی۔ اور جنت کی خاطر دنیا میں ہر طرح کے ضرر، خستہ حالی، بے چینی اور مشقت کو انہوں نے خوشی خوشی برداشت کیا۔

حکایت:

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں نے آپ کے خوفِ الٰہی، عبادت میں انتہا درجے کی کوشش و محنت اور آخرت کے ڈر کی وجہ سے آپ کی پریشاں حالی کو دیکھ کر عرض کیا "اے استاذ محترم! آپ اس سے کم درجے کی کوشش کے ذریعہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی مراد پالیں گے"۔ آپ نے جواب دیا:

"میں کیوں کوشش نہ کروں، حالانکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اہلِ جنت اپنے منازل و مکانات میں تشریف فرما ہوں گے کہ اچانک ان پر نور کی ایک تجلی پڑے گی جس سے آٹھوں جنتیں جگمگا اٹھیں گی۔ جنتی گمان کریں گے یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا نور ہے، تو سجدے میں گر پڑیں گے۔ انہیں ندا ہوگی اپنے سر

سجدے سے اُٹھالو یہ وہ نہیں ہے جس کا تمہیں گمان ہوا ہے۔ یہ تو جنتی عورت کے تبسم کا نور ہے جو اُس نے اپنے خاوند کے سامنے کیا ہے"۔

پھر حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اشعار پڑھے:

(۱) ما ضر من کانت الفردوس مسکنہ — ماذا تحمل من بؤس و اقتار

(۲) تراہ یمشی کئیبًا خائفًا وجلا — الی المساجد یمشی بین اطمار

(۳) یا نفس مالک من صبر علی لھب — قد حان ان تقبلی من بعد ادبار

ترجمہ (۱) مشقت و تنگدستی برداشت کرنا اسے کوئی مضر و نقصان دہ نہیں جس کا مسکن اور جائے قرار جنت فردوس ہے۔

(۲) ایسا شخص دنیا میں غمناک، خائف اور آخرت میں پیش آنے والے معاملے سے ڈرتا رہتا ہے۔ عجز و مسکنت کا لباس زیب تن کیے ادائے نماز کے لیے مسجد کی طرف اس کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔

(۳) اے نفس! تجھے آتش دوزخ کے شعلے برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اور اعمال بد کی وجہ سے قریب ہے کہ بعد از صد ذلت و خواری تجھے وہ عذاب برداشت کرنا پڑے۔

میں کہتا ہوں جب مدارِ عبودیت دو چیزوں پہ ہے: ایک طاعت کی بجا آوری۔ دوم گناہ اور معصیت سے اجتناب۔ اور مقصد اس نفس امارہ کی موجودگی میں صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اسے ترغیب و ترہیب اور امید و خوف کے ذریعے اس طرف متوجہ رکھا جائے۔ کیونکہ سرکش حیوان اسی وقت قابو میں رہتا ہے جب ایک آگے سے کھینچنے والا ہو اور ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہو۔ یہ حیوان جب اپنی پسند کا چارہ چرنے لگتا ہے اور تو اسے ایک ڈنڈا رسید کرتا ہے اور روکتا ہے۔ اتنے میں دوسری جانب سبز چارہ نظر آتا ہے تو وہ ادھر متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تو پوری ہوشیاری اور احتیاط سے اسے روکتا ہے، تب جا کر وہ رُکتا ہے۔ اور سرکش بچہ تعلیم کی طرف صرف اس صورت میں توجہ کرتا ہے کہ اس کے والدین اسے کسی طرح کا لالچ دیں، اور معلم اپنے رعب اور دبدبے کے نیچے رکھے۔

بعینہ یہی حالت اس نفس امارہ کی ہے۔ یہ بھی ایک سرکش حیوان ہے جو اپنی شہوات کی چراگاہ میں

رہنے کا سخت مشتاق ہے۔ خوف اس کے لیے ڈنڈا اور ہانکنے والے کا کام دیتا ہے اور امید ثواب و نجات اس کے لیے سبز جو ہیں جس سے طاعت کی طرف راغب ہوتا ہے نیز نفس امارہ سرکش بچے کی مانند ہے، جسے عبادت و تقویٰ کی کتاب پڑھانی مقصود ہے۔ آتش دوزخ اور عذاب کا ذکر تو اس میں ڈر پیدا کرتا ہے۔ اور جنت اور ثواب اعمال اس میں امید و رغبت پیدا کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ریاضت و عبادت کے لیے ضروری ہے کہ نفس میں خوف و رجاء کا شعور پیدا کرے۔ ورنہ یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ نفس تقویٰ و عبادت کی کتاب پڑھنے پر آمادہ ہو جائے اور تم سے موافقت اختیار کرلے۔ طالب عبادت میں یہی شعور پیدا کرنے کے لیے قرآن مجید میں بار بار اور مبالغے کی حد تک وعدہ وعید اور ترغیب و ترہیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ ثواب کا اس پیرایہ میں ذکر کیا کہ خواہ مخواہ کشش پیدا ہوتی ہے۔ اور عذاب الیم کا اس تفصیل سے ذکر کیا کہ اس کے برداشت کی انسان میں طاقت اور ہمت نہیں۔ لہٰذا تم پر ضروری ہے کہ خوف و رجا۔ کو پیش نظر رکھو تاکہ عبادت کی بجا آوری کی مراد حاصل ہو سکے اور اس راہ میں مشقت و تکلیف برداشت کرنے میں آسانی ہو ——— واللہ تعالیٰ ولی التوفیق بفضلہ و رحمتہ

سوال: خوف و رجا کی حقیقت و ماہیت اور ان کا حکم و نتیجہ کیا ہے؟

جواب: خوف و رجا ہمارے علماء اہل سنت کے نزدیک قبیلہ خواطر میں سے ہیں۔ بندے کی قدرت میں صرف یہی ہے کہ وہ خوف و رجاء کے مقدمات کو عمل میں لائے۔ چنانچہ خوف کی تعریف یہ کی گئی ہے:

الخوف رعدۃ تحدث فی القلب عن ظن مکروہ ینالہ۔

خوف اس ڈر اور لرزے کا نام ہے جو کسی بری چیز کے پہنچنے کے گمان سے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

خشیت بھی خوف جیسی کیفیت کا نام ہے لیکن خشیت کے مفہوم میں جس سے خوف ہوتا ہے اس کی ہیبت اور عظمت کا تصور بھی شامل ہے۔ خوف کے مقابل جرات ہے۔ بعض دفعہ خوف کے مقابلہ میں امن بھی آتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں خائف و آمن۔ اور خوف و امن۔ کیونکہ آمن یعنی بے خوف وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے متعلق لاپرواہی اور بے باکی کا مظاہرہ کرے۔ لیکن حقیقۃً خوف کے مقابل جرات ہی ہے۔

اپنے اندر خوف پیدا کرنے کے چار مقدمات اور اسباب ہیں:

(۱) اپنے گزشتہ گناہوں کو یاد کرنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی اس شدت وسختی کو یاد کرنا جسے برداشت کرنے کی تم میں سکت نہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے عذاب کے آگے اپنے ضعف وناتوانی اور اپنی کمزوری کو یاد کرنا۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی قدرت وطاقت کو یاد رکھنا کہ وہ جب چاہے، جیسے چاہے گرفت کر سکتا ہے۔

رجاء کی تعریف یہ کی گئی ہے:

هو ابتهاج القلب بمعرفة فضل الله سبحانه واستروحة الى سعة رحمة الله تعالىٰ

یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کو پہچان کر دل میں خوشی محسوس کرنا اور اس کی رحمت کے دامن میں راحت حاصل کرنے کا تصور۔

رجاء کا یہ مفہوم ومعنی خواطر میں سے ہے اور بندے کی قدرت سے باہر ہے۔ ہاں رجاء بایں معنی

هو تذكر فضل الله تعالىٰ وسعة رحمته

اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی وسعت رحمت کو یاد کرنا، بندے کی قدرت میں ہے۔

خطرات وحوادث کے متعلق یہ ارادہ اور عقیدہ رکھنا کہ بے مشیت الٰہی ان سے ضرر ونقصان نہیں پہنچ سکتا، اس کو رجاء کہا گیا ہے۔ رجاء کے اس بیان میں ہمارے نزدیک پہلا معنی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کو یاد کر کے مسرت وراحت محسوس کرنا۔

رجاء کی ضد یاس (ناامیدی) ہے۔ ناامیدی اور یاس کی یہ تعریف کی گئی ہے:

هو تذكر فوات رحمة الله وفضله وقطع القلب عن ذلك۔

اس خیال کو کہ مجھے خدا کی رحمت اور اس کا فضل نہیں پہنچے گا۔ نیز دل کو رب تعالیٰ کے فضل ورحمت کی امید سے الگ کر لینے کو یاس کہتے ہیں۔

اس طرح کی ناامیدی محض گناہ ہے۔ اور جب رجا کا تصور پختہ کرنے کے بغیر ناامیدی اور یاس کا قلع قمع کرنا دشوار ہو تو ایسی صورت میں رجا فرض ہے۔ اور اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو رجا نفل ہے جبکہ اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور وسعت رحمت کا عقیدہ دل میں مضبوط اور پختہ ہو۔

رجاء چار چیزوں سے پیدا ہوتی ہے:

(۱) بندے کی طرف سے بغیر کسی سفارش کنندہ اور بغیر کسی رغبت وطلب کے بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف

کیے گئے انعامات واحسانات سابقہ کو یاد کرنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنی شان رحیمی وکریمی کے مطابق عظیم عزّ و جل اور بڑے اجر وثواب کے جو وعدے کیے ہیں ان کو ذہن میں رکھنا۔ اس اجر وثواب کو ذہن میں نہ رکھنا جس کے تم اپنے اعمال کے عوض مستحق ہو سکتے ہو۔ کیونکہ اجر وثواب اگر بندے کے افعال واعمال کی حیثیت کے مطابق ملے تو وہ بالکل قلیل وحقیر ہوگا۔

(۳) استحقاق کے بغیر اور بے مانگے دین و دنیا کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ جو مختلف الاقسام نعمتیں فی الحال عطا کر رہا ہے ان کو یاد کرنا۔

(۴) یہ تصور کہ حق تعالیٰ کی رحمت ومہربانی اس کے غضب اور اس کی گرفت پر غالب ہے۔ اور یہ تصور کہ خداوند قدوس رحمٰن رحیم غنی کریم اور اپنے بندہ مومن پر نہایت شفیق ہے۔ جب تم خوف ورجا دونوں کے مطابق تصورات وخیالات کو ذہن میں رکھو گے تو تم میں ہر وقت خوف ورجا کی کیفیات بیدار رہیں گی —— واللہ تعالیٰ ولی التوفیق بمنہ وفضلہ۔

فصل

تو اے بندے! تجھ پر پوری احتیاط، پورے دھیان اور پوری رعایت کے ساتھ خوف ورجا کی اس گھاٹی کو طے کرنا ضروری ہے۔ احتیاط کی اس لیے ضرورت ہے کہ یہ گھاٹی نہایت دشوار گزار ہے۔ اس میں طرح طرح کے خطرات ہیں۔ کیونکہ خوف ورجا کی اس گھاٹی کا راستہ دو مہلک اور خوفناک راستوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ سے بالکل بے خوف ہو جانے کا راستہ اور دوسرا اس سے بالکل مایوس ہو جانے کا راستہ۔ ان دونوں ٹیڑھی راہوں کے درمیان خوف ورجا کا راستہ ہے۔ اگر رجا اس قدر غالب ہو گئی کہ خدا تعالیٰ کا خوف بالکل نہ رہا تو یہ بھی غلط راہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۔	اللہ تعالیٰ کی تدبیر گرفت سے صرف خسارہ اٹھانے والے لوگ ہی بے خوف اور بے ڈر ہوتے ہیں۔

اور اگر خوف اس قدر غالب ہوا کہ دل سے امید رحمت وبخشش کا نام ونشان مٹ گیا تو یہ ناامیدی اور مایوسی کا راستہ ہے اور یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا يَيْأَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ ۔ — اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں ۔

لیکن اگر تم خوف ورجاء کے درمیان چلے اور دونوں کا دامن پکڑا تو یہی وہ صراط مستقیم ہے جو اس کے ان اولیاء واصفیاء کا راستہ ہے جن کی اس نے اپنی کتاب میں یوں صفت فرمائی ہے :

إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ ۔ — بیشک وہ نیک کاموں کی بجا آوری میں جلدی کرتے تھے اور خوف و ڈر کی حالت میں ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے سامنے جھکے رہتے تھے ۔

جب تمہیں معلوم ہوگیا کہ اس گھاٹی میں تین مختلف راستے ہیں :

(۱) راستہ امن و بے باکی (مکمل بے خوفی) ۔

(۲) ناامیدی اور مایوسی کا راستہ ۔

(۳) ان دونوں راہوں کے درمیان خوف ورجا کا راستہ ۔

تو اگر تم ذرا بھی دائیں یا بائیں ہوئے تو دو مہلک راستوں میں جا پڑو گے ۔ اور ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو جاؤ گے ۔

پھر صورت حال یہ ہے کہ بے خوفی اور مایوسی کے دونوں راستے درمیانے راستے کی نسبت زیادہ کشادہ ہیں ۔ اور ان کی طرف بلانے والوں کی کثرت ہے ۔ اور درمیانی راستے کی نسبت ان دو پر چلنا زیادہ سہل اور آسان ہے ۔ کیونکہ اگر تم جانب امن (بے خوفی) کی طرف نظر دوڑاؤ گے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت، اس کے بے پایاں فضل و کرم اور اس کی بخشش اور جود کے وہ سمندر نظر آئیں گے کہ خوف و ڈر کا شائبہ بھی دل میں باقی نہیں رہے گا ۔ تو اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرکے بے خوف ہو کر بیٹھ جاؤ گے ۔

اور اگر جانب خوف کی طرف دیکھو گے تو تمہیں خدا تعالیٰ کی عظیم قدرت، غالب سیاست، کثرت ہیبت، معاملہ حساب و کتاب کی نزاکت، اپنے ولیوں اور برگزیدہ بندوں کی بطور عتاب گرفت کے وہ لرزہ خیز واقعات و حالات سامنے آئیں گے کہ رجا باقی نہیں رہے گی تو مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جاؤ گے

لہٰذا ایسی صورت حال کے پیش نظر تم پر یہ بھی ضروری ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت پر ہی انحصار نہ کرو تاکہ اس کی رحمت پر بھروسہ کرکے بالکل بے خوف نہ ہو جاؤ ۔ کہ یہ بھی غلط ہے ۔ اور نہ

اس کی عظیم ہیبت اور آخرت میں سخت کھود کرید پر ہی نظر رکھو کیونکہ اس طرح تم قنوطیت اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ گے۔ بلکہ دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھو۔ کچھ حصہ خوف کا لو اور کچھ رجاء کا۔ پھر ان دونوں کے کندھے پر سوار ہو کر اس باریک راہ پر چلو تاکہ بھٹکنے سے محفوظ رہو۔ کیونکہ صرف رجاء کا راستہ بہت آسان اور سہل ہے اور بڑا وسیع اور کشادہ ہے لیکن اس کی منزل اور انتہا عذابِ خدا سے بالکل بیخوفی اور خسارہ ہے۔ اسی طرح صرف خوف کا راستہ بھی اگرچہ بڑا وسیع و عریض ہے لیکن اس کا انجام ضلالت و گمراہی ہے۔ اور اعتدال کا راستہ خوف اور رجاء کے درمیان ہے۔ اور یہ درمیانی راستہ اگرچہ دشوار گزار ہے لیکن ہر خطرہ سے محفوظ اور بالکل واضح اور صاف ہے۔ جو غفران اور احسان اور جنت و رضوان اور لقاء الٰہی تک لے جاتا ہے۔ کیا تم نے خوف و رجاء کے راستہ پر چلنے والوں کے متعلق خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک نہیں سُنا؟ :

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا — وہ اپنے پروردگار کو خوف و امید کی حالت میں پکارتے ہیں۔

پھر ان کی جزا کے متعلق فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ — کوئی انسان نہیں جان سکتا آنکھوں کی اُس ٹھنڈک کو جو خوف و رجاء کی راہ پر چلنے والوں کیلیے ان کی جزا کے طور پر (آخرت میں) پوشیدہ رکھی ہوئی ہے۔

اس جملہ قرآنی پر پوری طرح غور کرو۔ پھر اس راہ پر چلنے کے لیے پوری طرح مستعد و بیدار ہو جاؤ کیونکہ خوف و رجاء کا مقام حاصل کرنا آسان نہیں۔

پھر یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ اس راہ پر چلنا اور سُست اور سرکش نفس کو اس کی محبوب چیزوں سے ہٹا کر طاعات اور اعمالِ صالح میں لگانا جو اسے بڑا ناگوار ہے اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک تین اصول ذہن میں نہ رکھے جائیں۔ اور جب تک غفلت اور سُستی کے بغیر لگاتار دائماً ان اصولوں کی حفاظت و نگہداشت نہ کی جائے۔ وہ تین اصول یہ ہیں :

(۱) ترغیب و ترہیب کے متعلق خدا تعالیٰ کے ارشادات۔

(۲) گرفت یا معاف کرنے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا دستور۔

(۳) آخرت میں نیک لوگوں کے ثواب اور بُرے لوگوں کے سزا و عذاب کو یاد رکھنا۔

ان تین اصولوں کی کما حقہٗ تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہیں۔ ہم نے اس باب میں ایک مستقل کتاب "تنبیہ الغافلین" تصنیف کی ہے۔ اور اس مختصر کتاب میں ہم صرف ان کلمات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو ذہن نشین کر لینے کے بعد مقصود سے ان شاء اللہ تعالیٰ واقف ہو جاؤ گے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اصلِ اوّل

ترغیب و ترہیب کے متعلق خدا تعالیٰ کے ارشادات

اے برادرِ عزیز! تجھے ان آیات میں ضرور تدبر اور غور کرنا چاہیے جن میں خدا تعالیٰ نے ترغیب و ترہیب اور خوف و رجاء کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ رجا کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط	اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دے گا۔
وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ۔	اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون گناہ بخشنے والا ہے؟ اللہ تعالیٰ گناہ بخشتا ہے اور توبہ قبول کرتا ہے۔
وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْ عَنِ السَّيِّاٰتِ۔	وہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی غلطیاں معاف کرتا ہے۔
كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔	تمہارے پروردگار نے رحمت و بخشش اپنے ذمے لے رکھی ہے۔
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ۔	میری رحمت ہر شے کو وسیع ہے میں عنقریب اپنی رحمت ان لوگوں کے لیے مخصوص کروں گا جو متقی ہیں
اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔	بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر مہربان اور شفیق ہے
وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝	وہ مومنوں پر مہربان ہے۔

ان مذکورہ آیات اور اس طرح کی دیگر بہت سی آیات میں رجاء کا بیان ہے۔

خوف اور ہیبت کی آیات:

يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝	اے میرے بندو! مجھ سے ڈرو۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۔
کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۔
کیا انسان یہ گمان کیے بیٹھا ہے کہ اس کی باز پرس نہیں ہوگی؟

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۔
آخرت میں نجات کا معاملہ تمہاری اور اہل کتاب کی امیدوں کے ماتحت نہیں۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔
جو شخص بھی برائی کرے گا تو اس کا بدلہ پائے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ملے گا۔

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۔
اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ بہت ہی اچھے کام کر رہے ہیں۔

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۔
اور ان کے سامنے اللہ کی طرف سے عذاب کا وہ نمونہ ظاہر ہوگا جس کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۔
قیامت میں ہم ان کے اعمال کی طرف آئیں گے تو انہیں قبول کرنے کے بجائے ذرات بنا کر اڑا دیں گے اور بالکل نیست و نابود کر دیں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے دامن رحمت میں جگہ دے اور بداعمالیوں سے بچائے۔

چند وہ آیات مبارکہ جن میں خوف و رجاء دونوں کا بیان ہے:

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ
میرے بندوں کو بتا دو کہ میں ہی غفور و رحیم ہوں۔

اس کے متصل بعد فرمایا:

وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ
بیشک میرا عذاب بڑا سخت عذاب ہے۔

عذاب کا ذکر ساتھ ہی اس لیے فرمایا تاکہ بندے پر صرف رجاء کا ہی غلبہ نہ ہو جائے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ایک جگہ جہاں یہ فرمایا:

شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ وہ سخت گرفت کرے گا۔

وہاں اس کے متصل بعد یہ بھی فرمایا:

ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ وہ بڑا زور آور ہے۔ اس کے سوا کوئی ہستی لائق عبادت نہیں۔

"تاکہ بالکل خوف کا غلبہ ہی نہ ہو جائے۔

اس سلسلے میں اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ کا عجیب ترین قول یہ ہے کہ پہلے فرمایا:

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ط اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ ہی فرما دیا:

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ اور اللہ بندوں پر شفیق و مہربان بھی ہے۔

اور اس سے بھی عجیب تر یہ قول ہے:

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ۔ جو شخص رحمٰن کو بے دیکھے اس سے ڈرتا رہا۔

کہ خشیت کے ساتھ اپنا ذکر اسم جبار یا منتقم یا متکبر سے نہ کیا جو خشیت کے لحاظ سے موقع کے مناسب تھا۔ بلکہ خشیت کو رحمٰن سے معلق فرمایا" تاکہ خشیت اور رحمت کا ذکر ہو جائے۔ کہ دل صرف ذکر خشیت سے فنا ہی نہ ہو جائے۔ لہٰذا ڈرانے کے ساتھ ساتھ امن دینے کا تذکرہ کیا اور تحریک کے ساتھ ساتھ تسکین کا ذکر بھی کر دیا۔

اس آیت کے مضمون کی مثال یوں ہے کہ تم کسی کو کہو "تم اپنی مہربان ماں سے کیوں نہیں ڈرتے" یا "تم اپنے مشفق باپ سے کیوں خوف نہیں کھاتے"۔ یا "تم رحمدل حاکم سے کیوں نہیں ڈرتے"۔ اس قسم کی گفتگو سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ خوف و امن کا درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور بالکل مایوسی یا بالکل بے خوفی سے دور رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و کرم سے ہمیں اور تمہیں اس ذکر حکیم میں تدبر اور اس پر عمل کرنے والوں سے کرے۔ بے شک وہ بڑا جواد و سخی، اور کریم ہے

ولاحول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم۔

دوسری اصل

اللہ تعالیٰ کے افعال و معاملات کے بیان میں

اے عزیز! مندرجہ ذیل واقعات کا مطالعہ خوف پیدا کرنے کے لیے کافی ہے:

(۱) ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی اسی ہزار برس عبادت کی اور ایک قدم کی مقدار بھی اس نے ایسی جگہ باقی نہ چھوڑی جس پر اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ پھر اس نے صرف ایک حکم کی نافرمانی کی تو اس کو اپنی درگاہ سے مردود کر دیا اور اس کی اسی ہزار برس کی عبادت اس کے منہ پر مار دی۔ اور قیامت تک اس کے گلے میں طوقِ لعنت ڈال دیا۔ اور اس کے لیے ابدالآباد تک عذابِ الیم میں جلنا مقرر کر دیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا کہ ابلیس کے حال سے عبرت گیر ہو کر کعبہ شریف کے پردہ سے لپٹ کر نہایت گریہ و زاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ دعا کر رہے ہیں:

الٰھی وسیدی لا تغیر اسمی ولا تبدل جسمی۔ — اے میرے اللہ! اور اے میرے مالک! کہیں میرا نام نیکوں کی لسٹ سے مٹا کر بدوں کی لسٹ میں نہ کر دینا اور کہیں میرا جسم اہل عطا کے زمرہ سے نکال کر اہل عقاب کے گروہ میں نہ کر دینا۔

(۲) سیدنا حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام خدا تعالیٰ کے وہ برگزیدہ نبی ہیں جن کو اللہ نے براہ راست اپنے دستِ قدرت سے بنایا۔ پھر ان کا اعزاز ظاہر کرنے کے لیے اپنے تمام ملائکہ کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ پھر ان کو ملائکہ کی گردنوں پر اٹھا کر اپنے پڑوس میں اپنی وسیع اور آرام دہ جنت میں جگہ عطا کی۔ پھر صرف ایک دانہ چکھنے سے ان سے وہاں رہنے کی نعمت چھین لی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی:

الا لا یجاورنی من عصانی۔ — سُن لے! وہ شخص میرے پڑوس میں رہنے کے لائق نہیں جو میری نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اور جو ملائکہ آپ کو نوری تخت پر بٹھا کر جنت میں لائے تھے انہی کو حکم دیا کہ آدم کو اوپر کے آسمان سے نیچے کے آسمان کی طرف دھکیل دو اور اسی طرح ان کو زمین پر لے جاؤ۔ یہاں تک کہ انہی ملائکہ نے آپ کو زمین پر لا ڈالا۔ پھر آپ کی توبہ قبول نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ آپ مسلسل دو سو برس

روتے رہے۔ اور اس سلسلے میں آپ کو بے انتہا مشقت اور تکلیف جھیلنی پڑی۔ پھر اس مشقت اور رنج کے اثرات آپ کی اولاد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ گئے۔

(۳) حضرت نوح علیٰ جمیع الانبیاء الصلوٰۃ والسلام جو شیخ الانبیاء ہیں آپ نے اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں کس قدر شدید مشقتیں اور تکالیف برداشت کیں آپ کے منہ سے جب صرف ایک کلمہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف نکلا تو خدا تعالیٰ نے فوراً فرمایا:

فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۖ إِنِّيْ أَعِظُكَ أَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ۔
آپ مجھ سے ایسی بات کی ہرگز درخواست نہ کریں جس کا آپ کو پتہ نہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ نادان لوگوں میں سے نہ ہوں۔

روایات میں آیا ہے کہ اس کے بعد شرم و حیا کے باعث چالیس سال آپ نے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر نہ دیکھا۔

(۴) پھر سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صرف ایک نامناسب کلمہ صادر ہوا تو اس کے باعث آپ کو کس قدر خوف لاحق ہوا۔ اور کس قدر عجز و تضرع سے کام لیا چنانچہ یوں کہا:

وَالَّذِيْ أَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۔
وہ ذات جس سے مجھے امید ہے کہ وہ میری خطا بخش دے گا۔

روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ آپ اس قدر روئے تھے کہ اللہ تعالیٰ تسلی دینے کے لیے حضرت جبریل علیہ السلام کو آپ کے پاس بھیجتا تھا۔ حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام لاتے تھے:

یا ابراهیم هل رایت خلیلا یعذب
اے ابراہیم! تو نے کبھی ایسا دوست دیکھا ہے جو

ؔ ایک قول یہ ہے کہ خطا سے مراد انی سقیم، بل فعلہ کبیرھم، ھذا ربی اور بیوی کو ھی اُختی کے الفاظ ہیں لیکن درحقیقت یہ الفاظ آپ نے توریے اور تعریض کے طور پر کہے جو خطا میں داخل نہیں بلکہ جائز اور درست ہیں۔ ان پر طلب مغفرت کی ضرورت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء کرام کا اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا تعلیمِ اُمت اور تواضع و انکساری کے طور پر ہوتا ہے"۔
(مدارک، ج ۳۔ ص ۱۸۷، اسی آیت کے تحت) مترجم۔

خلیله بالنار؟ — اپنے دوست کو آگ کے عذاب میں ڈالے؟

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت جبریل کو جواب میں کہتے تھے:

یا جبریل اذا ذکرت خطیئتی نسیت خلتہٗ۔ — اے جبریل! جب مجھے اپنی خطا یاد آتی ہے تو خوف کے باعث اللہ کے ساتھ رشتہ دوستی بھول جاتا ہے۔

(۵) حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صرف اتنا ہوا کہ آپ نے تنبیہ کے طور پر ایک کافر قبطی کو چپیڑ ماردی۔ لیکن اس فعل پر آپ کے دل میں خدا تعالیٰ کا کس قدر خوف و ڈر پیدا ہوا اور آپ نے کس قدر گریہ وزاری اور استغفار سے کام لیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں وارد ہے کہ آپ نے جناب خداوندی میں عرض کیا:

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ۔ — اے میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے۔

(۶) حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے ایک شخص بلعم بن باعوراء کا واقعہ بھی یاد کر۔ گمراہ ہونے سے پہلے اس کی حالت یہ تھی کہ جب وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو اس کی نظر عرش عظیم تک پہنچتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت میں اسی کا تذکرہ کیا ہے:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا۔ — ان کو اس شخص کا واقعہ سناؤ جسے ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں تو وہ ان سے نکل گیا (ان کے خلاف چل پڑا)۔

اور یہ گمراہی و ضلالت اس پر صرف اس وجہ سے مسلط ہو گئی کہ وہ دنیا اور اہلِ دنیا کی طرف جھک گیا۔ اور صرف ایک موقع پر اللہ تعالیٰ کے دوستوں میں سے ایک دوست کی عزت و حرمت قائم نہ رکھی، تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی معرفت چھین لی اور اسے دھتکارے ہوئے کتے کی طرح کر دیا۔ چنانچہ اس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا:

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ۔ — تو اس کا حال کتے کی طرح ہو گیا کہ اگر تو اس پر حملہ آور ہو تو زبان نکال لے الخ۔

تو صرف ایک بار اللہ تعالیٰ کے دوست کی بے ادبی کرنے اور ایک بار دنیا کی طرف جھکنے کی پاداش میں اسے ہلاکت اور ضلالت کے سمندر میں ہمیشہ کے لیے غرقاب کر دیا گیا۔

میں نے بعض علماء سے سنا ہے کہ گمراہ ہونے سے قبل بلعم بن باعوراء کی مجلس علم میں صرف ایک وقت میں بارہ بارہ ہزار دینی طالب علم ہوتے تھے جو ہاتھوں میں قلم دوات لیے اس کے معرفت سے لبریز ملفوظات قلمبند کرتے تھے۔ پھر گمراہی کے بعد وہ اس حالت کو پہنچا کہ انکار خدا ﷻ مسئلہ پر سب سے پہلے اس نے کتاب تصنیف کی۔ ہم اللہ تعالیٰ کے غصّے، اس کی ناراضگی اس کے عذاب الیم، اور اس کی طرف سے مسلط ہونے والی ذلت و خواری سے بار بار پناہ پکڑتے ہیں۔ تو تم غور کرو کہ دنیا کی نجاست اور نحوست عوام تو کجا، بڑے بڑے علماء کو ضلالت و گمراہی کے گہرے غار میں کہاں تک دھکیل کر لے جاتی ہے۔ لہٰذا بیدار اور ہوشیار بنو۔ کیونکہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، اور عمر مختصر ہے، اور اعمال خامیوں سے لبریز ہیں، اور اعمال کو جانچنے والا بڑا صاحب بصیرت ہے۔ اگر وہ اچھے اعمال پر ہمیں خاتمہ نصیب فرمائے اور ہماری لغزشوں کو معاف کر دے تو اسے کوئی مشکل اور دشوار نہیں۔

(۷) پھر سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام سے جو زمین میں خدا تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ تھے، صرف ایک لغزش کا صدور ہوا تو خوف الٰہی سے اس قدر روئے کہ اُن کے آنسوؤں سے زمین سے سبزہ اُگ آیا۔ آپ بارگاہ خداوندی میں یوں عرض کرتے تھے:

الٰهی ترحم بکائی و تضرعی۔ — اے اللہ! میری اس گریہ وزاری کو دیکھ اور مجھ پر رحم فرما

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا:

یا داؤد نسیت ذنبك وذكرت بكاءك — اے داؤد! تجھے اپنی لغزش تو بھول چکی ہے، مگر تجھے اپنا رونا یاد ہے۔

منقول ہے کہ چالیس روز تک اور بعض روایات کے مطابق چالیس سال تک آپ کی توبہ قبول نہ ہوئی۔

(۸) پھر سیدنا حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صرف اتنی بات صادر ہو گئی کہ آپ ایک دفعہ بے محل غصّہ میں آ گئے، تو سمندر کی گہرائیوں میں چالیس روز تک مچھلی کے پیٹ میں قید

کردیے گئے۔ وہاں آپ یہ تسبیح پڑھتے اور خدا کو ندا کرتے تھے:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ — نہیں کوئی معبود مگر تو ہی، پاک ہے تو۔ بے شک میں ظالموں سے تھا۔

فرشتوں نے آپ کی آواز سنی اور عرض کیا "اے اللہ العالمین! آواز تو پہچانی جاتی ہے مگر اس کا مقام اور اس کی جگہ معلوم نہیں ہوتی۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ میرے بندہ یونس کی آواز و پکار ہے۔ اس پر فرشتوں نے سفارش کی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام مبارک یونس لینے کے بجائے ذوالنون کے نام سے آپ کا ذکر کیا۔ اور اس قصہ کو یوں بیان فرمایا:

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ۔ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۔ — تو یونس کو مچھلی نے نگل لیا اور آپ اس وقت اپنے آپ کو کوستے تھے۔ تو اگر آپ اس وقت تسبیح میں مصروف نہ ہوتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں ہی بند رہتے، باہر نہ آسکتے۔

اس بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام پر اپنی نعمت اور اپنے احسان کا ذکر یوں فرمایا ہے:

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۔ — اگر اس کے رب کی نعمت اس کے شامل نہ ہوتی تو اسے مچھلی کے پیٹ سے ایک چٹیل جگہ میں پھینک دیا جاتا۔ اور مقام مدح سے دور کر دیا جاتا۔

لہٰذا اے عزیز! خدا تعالیٰ کی اس روش کو غور سے دیکھ اور اس سے ڈر۔

(۹) پھر رب تعالیٰ نے خود اس ہستی کو جسے تمام انبیاء پر سیادت و فضیلت اور اس کی اپنی درگاہ میں سب سے زیادہ مکرم و محترم ہونے کا مقام حاصل ہے، یوں خطاب فرمایا:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۔ — اے نبی! تو بھی ہمارے احکامات کی بجا آوری میں استقامت دکھا اور وہ بھی جو تیرے ساتھ ہماری طرف رجوع کر چکے ہیں (اہل ایمان)۔ اور سرکشی کے راستہ پر مت چلو۔ بیشک وہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اس حکم خداوندی کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

شیبتنی هود واخواتها — مجھے سورۃ ہود اور اس کی طرح دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں حضور علیہ السلام کی اس سے یہ آیت اور اسی طرح کی دوسری آیات مراد ہیں۔

قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم بھی دیا:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ۔ — اپنی لغزشوں کے لیے بخشش طلب کرتے رہو۔

اس حکم کے مطابق حضور علیہ السلام مسلسل استغفار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ — اور ہم نے آپ سے وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ دی تھی۔

نیز یہ آیت بھی نازل ہوئی:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ — تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی گزشتہ اور آئندہ لغزشیں درگزر فرما دے۔

اس طرح کی آیات کے نزول کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ حالت تھی کہ آپ سوتے نہیں تھے بلکہ ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے قدم مبارک ورم کر آئے۔ صحابہ کرام تعجب و حیرت سے سوال کرتے تھے:

أَتَفْعَلُ هٰذَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ — یا رسول اللہ! آپ اتنی زیادہ عبادت کرتے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی گزشتہ اور آئندہ ہر طرح کی لغزشیں (اگر ان کا وجود فرض کر لیا جائے) درگزر فرما دی ہیں۔

تو آپ جواب میں فرماتے تھے:

افلا اکون عبدا شکورا؟ — کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ بھی فرمایا کرتے تھے:

لو انی وعیسیٰ اوخذنا بما کسبت — اگر میری اور عیسیٰ کی ان اعمال پہ گرفت ہوتی جو

ھا تان تعذبنا عذابا لم یعذب بہ	ہم سے صادر ہو چکے ہیں تو ہم ایسے عذاب میں مبتلا
احد من العالمین ۔	جاتے جو سب سے زیادہ سخت ہوتا۔

آپ ساری ساری رات نماز پڑھتے رہتے تھے اور روتے رہتے تھے اور زبان مبارک سے یہ دعا کرتے تھے :

اعوذ بعفوک من عقابک وبرضاک	اے اللہ! میں تیرے عذاب سے تیری معافی کی پناہ میں
من سخطک واعوذ بک منک	آتا ہوں اور تیرے غصے سے تیری رضا کی پناہ میں
لا احصی ثناء علیک انت کما	آتا ہوں اور تجھ سے تیری پناہ میں آتا ہوں میں تیری
اثنیت علی نفسک	ثنا ہرگز نہیں کر سکتا۔ تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے خود
	اپنی ثنا کی ہے۔

بعد صحابہ کرام سے جن کا زمانہ بعد کے زمانوں سے بہتر تھا اور جو تمام امت سے افضل تھے آپس میں صرف ایک دفعہ کہیں ہنسی مذاق کا واقعہ رونما ہو گیا تو فوراً یہ آیت نازل ہوئی :

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ	کیا اہل ایمان کے لیے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا
قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ الآیۃ	کہ ان کے دل پورے خشوع کے ساتھ ذکر الٰہی کی طرف
	متوجہ ہو جائیں

پھر اللہ تعالیٰ نے اس امت کے مرحومہ ہونے کے باوجود جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی تنبیہ و تادیب کے لیے سزائیں اور تدابیر مقرر کر دی ہیں۔

حضرت یونس ابن عبید کہا کرتے تھے کہ اگر یہاں کسی کے پانچ درہم چوری کرنے سے تمہارا بہترین عضو (ہاتھ) کٹ سکتا ہے تو وہاں آخرت میں تم کو عذاب سے بھی بے فکر نہیں ہونا چاہیے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے ہر وقت التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ اپنے کرم و فضل کے مطابق سلوک کرے انہ ھو ارحم الراحمین۔

رجا سے متعلق چند واقعات :

مقام رجا کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔ رحمت خداوندی کا تذکرہ کرنا ایک اچھی بات ہے۔ اس میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا بیان اور اس کی

نہایت و غایت اس سے ظاہر و عیاں ہے کہ وہ ایک گھڑی کے ایمان سے ستر برس کے کفر کو اڑا دیتا ہے۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا:

قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ

اے نبی! کفار سے کہہ دے کہ اگر یہ لوگ اب بھی باز آجائیں تو ان کے گزشتہ تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

تم فرعون کے جادوگروں کے واقعہ کو نہیں دیکھتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جنگ اور مناظرہ کرنے کے لیے آئے تھے، اور خدا کے دشمن فرعون کی عزت کی قسم کھائی تھی، اور مقابلے پر تُل گئے تھے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف ایک معجزہ دیکھا تو عرفان حق نصیب ہو گیا اور بول اُٹھے:

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے۔

ان جادوگروں کے متعلق یہ ذکر کہیں نہیں آیا کہ انہوں نے ایمان کے علاوہ نیک اعمال بھی کیے تھے۔ محض ایمان قبول کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں بار بار مدح اور ثنا کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے، اور ان کے سابقہ صغائر و کبائر ایک گھڑی بھر بلکہ ایک لحظہ بھر کے ایمان کی برکت سے معاف کر دیے۔ انہوں نے صدق دل سے صرف اتنا کہا تھا کہ "ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ اخلاص کے ساتھ صرف اتنے الفاظ کہنے سے اللہ تعالیٰ نے ان کی روحانیت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور ان پر اپنی بے شمار نعمتوں کی بارش کر دی۔ اور قیامت میں ہمیشہ کے لیے ان کو شہداء کا سردار بنا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان لوگوں پر کرم نوازی کا حال ہے جنہیں صرف ایک لحظہ کے لیے اس کے عرفان اور اس کی توحید پر قائم رہنے کا موقع ملا۔ حالانکہ ان کی سابقہ زندگی جادوگری، کفر، گمراہی اور شر و فساد میں گزری تھی۔ تو ان لوگوں پر خدا تعالیٰ کی عنایات کس قدر ہوں گی جن کی زندگی توحید پر استقامت اور عبادت میں گزر گئی۔ اور دونوں جہان میں اپنے تمام معاملات اسی سے وابستہ رکھے۔

اصحاب کہف کے واقعہ پر غور کرو، کہ عرصہ دراز تک یہ لوگ حالت کفر میں رہے۔ پھر ان کو یکایک توحید و ایمان کی توفیق نصیب ہو گئی۔ قرآن مجید میں ہے:

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ

جب وہ لوگ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ہمارا رب

وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِہٖ اِلٰهًا۔ — وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے ہم اس کے سوا کسی اور معبود کی ہرگز عبادت نہیں کریں گے۔

اور پھر جب وہ حق تعالیٰ کی طرف ملتجی ہوئے تو اس نے ان کو فوراً مقبول بندوں کا مقام عطا فرمایا۔ اور انہیں روحانی نعمتوں کے ساتھ نوازا۔ پھر ان کا نہایت اعزاز و اکرام فرمایا۔ چنانچہ قرآن مجید میں وارد ہے:

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ۔ — ہم خود ان کی دائیں بائیں کروٹیں بدلتے ہیں۔

نیز خدا تعالیٰ نے ان کی عزت و حرمت قائم اور محفوظ رکھنے کے لیے ان کو دہشت اور ہیبت کا لباس پہنا دیا۔ کہ کوئی ان تک پہنچ نہ سکے۔ یہاں تک کہ ان کے رعب و ہیبت کے متعلق اکرم الخلق یعنی حضور علیہ السلام کو فرمایا:

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ — اگر آپ ان کو جھانک کر دیکھیں تو دہشت کے باعث بھاگ پڑیں اور آپ کا دل رعب اور دہشت سے بھر جائے۔

بلکہ خدا تعالیٰ نے ان کے کتے کا اعزاز و اکرام فرمایا۔ یہاں تک کہ اپنی کتاب مقدس میں متعدد بار اس کا ذکر فرمایا۔ پھر دنیا میں اس کو ان کا ساتھی کر دیا۔ اور آخرت میں ان کے اعزاز کے طور پر اس کتے کو جنت میں داخل ہونے کی سعادت عطا کرے گا۔

یہ اس کا ایک کتے پر فضل و کرم ہے، جو بلا خدمت اور بلا عبادت صرف چند دن اور چند قدم اہل توحید و عرفان کے ساتھ چلا۔ تو اللہ تعالیٰ کا اس بندۂ مومن پر کس قدر فضل و کرم ہوگا جو ستر برس تک اس کی خدمت میں مصروف رہا اور نشۂ توحید سے مخمور رہا۔ اور اس کی بندگی میں مستغرق رہا۔ بلکہ ستر سال تو کجا، اگر یہ بندۂ مومن ستر ہزار برس زندہ رہتا تو اس کی بندگی میں ہی مشغول رہتا۔

کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کس طرح عتاب فرمایا جبکہ آپ نے مجرم لوگوں کے تباہ و برباد ہونے کی بد دعا کی تھی۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر قارون کے بارے میں کیسا عتاب فرمایا اور آپ سے یوں کہا: "اے موسیٰ! اس نے تجھ سے مدد چاہی مگر تو نے اس کی مدد نہ کی۔ مجھے اپنی عزت کی قسم! اگر

مجھ سے فریاد کرتا تو میں ضرور اس کو بچا لیتا اور اس کو معاف کر دیتا"۔

اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام سے ان کی قوم کے بارے میں کس طرح عتابانہ گفتگو کی کہ "اے یونس! تجھے کدو کے ایک درخت کے خشک ہو جانے کا تو غم ہے جسے میں نے ایک گھڑی میں اگایا اور دوسری گھڑی میں خشک کر دیا لیکن نینویٰ شہر کے ایک لاکھ یا لاکھ سے زائد باشندگان کا تجھے کوئی غم لاحق نہ ہوا؟" ——— پھر اس پر بھی نظر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کا کتنا جلدی عذر قبول کر لیا" اور ان سے عذاب عظیم اٹھا لیا۔ حالانکہ پہلے ان کو تقاضائے عدل گمراہی میں ڈال رکھا تھا۔

پھر اس واقعہ پر بھی غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین سے بھی عتابانہ گفتگو فرمائی جبکہ ایک دفعہ آپ باب بنی شیبہ سے اندر تشریف لائے تو کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ہنس رہے ہیں۔ تو فرمایا "کیوں ہنستے ہو، آئندہ میں تم کو ہنستا ہوا نہ دیکھوں"۔ یہ بات کہہ کر آپ جب حجر اسود کے پاس پہنچے تو وہاں سے اُلٹے پاؤں فوراً واپس لوٹے اور آ کر اُن لوگوں سے فرمانے لگے کہ ابھی ابھی میرے پاس جبریل امین آئے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام لائے ہیں کہ اے میرے حبیب! تو میرے بندوں کو میری رحمت سے کیوں مایوس کرتا ہے۔ میرے بندوں کو بتا دو کہ میں غفور رحیم ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن پر مہربان ماں کے اپنے بچے پر شفیق ہونے سے بھی زیادہ مہربان ہے۔

اور ایک مشہور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان للہ تعالیٰ مائة رحمة فواحدة منها قسمها بین الجن والانس والبهائم فیها یتعاطفون و بها یتراحمون وادخر منها تسعة وتسعین لنفسه لیرحم بها عباده یوم القیامة	بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں تھیں تو اس نے ان میں سے صرف ایک رحمت کو جنوں، انسانوں اور حیوانات کے درمیان تقسیم کیا تو ہر متنفس صرف اس ایک رحمت سے ایک دوسرے سے نرمی اور شفقت سے پیش آتا ہے۔ باقی ایک کم سو رحمتیں اس نے اپنی ذات کے لیے مخصوص کر رکھی ہیں جنہیں وہ قیامت کے روز اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کریگا۔

جب اس نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصے سے دنیا میں تجھ پر اس قدر نعمتیں کیں کہ تجھے اپنی معرفت عطا کی، اس اُمت مرحومہ میں پیدا کیا۔ اور طریقہ اہل سنت وجماعت کی پہچان نصیب کی۔ اس کے علاوہ بے شمار ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کیں، تو اس کے فضل عظیم سے اس بات کی بھی امید ہے کہ وہ اپنی نعمتیں تجھ پر مکمل کر دے۔ کیونکہ جو احسان کی ابتداء کرتا ہے اس کے ذمے ہوتا ہے کہ اس کو مکمل بھی کرے اور بقیہ ایک کم سو رحمتوں سے حصہ وافر عطا کرے ـــــ ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے فضل عظیم سے نامراد نہ کرے۔ بیشک وہ بڑا صاحب کرم و احسان مالک ہے اور بڑا رحیم اور جواد ہے۔

تیسری اصل

آخرت کے وعدو وعید کے بیان میں

ہم اس سلسلے میں پانچ قسم کے حالات کا ذکر کرتے ہیں:

موت ۔ قبر۔ قیامت ۔ جنت ۔ دوزخ ۔

اور ہر مقام کے مناسب ان خطرات عظیمہ کا تذکرہ جو نیکو کار، نافرمانوں، نیک کام میں کوتاہی کرنے والوں اور نیکی میں پوری کوشش کرنے والوں کو پیش آئیں گے۔

موت کا بیان:

اس باب میں دو آدمیوں کا حال ذہن میں رکھو۔ ایک تو وہ جو ابن شبرمہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اور شعبی ایک مریض کی عیادت کو گئے۔ اس پر نزع کی حالت طاری ہو چکی تھی اور اس کے پاس بیٹھا ہوا ایک شخص اس کو کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی تلقین کر رہا تھا حضرت شعبی نے اس شخص سے کہا مریض سے نرمی اور شفقت سے پیش آؤ۔ اتنے میں مریض بول اُٹھا اور کہنے لگا تو مجھے کلمہ طیبہ کی تلقین کرے یا نہ کرے میں یہ ضرور پڑھوں گا۔ پھر اس مریض نے قرآن کریم کے یہ الفاظ پڑھے:

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۔ — اللہ تعالیٰ نے کلمہ تقویٰ ان کے لیے لازم کر دیا اور وہ اس کے بہت حقدار اور اہل تھے۔

تو شعبی نے کہا:

الحمد لله الذی نجا صاحبنا — اس خدا کی حمد و ثنا جس نے ہمارے دوست کو نجات عطا فرمائی۔

دوسرا واقعہ وہ ہے جو حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ اپنے ایک شاگرد کے پاس پہنچے جو مر رہا تھا۔ آپ اس کے سر کے پاس بیٹھ گئے۔ اور سورۃ یٰسین پڑھنے لگے۔ تو اس نے کہا سورۃ یاسین پڑھنی بند کر دیں۔ پھر آپ نے اسے کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی تلقین کی۔ مگر اس نے کہا میں یہ کلمہ بالکل نہیں پڑھوں گا۔ میں اس سے بیزار ہوں۔ اور ان الفاظ پر اس کی موت واقع ہوگئی۔ حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے شاگرد کے برے خاتمے کا سخت صدمہ ہوا۔ اور چالیس روز تک اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اندر ہی بیٹھ کر روتے رہے۔ چالیس دن کے بعد خواب میں دیکھا کہ اس شاگرد کو فرشتے دوزخ میں گھسیٹ رہے ہیں۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تیری معرفت سلب کر لی حالانکہ تو میرے صاحب علم اور لائق ترین تلامذہ میں سے تھا، تو اس نے جواب دیا تین عیوب کی وجہ سے۔ ایک تو میرے اندر چغل خوری کا عیب تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کو کچھ بتاتا تھا اور آپ کو اس کے خلاف۔ اور دوسرا عیب یہ تھا کہ میں اپنے ساتھیوں سے حسد کرتا تھا۔ اور تیسرا عیب یہ تھا کہ مجھے ایک بیماری تھی۔ میں نے اس بیماری کا حکیم سے علاج پوچھا تو اس نے کہا سال میں ایک دفعہ ایک گلاس شراب پیا کر، تب صحتیاب ہوگا۔ ورنہ یہ بیماری تجھے نہیں چھوڑے گی۔ تو ہر سال میں ایک گلاس شراب پیتا تھا ——— اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ناراضگی سے بچائے جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔

پھر دو اور آدمیوں کے حال پر غور کرو:

ایک تو حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں۔ کہ جب آپ کا آخری وقت آیا تو نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور ہنسے اور زبان سے:

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ ۔ عمل کرنے والوں کو ایسے ہی عمل کرنے چاہییں۔

کے الفاظ پڑھے اور وصال کر گئے۔

اور میں نے اپنے استاذ حضرت امام الحرمین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا ہے کہ وہ اپنے استاذ حضرت ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی یہ حکایت بیان کرتے تھے کہ زمانہ تعلیم میں میرا ایک ساتھی تھا جو ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا تعلیم میں نہایت محنتی اور پرہیزگار اور عبادت گزار تھا لیکن محنت و کوشش بسیار کے باوجود تعلیم میں بہت کم آگے بڑھتا تھا۔ ہمیں اس کے حال پر تعجب ہوتا تھا۔ وہ طالب علم اچانک بیمار ہوگیا، اور وہاں اولیاء اللہ کی ایک خانقاہ میں پڑ گیا۔ ہسپتال میں داخل نہ ہوا لیکن سخت بیماری کی

حالت میں بھی اس نے پڑھنے کی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ اس کی حالت زیادہ نازک ہو گئی۔ اس وقت میں اس کے پاس تھا۔ اچانک اس نے اپنی نظر آسمان کی طرف اُٹھائی اور پھر مجھ سے کہا "اے ابن فورک! لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ ۔ (یعنی اے ابن فورک! کام کرنے والے اسی مثل کے لیے ایسا کام کرتے ہیں)۔ یہ الفاظ کہے اور فوت ہو گیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

دوسرا واقعہ وہ ہے جو حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں میرا ایک پڑوسی تھا۔ میں بوقتِ موت اس کے پاس گیا۔ اس وقت اس پر سکراتِ موت طاری تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگا اے مالک! اس وقت مجھے اپنے سامنے آگ کے دو پہاڑ نظر آتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان پر چڑھو۔ مالک بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے اس کے گھر والوں سے اس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے کہا: اس شخص نے غلہ کے لیے دو پیمانے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک غلہ لینے کا اور دوسرا دینے کا۔ میں نے وہ دونوں پیمانے منگوائے اور ایک دوسرے پر مار کر توڑ دیے۔ پھر میں نے اس سے دریافت کیا اب کیا حال ہے؟ اس نے کہا معاملہ تو اور بھی زیادہ نازک اور خراب ہو رہا ہے۔

قبر اور بعد الموت کا حال:

اس باب میں بھی دو آدمیوں کا قصہ خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق ہے۔ ایک تو وہ جو کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ میں نے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے وصال شریف کے بعد خواب میں دیکھا تو میں نے کہا "اے ابو عبداللہ! تم کس حال میں ہو؟ تو آپ نے مجھ سے اعراض فرمایا اور فرمایا "یہ کنیت سے بلانے کا وقت نہیں"۔ پھر میں نے کہا "اے سفیان! کس حال میں ہو؟ تو آپ نے جواب میں اشعار پڑھے:

(۱) نظرت الی ربی عیانا فقال لی	ھنیئا رضائی عنك یا ابن سعید
(۲) لقد کنت قواما اذا اللیل قد دجا	ببصرة مشتاق وقلب عمید
(۳) فدونك فاختر ای قصر تریدہٗ	وزرنی فانی عنك غیر بعید

(۱) بعد از موت میں نے اپنے پروردگار کو بالکل سامنے دیکھا میرے پروردگار نے مجھے فرمایا: اے ابن سعید! تجھے میری رضامندی مبارک ہو۔

(۲) تو تاریک راتوں میں میری یاد کے اندر کھڑا رہتا تھا۔ اس وقت تیری آنکھوں سے ذوق و شوق کے آنسو جاری ہوتے تھے اور تیرا دل پوری طرح میری طرف متوجہ ہوتا تھا۔

(۳) اب جنت فردوس کے محلات تیرے سامنے ہیں۔ تو جس کو چاہتا ہے لے لے اور ہر وقت میری زیارت سے لطف اندوز ہو کیونکہ میں اب تیرے سامنے اور تیرے قریب ہی رہوں گا۔

دوسرا واقعہ اس شخص کا ہے جسے بعض لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ اس کا رنگ بدلا ہوا ہے اور دونوں ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس سے دریافت کیا گیا "اے شخص اللہ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟" تو اس نے جواب میں یہ شعر پڑھا

تولی زمان لعبنا بہ وھذا زمان بنا یلعب

وہ زمانہ بیت گیا جس سے ہم کھیلتے تھے۔ اب یہ وہ زمانہ ہے جو ہم سے کھیل رہا ہے۔

نیز اس باب میں دو اور آدمیوں کا حال بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی بزرگ کا لڑکا شہید ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کو کبھی خواب میں نظر نہ آیا۔ صرف اس دن خواب میں باپ سے ملا جس دن سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وصال فرمایا۔ باپ نے دیکھ کر فرمایا اے میرے بیٹے کیا تجھ پر موت نہیں واقع ہو چکی؟ تو اس نے جواب دیا میں مردہ نہیں ہوں، بلکہ مجھے شہادت نصیب ہوئی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے قرب میں زندہ ہوں۔ اور مجھے انواع و اقسام کی روزی ملتی ہے۔ باپ نے کہا آج تو کیسے ادھر آگیا؟ تو اس نے کہا آج تمام آسمان والوں کو آواز دی گئی کہ آج کوئی نبی، صدیق اور شہید ادھر نہ رہے۔ سب عمر بن عبدالعزیز کے جنازہ میں شریک ہوں۔ تو میں بھی ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ادھر آیا تھا۔ پھر میں نماز جنازہ سے فارغ ہو کر تمہیں سلام کہنے آگیا ہوں۔

اور دوسرا واقعہ وہ ہے جو حضرت ہشام بن حسان سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا ایک چھوٹی عمر کا بچہ فوت ہو گیا۔ بعد از موت میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا اے بچے، تو بوڑھا کس طرح ہو گیا؟ تو اس نے جواب دیا جب فلاں شخص دنیا سے ہمارے پاس پہنچا تو دوزخ نے اسے دیکھ کر غصے سے ایک سانس لی جس کے خوف سے ہم سب ایک گھڑی میں بوڑھے ہو گئے ——

—— نعوذ باللہ الرحیم من العذاب الالیم۔

روز قیامت:

روز قیامت میں لوگوں کی کیفیت اس آیت میں بیان کی گئی ہے:

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ	اس دن ہم پرہیزگار لوگوں کو رحمٰن کی بارگاہ میں سوار
وَفْدًا ۰ وَ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى	کرکے لے جائیں گے اور مجرمین کو دوزخ کی طرف
جَهَنَّمَ وِرْدًا ۰	پیاسا ہانکیں گے۔

ایک شخص قبر سے اُٹھے گا تو اس کی سواری کے لیے قبر پر براق تیار ہوگا۔ تو قبر سے نکلتے ہی اس کے سر پر نوری تاج رکھا جائے گا، اعلیٰ لباس پہنایا جائے گا۔ اور براق پر بٹھا کر جنت کی طرف لے جایا جائیگا۔ اس کے اعزاز و اکرام کی خاطر اس کو پیدل نہیں چلنے دیا جائے گا۔

اور ایک دوسرا شخص قبر سے اُٹھے گا، تو دوزخ کے فرشتے، دوزخ کی زنجیر اور انواع و اقسام کے عذاب اسے دوزخ کی طرف پیدل چلنے کی فرصت بھی نہیں دیں گے۔ بلکہ قبر سے نکلتے ہی اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر فرشتے دوزخ میں ڈال دیں گے ——— نعوذ باللہ من غضبہ۔

میں نے بعض علماء کرام سے یہ حدیث مبارک سنی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

اذا كان يوم القيمة يخرج	قیامت کے دن ایک قوم قبروں سے نکلے گی۔
قوم من قبورهم لهم تجب	ان کے لیے سبز پروں والی نہایت عمدہ سواریاں
يركبونها لها اجنحة خضر	ان کی قبروں پر تیار کھڑی ہوں گی۔ وہ ان پر سوار
نتطير بهم في عرصات القيامة	ہو جائیں گے تو وہ انھیں اُڑا کر میدان محشر سے
حتى اذا اتوا على حيطان الجنة	آگے لے جائیں گی۔ چنانچہ وہ ان سواریوں پر جنت
فاذا رأتهم الملائكة قال بعضهم	کی دیواروں تک پہنچ آئیں گے جنت کی دیواروں
لبعض من هؤلاء فيقولون ما	پر محافظ فرشتے انہیں دیکھ کر آپس میں کہیں گے
ندري لعلهم من امة محمد	یہ کون لوگ ہیں۔ بعض جواب دیں گے شاید یہ لوگ
صلى الله تعالى عليه وسلم فياتيهم	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت سے ہیں۔
بعض الملائكة فيقول من انتم	تو چند فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور پوچھیں گے
ومن اي الامم انتم فيقولون	تم کون ہو اور کس اُمت سے ہو۔ تو وہ جواب دیں گے
نحن من امة محمد صلى الله عليه	ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہیں

وآلہ وسلم فتقول لہم الملٰئکۃ	تو فرشتے ان سے پوچھیں گے کیا تمہارا حساب
ھل حوسبتم ؟ فیقولون لا۔	کتاب ہو چکا ؟ وہ جواب دیں گے ہمارا کوئی حساب
فتقول الملٰئکۃ ھل وزنتم ؟	نہیں ہوا۔ پھر فرشتے دریافت کریں گے کیا
فیقولون لا۔ فتقول الملائکۃ ھل	تمہارے اعمال تولے جا چکے ہیں ؟ وہ اس کا بھی
قرأتم کتبکم ؟ فیقولون لا۔ فتقول	نفی میں جواب دیں گے۔ پھر فرشتے ان سے دریافت
الملائکۃ ارجعوا فکل ذلک	کریں گے کیا تم نے اپنے اعمال نامے پڑھ لیے ہیں ؟
ورائکم فیقولون ھل اعطیتمونا	وہ کہیں گے نہیں۔ تو فرشتے ان سے کہیں گے واپس
شیئا فتحاسب علیہ۔ وفی خبر	چلو کیونکہ یہ سب کارروائی پیچھے رہ گئی ہے۔ تو
اٰخر ما ملکنا شیئا فنعدل او	وہ لوگ جواب دیں گے کیا تم نے ہم کوئی چیز دی
نجور۔ ولکن عبدنا ربنا حتی	تھی جس کا ہم سے حساب لیا جائے۔ دوسری
دعانا فاجبناہ فینادی مناد	حدیث میں ہے وہ جواب دیں گے دنیا میں ہم کسی
صدق عبادی ما علی المحسنین	شے کے مالک نہیں تھے کہ ہم عدل وانصاف
من سبیل۔ واللہ غفور رحیم ۔	کرتے یا ظلم کا ارتکاب کرتے۔ ہم تو دنیا میں اپنے

رب کی بندگی اور عبادت میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آج اس نے ہم کو یہاں بلایا تو ہم آگئے۔ اتنے میں کوئی آواز دینے والا آواز دے گا میرے بندوں نے ٹھیک بیان کیا ہے۔ اخلاص سے نیکی میں زندگی گزار کر آنے والوں سے کوئی پرسش اعمال نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اے مخاطب ! کیا تو نے خدا تعالیٰ کا یہ فرمان مبارک نہیں سنا :

اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْ	تو کیا جو شخص دوزخ میں ڈالا جائے گا وہ اچھا ہے یا
اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۔	وہ شخص جو امن وعافیت کے ساتھ جنت میں چلا جائے گا۔

تو وہ شخص کس قدر عظیم المرتبہ ہوگا جو قیامت کے ان خوفناک مناظر، ہیبت ناک زلزلوں اور ڈرانے والے واقعات کو دیکھے گا مگر اس کے دل کو کوئی خوف، گھبراہٹ اور بوجھ محسوس نہیں ہوگا، بلکہ وہ خدا کی مہربانی سے عرصاتِ قیامت میں سے سکون وامن کے ساتھ گزر کر جنت کی طرف چلا جائیگا ——— ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں اور تمہیں سب کو ان نیک بختوں میں داخل کرے۔

اور یہ اللہ جل جلالہٗ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔

جنت اور دوزخ کا بیان

اس باب میں قرآن مجید کی ان دو آیات پر غور کرو۔ ایک آیت یہ ہے:

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ۝ إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا ۝

اللہ تعالیٰ انہیں شراب طہور کے جام پلائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے تمہارے اعمال کی جزا اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔

اور دوسری آیت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل دوزخ کا حال اس طرح نقل کیا ہے:

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ۝ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ۝

عرض کریں گے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دوزخ سے نکال۔ اگر ہم نے دوبارہ تیری نافرمانی کی تو بیشک ہم ظالم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا اسی میں ذلت و خواری کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات بھی نہ کرو۔

روایت میں ہے کہ اس کے بعد ان کی شکلیں کتوں کی طرح ہو جائیں گی اور وہ اس میں کتوں کی طرح بھونکتے پھریں گے۔ نعوذ باللہ الرؤف الرحیم من عذابہ الالیم۔

تو معاملہ ایسا ہی ہے جیسا حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ:

"ہم نہیں جانتے کہ دو مصیبتوں میں سے بڑی مصیبت کونسی ہے۔ جنت کو ہاتھ سے دینا یا دوزخ میں جانا۔ جنت سے صبر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور عذاب دوزخ کو برداشت کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن بہر صورت نعمت کا فوت ہونا عذاب دوزخ برداشت کرنے سے نسبتاً آسان ہے۔ پھر دوزخ میں ہمیشہ رہنا حادثہ کبریٰ اور مصیبت عظمیٰ ہے۔ اس لیے کہ اگر عذاب کسی وقت ختم ہو جانے والا ہوتا تو پھر بھی قدرے سہولت تھی۔ لیکن وہ تو ابدالآباد تک رہے گا۔ وہ کسی انتہا پر جا کر اختتام پذیر نہ ہوگا۔ تو کس دل میں ایسا عذاب برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ اور کس کی جان اس پر صبر کر سکتی ہے۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا عذاب دائمی کا تذکرہ ڈرنے والوں کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔"

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب اس شخص کا ذکر کیا گیا جو سب سے آخر دوزخ سے نکلے گا جس کا نام ہناد ہوگا۔ اس کو ایک ہزار سال عذاب ہوا ہوگا۔ وہ یا حنان یا منان پکارتے ہوئے دوزخ سے باہر آئے گا۔ تو اس کا حال سن کر رو پڑے اور فرمانے لگے "کاش ہناد میں ہوتا"۔ لوگوں کو آپ کے اس قول پر تعجب ہوا۔ آپ نے فرمایا تم پر افسوس کہ بات نہیں سمجھتے۔ وہ ایک ایک دن عذاب سے نکل تو آئے گا۔ میں کہتا ہوں کہ خوف و ڈر کا یہ سارا معاملہ ایک اصولی بات کی طرف لوٹتا ہے۔ اور وہی ایک نکتہ ہے جو پشتوں کو توڑتا ہے اور چہروں کو زرد کرتا ہے جس کے تصور سے جگر پگھل جاتے ہیں۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اور رونے والوں کی آنکھیں خون کے آنسو برساتی ہیں۔ وہ نکتہ ہے معرفت الٰہی کا چھن جانا۔ یہی وہ اصل بات ہے جس کا خوف ڈرنے والوں کو ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اور جس پر رونے والوں کی آنکھیں ہر وقت آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ بعض بزرگوں کا قول ہے غم تین طرح کے ہیں۔ طاعت اور نیکی کا غم، کہ شاید وہ قبول نہ ہو۔ گناہ اور معصیت کا غم کہ شاید اس کی مغفرت نہ ہو۔ اور معرفت کا غم، کہ وہ کسی وقت چھن نہ جائے۔ بعض اہل اخلاص نے کہا ہے کہ غم درحقیقت ایک ہی ہے۔ اور وہ سلب معرفت کا غم ہے۔ باقی ہر غم اس سے کم درجے کا ہے۔ کیونکہ وہ کسی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن سلب معرفت کا غم کبھی دور نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یوسف بن اسباط رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہ بات پہنچی ہے کہ ایک دفعہ آپ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس تشریف لے گئے۔ یوسف بن اسباط فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ حضرت سفیان ساری رات روتے رہے۔ میں نے دریافت کیا، کیا آپ اپنے گناہوں کے خوف سے روتے ہیں۔ تو حضرت سفیان نے ایک تنکا اٹھایا اور فرمایا کہ گناہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس سے بھی کم حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے تو اس بات کا خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ دولت اسلام نہ چھین لے۔ ہم احسان کرنے والے اللہ سبحانہٗ سے التجاء کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کرے۔ اور اپنے فضل سے ہم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرے۔ اور ملت اسلام پر ہمیں موت نصیب کرے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ ہم سوءِ خاتمہ کا سبب اور معنی احیاء العلوم میں بیان کر چکے ہیں۔ وہاں دیکھ لو۔ یہاں اس بحث کو چھیڑنا ایک بڑی طویل بحث کا دروازہ کھولنا ہے جس کی یہ کتاب متحمل نہیں۔ تم اسی مختصر بات کو سنجیدگی سے سمجھو۔ کیونکہ بسا اوقات تفصیل و تشریح سے خلاف مقصود اوہام پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مختصر بیان پر ہی کفایت کرو۔ شاید تمہیں اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق

سے فلاح وکامیابی نصیب ہو جائے۔

سوال: تم اگر یہ سوال کرو کہ "پھر ہمیں کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیے؛ خوف کا راستہ یا رجاء کا راستہ"؟

تو اس کا **جواب** یہ ہے تمہیں ان دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ کہا گیا ہے کہ جس پر رجا کا غلبہ ہوگیا وہ مرجئہ بن جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق اکثر یہ خطرہ رہتا ہے کہ یہ شخص حرجی العقائد بن جائے۔ اور جس پر خوف کا غلبہ ہوگیا وہ خوارج میں سے ہوگیا۔ اس مقولے کا مطلب بھی یہی ہے کہ صرف ایک پہلو اختیار نہ کرے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ رجا حقیقی خوف حقیقی سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اور خوف حقیقی رجاء حقیقی سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ رجاء سب کا سب اہل خوف کے لیے ہے امن سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ اور خوف سب کا سب اہل رجاء کے لیے ہے، یاس اور ناامیدی سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

سوال:

کیا اوقات اور حالات کے اعتبار سے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح اور زیادتی حاصل ہو سکتی ہے یا ہر حال میں دونوں کے درمیان راستے پر ہی قائم رہنا ضروری ہے؟

جواب:

معلوم ہونا چاہیے کہ جب انسان تندرست اور قوی ہو تو ایسی حالت میں خوف غالب ہونا چاہیے اور جب بیمار پڑ جائے اور ضعف ولاغری کا شکار ہو جائے خاص کر جبکہ آخرت کی طرف رخت سفر باندھنے کا وقت آجائے تو اس وقت رجاء کا غلبہ ہونا چاہیے۔ میں نے علماء کرام سے یوں ہی سنا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی ایک دلیل بھی ہے۔ مروی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے میں ان لوگوں کے پاس ہوتا ہوں جن کے دل میرے خوف سے چور ہو چکے ہیں۔ تو ایسے وقت میں اس کے لیے رجا اولیٰ اور بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ صحت، قوت اور قدرت کے زمانے میں اس پر خوف غالب رہا ہوتا ہے اس لیے ان سے کہا جاتا ہے لا تخافوا ولا تحزنوا کہ کسی قسم کا خوف نہ کرو اور نہ کوئی غم کرو۔

سوال:

کیا بہت سی اخبار اور احادیث اس سلسلے میں وارد نہیں ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنا

چاہیے۔ اور اس حسن ظن کی ترغیب میں بھی بہت روایات وارد ہیں۔

جواب: معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن یہ ہے کہ بندہ اس کی نافرمانی سے بچے، اس کے عذاب اور مواخذے سے ڈرے۔ اور اس کی خدمت اور بندگی میں کوشش کرے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں ایک مضبوط اصل اور اہم نکتہ ہے جس میں اکثر لوگ غلطی کا شکار ہیں اور وہ یہ ہے کہ رجا اور امنیۃ (آرزو) میں فرق ہے، کیونکہ رجا تو دلیل اور اصل سے وابستہ ہوتی ہے، مگر اُمنیت (آرزو) ایک بے اصل اور بے دلیل چیز ہے۔ ان دونوں کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص بیج ڈالے۔ پھر اس کی دیکھ بھال میں کوشش اور محنت کرے۔ پھر فصل کاٹ کر کھلیان میں رکھے۔ پھر یہ کہے مجھے امید ہے کہ سو بوری فصل ہو جائے گی۔ تو یہ رجاء اور امید ہے اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہو جس نے موقعہ پر نہ بیج ڈالا اور کھیتی باڑی کا ایک دن بھی کام نہ کیا، گھر پر ہی سویا رہا اور سارا سال غفلت میں گزار دے اور فصل اٹھانے کے وقت کہنا شروع کر دے کہ امید ہے کہ سو بوری غلہ حاصل ہو جائے تو ایسے شخص سے کہا جائے گا کہ تیری یہ امید حقیقت میں امید نہیں بلکہ یہ تو محض اُمنیت اور آرزو ہے۔ بالکل اسی طرح بندہ جب نیک اعمال میں کوشش کرے اور معصیت و نافرمانی سے بچے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کی خدمت کو قبول فرمائے اور کمی کو پورا کرے۔ اور اس پر بڑا ثواب عنایت کرے۔ اور لغزشوں کو معاف کرے اور مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے حسن ظن ہے۔ تو بندے کی اس طرح کی امید رجاء کہلاتی ہے۔ جو شرع میں محمود ہے۔ لیکن ایک شخص اگر غافل اور لاپرواہ رہے نیک کاموں کو ہاتھ نہ لگائے معصیت اور نافرمانی کا ارتکاب کرے۔ اللہ تعالیٰ کے غصے اور ناراضگی کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے وعدہ وعید کو خاطر میں نہ لائے۔ پھر یوں کہتا پھرے کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت عطا کرے گا اور دوزخ کے عذاب سے بچائے گا تو یہ اُمنیت اور آرزو ہے۔ رجاء اور امید نہیں۔ اور یہ ایک لاحاصل شے ہے اس نے اس کو رجاء اور حسن ظن کا نام دے دیا۔ وہ اس سلسلے میں بھٹکا ہوا ہے۔ اور خطا اور غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ایک شاعر نے یہ مضمون یوں ادا کیا ہے

ترجو النجاۃ ولم تسلک مسالکہا　　　　ان السفینۃ لا تجری علی الیبس

ترجمہ: تم نجات کی امید رکھتے ہو۔ لیکن نجات کے راستے اختیار نہیں کرتے۔ کشتی خشکی پر نہیں چل سکتی۔

میں کہتا ہوں اس اصل اور قاعدے کی تائید جس سے ہوتی ہے وہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا:

الکیس من دان نفسہ	دانا وہ ہے جو اپنے نفس کو دین اور شرع کے
وعمل طابعہ الموت - و	تابع کرے۔ اور ما بعد الموت کے لیے ذخیرہ اعمال
العاجز من اتبع نفسہ	جمع کرے۔ اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہشات
ھواھا وتمنی علی اللہ عزّ	کی پیروی کرے اور اللہ تعالیٰ سے نجات اور
وجل الامانی۔	جنت کی امیدیں لگائے رکھے۔

اس بارے میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے "کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو دنیا میں بخشش اور مغفرت کی امیدوں میں رہتے ہیں، نیک عمل کچھ نہیں کرتے۔ دنیا سے آخرت کی طرف مفلس اور قلاش جاتے ہیں، ان کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوتی۔ اور کہتے یہ ہیں کہ ہمیں اپنے رب سے حسن ظن ہے۔ (کہ وہ ہم سے بہتر سلوک کرے گا)۔ لیکن ایسے لوگ جھوٹے ہیں۔ کیونکہ اگر انہیں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن ہوتا تو ان کے اعمال بھی اچھے ہوتے۔ پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ	تو جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید رکھتا ہو
عَمَلًا صَالِحًا الآیۃ	اسے چاہیے کہ اعمال صالحہ اختیار کرے۔

دوسری آیت یہ پڑھی

وذٰلکم ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ	یہ تھا تمہارا گمان تمہارے رب کے متعلق جس
اَرْدَاكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ	نے تمہیں ہلاک کر دیا تو تم نقصان اُٹھانے
الْخَاسِرِينَ۔	والوں میں سے ہو گئے۔

جعفر ضبعی قدس سرہ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں "میں نے ایک دفعہ حضرت ابو میسرہ عابد کو دیکھا کہ عبادت و بندگی میں کوشش و محنت اور کثرت مجاہدات کے باعث ان کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا اللہ آپ پر رحم کرے اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی وسیع ہے۔ آپ یہ الفاظ سن کر غصہ میں آگئے اور فرمایا تو نے میرے اندر ایسی چیز دیکھی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں اللہ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہوں اللہ تعالیٰ کی رحمت تو نیکوکار لوگوں کے بالکل قریب ہے۔ جعفر ضبعی کہتے ہیں کہ مجھے

آپ کی یہ بات سن کر رونا آگیا کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور تمام اولیا اور ابدال عبادت میں کوشش و محنت اور گناہ اور معصیت سے پوری طرح پرہیز اور اجتناب کے باوجود ہر وقت خوف و خشیت سے لبریز رہے۔ تو تمہارا کیا خیال ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن نہیں۔ حالانکہ انہیں اس کی رحمۃ واسعہ پر بڑا یقین تھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے جود و کرم سے بڑا حسن ظن تھا۔ درحقیقت وہ جانتے تھے کہ طاعت میں کوشش اور محنت کے بغیر خالی حسن ظن، حسن ظن نہیں بلکہ جھوٹی آرزو اور دھوکا اور غرور ہے۔ اس نکتے سے عبرت پکڑو۔ اور صالحین کے حالات پر غور کرو اور خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ۔۔۔۔۔ واللہ تعالیٰ ولی التوفیق

فصل

خلاصہ گفتگو یہ ہوا کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تصور کرو گے جو اس کے غضب پر غالب ہے۔ اور جو تمام اشیاء و موجودات کو محیط ہے۔ پھر اس کا بھی تصور کرو کہ خدا تعالیٰ نے تم کو اس امت مرحومہ مکرمہ میں پیدا کیا پھر اس کے فضل عظیم اور اس کے کمال جود و کرم کا بھی تصور کرو۔ پھر اس امر کا بھی تصور کرو کہ جو کتاب اس نے تیری ہدایت کے لیے نازل فرمائی اس کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا یعنی بسم کے اندر ہی اپنی رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر فرمایا۔ پھر اس کا بھی تصور کرو کہ اس ذات کریم نے تمہاری طرف سے کسی سفارش اور کسی سابق خدمت کے بغیر محض اپنے فضل و کرم سے تمہیں بے شمار ظاہری و باطنی مہربانیوں اور انعامات سے نوازا۔ دوسری طرف اس کے کمال جلال، اس کی عظمت، اس کی عظیم قدرت و ہیبت نیز اس کے شدید غضب و غصہ کا بھی تصور کرو جس کے آگے آسمان اور زمین بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ پھر تم آخرت کے معاملے کی نزاکت اور خطرے کے ساتھ اپنی انتہائی غفلت۔ اپنے لاتعداد گناہ اور اپنی سنگدلی کا بھی تصور کرو۔ پھر اس بات کا تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تمام حرکات و سکنات، تمہارے تمام عیوب اور پوشیدہ باتوں سے بھی پوری طرح واقف اور آگاہ ہے۔ پھر تم اس کے حسن وعدہ اور اس ثواب کو بھی ذہن میں لاؤ جس کی کنہ اور حقیقت انسانی وہم و گمان سے بہت بلند ہے۔ پھر اس کی شدید وعیدوں اور اس کے عذاب الیم کو بھی خیال میں لاؤ جس کے قلوب انسانی متحمل نہیں ہو سکتے نیز تم اس کے فضل و کرم اس کے مقابلے میں اس کے عذاب پھر اس کی رحمت و شفقت پھر اپنے نفس کی زیادتی اور بے راہ روی اور جرائم اور معاصی کو بھی ذہن میں رکھو گے تو یہ تمام باتیں تمہارے اندر خوف و رجاء کی صفت پیدا کر دیں گی۔ اور تم درمیانی راہ پر چل پڑو گے۔ اور تم بے خوفی اور ناامیدی کے

دونوں ہلاک کن راستوں اور بے خوفی اور ناامیدی کی وادیوں میں حیران پھرنے والوں سے الگ ہو جاؤ گے اور ہلاک و برباد ہونے والوں سے کنارہ کش ہو جاؤ گے اور خوف ورجاء کی متصل شراب سے سرشار ہو جاؤ گے پھر نہ تو صرف رجاء کی ٹھنڈک سے ہلاک ہو گے اور نہ محض خوف کی آتش میں جلو گے۔ اور اب تم اپنے مقصود سے ہمکنار ہو گئے۔ اور دونوں مہلک امراض سے بچ گئے۔ اب تم اپنے نفس کو طاعت و بندگی پر آمادہ پاؤ گے اور وہ غفلت اور سستی کے بغیر دن رات خدمت میں مصروف ہو جائے گا۔ اور اس طرح تم گناہوں اور ذلیل حرکتوں سے پوری طرح محفوظ ہو جاؤ گے۔ اور برائیوں سے پوری طرح کنارہ کشی حاصل ہو جائے گی۔

حضرت نوف بکالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نوف جب جنت کا ذکر کرتا ہے تو اس کے دل میں جنت کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب اسے آتش دوزخ یاد آتی ہے تو مارے خوف کے اس کی نیند اُڑ جاتی ہے۔

خوف ورجاء کی یہ صحیح کیفیت پیدا ہو جانے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور خواص عابدین میں سے ہو جاؤ گے۔ جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیۃ میں ذکر کیا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ	بیشک یہ لوگ نیک کام کرنے میں جلدی کرتے تھے
وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ، وَكَانُوا	اور خوف و رغبت کی حالت میں ہماری بندگی
لَنَا خَاشِعِينَ .	کرتے تھے۔ اور ہمارے آگے جھکے رہتے تھے۔

اور اب تم نے اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حُسنِ توفیق سے اس خطرناک گھاٹی کو عبور کر لیا۔ اب تمہیں دنیا میں بہت صفائی اور حلاوت نصیب ہو گئی۔ اور تم نے عقبیٰ کے لیے ذخیرہ عظیم اور اجر کثیر حاصل کر لیا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اور تمہاری اپنی توفیق اور درستی سے مدد فرمائے بیشک وہ ارحم الراحمین اور تمام سخیوں سے بڑا سخی ہے ——— وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

چھٹا باب

چھٹی گھاٹی میں۔ اور یہ عقبۃ القوادح سے موسوم ہے

پھر اے برادر (اَیَّدَكَ اللّٰهُ وَاِیَّانَا بِحُسْنِ تَوْفِیْقِهٖ) تجھ پر اس راستے کی پہچان اور معرفت اور اس راستے پر چلنے میں استقادت کے بعد عبادت اور بندگی کو خراب اور برباد کرنے والی چیزوں سے الگ رکھنا اور بچنا بھی لازم اور ضروری ہے۔ اور یہ بات اخلاص کو قائم کرنے اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے اور ناروا امور سے اجتناب کے ذریعہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور یہ بات دو وجہ سے لازم اور ضروری ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اخلاص سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عمل کو حسن قبول کا مقام حاصل ہوتا ہے اور ثواب حاصل کرنے میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ اخلاص مفقود ہونے کی صورت میں اعمال مردود ہو جاتے ہیں، اور ان کا ثواب یا تو بالکل ہی یا کچھ نہ کچھ ضائع اور برباد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مشہور حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے۔

انا اغنی الاغنیاء عن الشرك من	میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں جو شخص عمل میں
عمل عملا فاشرك فیه غیری	میرے غیر کو شریک کرے۔ تو میرا حصہ بھی اس شریک
فنصیبی له فانی لا اقبل الا ما كان	کو ہی پہنچا۔ میں صرف اُس عمل کو قبول کرتا ہوں جو
لی خالصًا۔	خالص میرے لیے کیا گیا ہو۔

مروی ہے کہ قیامت کے روز جب بندہ اللہ تعالیٰ سے اپنے اعمال پر ثواب طلب کرے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے مجالس و محافل میں وسعت نہیں دی گئی تھی کیا وہاں تجھے سرداری نہیں دی گئی تھی۔ کیا تجھے دنیا میں تیرے کاروبار تجارت میں ترقی اور سہولت اور ہر قسم کی ارزانی عطا نہیں کی گئی تھی۔ کیا تجھے اسی طرح کے بے شمار اعزازات و انعامات نہیں دیے گئے تھے۔ اور تجھے انواع و اقسام کے خطرات و مضرات سے محفوظ نہیں رکھا گیا تھا۔ یعنی یہ سب کچھ جزائے اعمال کے طور پر دنیا میں تجھے دے دیا گیا تھا۔

میں کہتا ہوں ریاء کے خطرات میں سے کم از کم دو قسم کی تو ندامت انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ اور دو مصیبتیں اس پر مسلط ہوتی ہیں۔ ایک ندامت تو پوشیدہ قسم کی ہے وہ تمام ملائکہ کے سامنے شرمندگی اور

ندامت ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے کہ ملائکہ ایک بندے کے اعمال خوشی خوشی اوپر لے جاتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوتا ہے کہ یہ اعمال سجین میں پھینک دو کیونکہ اس نے یہ اعمال میری رضا اور خوشنودی کے لیے نہیں کیے تھے۔ تو اس وقت اُس بندے اور اس کے عمل کو ملائکہ کے سامنے ندامت لاحق ہوتی ہے دوسری ندامت اور شرمندگی علانیہ اس کو لاحق ہوگی، جو قیامت کے دن تمام مخلوقات کے سامنے ندامت اور رسوائی لاحق ہوگی، حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ:

ان المرائی ینادی یوم القیامۃ	ریاء کار کو قیامت کے دن چار ناموں سے پکارا
باربعۃ اسماء. یا کافر،	جائے گا۔ اے کافر، اے فاجر، اے غدار، اے
یا فاجر، یا غادر، یا خاسر، ضل	خسارہ اٹھانے والے تیری کوشش بے کار چلی گئی
سعیك و بطل عملك فلا خلاق	تیرے اعمال بے کار ہو چکے ہیں، یہاں آخرت میں
لك التمس الاجر ممن کنت	تیرا کوئی حصہ نہیں۔ اے دھوکے باز اپنے اعمال کا اجر و
تعمل له یا مخادع۔	ثواب اس سے جا کر لے جس کو دکھانے کے لیے تو عمل کرتا تھا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ:

ینادی مناد یوم القیامۃ یسمع	قیامت کے روز ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا
الخلائق این الذین کانوا یعبدون	جسے تمام مخلوقات سنے گی۔ کہاں ہیں وہ جو خدا کے
الناس قوموا خذوا اجورکم	بجائے لوگوں کی عبادت کرتے تھے جاؤ اور اپنے
ممن عملتم له فانی لا اقبل	اعمال کا بدلہ ان سے لو جن کے لیے کرتے تھے میں
عملا خالطه شئ۔	اس عمل کو قبول نہیں کرتا جس میں ریاء اور نمائش کی ملاوٹ ہو۔

اور ریاء سے آنے والی دو مصیبتوں میں ایک مصیبت جنت سے محرومی ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

ان الجنۃ تکلمت و قالت انا حرام	جنت نے گفتگو کی اور کہا میں بخیل اور ریاء کار
علی کل بخیل و مراءٍ	پر حرام ہوں۔

اس حدیث شریف کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس بخیل سے وہ بخیل مراد ہے جو سب سے بہتر کلمے کو

زبان پرلانے سے بخل کرتا ہے، یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تصدیق قلبی کے ساتھ نہیں پڑھتا اور اس ریاء کار سے وہ مراد ہے جو بدترین قسم کی ریاء کاری کا مظاہرہ کرتا ہے یعنی منافق جو اپنی توحید اور اپنے ایمان میں ریاء کاری کرتا ہے۔ حدیث کے اس معنی میں امید کی طرف اشارہ ہے کہ اگر صدق اور اخلاص پیدا ہو جائے تو اس کا معاملہ درست ہو سکتا ہے۔ حدیث کا دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص بخل اور ریاء کاری سے باز نہ آئے اور اپنی پروا اور رعایت نہ کرے۔ تو ایسی صورت میں دو خطرے ہیں ایک تو یہ کہ ممکن ہے اس بخل اور ریاء کاری کی نحوست اس پر آپڑے اور وہ کفر کے گڑھے میں جا گرے اور اس طرح جنت سے بالکل محروم ہو جائے العیاذ باللہ منہ ۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اس بخل وریاء کاری کے باعث ایمان ہی سلب ہو جائے، اور دوزخ کا مستحق ہو جائے۔ ہم اللہ کی ناراضگی اور شدید غضب سے پناہ مانگتے ہیں۔

اور دوسری مصیبت دوزخ میں جانا ہے۔ کیونکہ ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اول من یدعی یوم القیامۃ رجل	قیامت کے روز سب سے پہلے حساب کے لیے
قد جمع القرآن ورجل قد قاتل	جس شخص کو بلایا جائے گا وہ حافظ اور قاری قرآن
فی سبیل اللہ ورجل کثیر المال	ہوگا اور ایک وہ جس نے راہ خدا میں جان دی ہوگی
فیقول اللہ تعالیٰ للقاری الم اعلمك	اور ایک مالدار شخص کو۔ تو اللہ تعالیٰ قاری سے
ما نزلت علی الرسول، فیقول	فرمائے گا کیا میں نے تجھے وہ کتاب نہیں سکھائی تھی
بلیٰ یارب۔ فیقول ماذا عملت	جو میں نے اپنے رسول پر نازل کی تھی وہ جواب دیگا
فیما علمت فیقول یارب قمت	ہاں یارب تو اللہ تعالیٰ پوچھے گا تو علم کے مطابق تو
بہ آناء اللیل واطراف النھار	نے عمل کیا۔ قاری جواب دے گا میں تیری خوشنودی
فیقول اللہ کذبت وتقول	کے لیے ساری ساری رات اور دن کے اوقات
الملائکۃ کذبت فیقول اللہ	مختلفہ میں آیات قرآنی کی تلاوت میں مشغول ومصروف
سبحانہ بل اردت ان یقال	رہا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے اور
فلان قاری، فقد قیل	فرشتے بھی کہیں گے تو جھوٹ بولتا ہے پھر اللہ تعالیٰ
ذلك ۔	فرمائے گا تلاوت آیات سے تیرا ارادہ یہ تھا کہ لوگ

ویؤتی بصاحب المال فیقول له الم اوسع علیك حتی لم ادعك تحتاج الی احد فیقول بلی یا رب فیقول ماذا عملت فیما آتیتك فیقول کنت اصل الرحم وا تصدق فیقول الله کذبت و تقول الملائکة کذبت یقول الله سبحانه بل اردت ان یقال انك جواد فقد قیل ذلك۔

ویؤتی بالذی قتل فی سبیل الله فیقول الله ما فعلت فیقول امرت بالجهاد فی سبیلك فقاتلت حتی قتلت فیقول الله تعالی کذبت و تقول الملائکة کذبت و یقول الله بل اردت ان یقال فلان جری و شجاع فقد قیل ذلك۔ ثم ضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم بیده علی رکبتی وقال یا ابا هریرة اولئك اول خلق الله یسعر بهم نار جهنم۔

کہیں فلاں شخص قاری ہے۔ اور یہ بات تجھے حاصل ہو گئی تھی۔ پھر صاحب مال شخص کو بلایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کیا میں نے تجھے رزق میں فراخی اور وسعت عطا نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے تجھے کسی انسان کا محتاج نہیں رکھا تھا۔ وہ کہے گا ہاں یا رب تعالیٰ۔ تو اس سے پوچھے گا تیرے جیسے جو مال کو تو نے کس عمل میں صرف کیا وہ کہے گا میں نے اس مال کے ساتھ صلہ رحمی قائم کی اور تیری راہ میں صدقہ اور خیرات کیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے تو جھوٹا ہے، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ فرمائے گا بلکہ تیری نیت تو یہ تھی کہ دنیا تجھے سخی اور فیاض کے نام سے پکارے۔ اور یہ چیز دنیا میں تجھے حاصل ہو گئی۔ اور اس شخص کو دربار خداوندی میں لایا جائے گا جس نے اللہ کی راہ میں جان دی ہو گی اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے دنیا میں کیا نیک کام کیے، عرض کرے گا مجھے تیری راہ میں جہاد کا حکم ملا تو میں جہاد میں مصروف ہو گیا حتی کہ تیرے راستے میں جان کی قربانی دی اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے۔ ملائکہ بھی کہیں گے تو جھوٹ بول رہا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا بلکہ تیرا تو یہ مقصد تھا کہ لوگ تجھے دلیر اور شجاع کہیں۔ اور یہ بات تجھے دنیا میں حاصل ہو گئی پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میرے گھٹنے پر مارا اور فرمایا اے ابوہریرہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو سب سے اول دوزخ میں پھینک کر اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ بھڑکائے گا۔

ایک دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

سمعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ
یقول ان النار واھلھا یعجون	فرماتے تھے دوزخ اور اہل دوزخ ریاء کاروں
من اھل الریاء قیل یا رسول اللہ	سے چیخ اٹھیں گے۔ کہا گیا یا رسول اللہ دوزخ
وکیف تعج النار قال من حر	کیوں چیخے گی آپ نے فرمایا اس آگ کی
النار التی یعذبون بھا۔	تپش سے جس سے ریاء کاروں کو عذاب دیا
	جا رہا ہوگا۔

قیامت کے روز لاحق ہونے والی شرمندگیوں اور ندامتوں میں اہل بصیرت میں درس عبرت ہے

واللہ سبحانہ ولی الھدایہ بفضلہ۔

سوال : آپ ہمیں اخلاص اور ریاء کی حقیقت اور ان کے نتیجے سے آگاہ فرمائیں۔ نیز ان سے انسان کے اعمال میں کس قسم کا اثر رونما ہوتا ہے۔ اس پر بھی روشنی ڈالیں؟

جواب : ہمارے علمائے اہل سنت کے نزدیک اخلاص کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عمل میں اخلاص (۲) طلب ثواب میں اخلاص۔ اخلاص فی العمل تو یہ ہے کہ بندہ اپنے عمل سے تقرب حق تعالیٰ، اس کے حکم کی تعظیم اور اس کے فرمودات کی بجاآوری کا ارادہ کرے۔ اور یہ اخلاص اعتقاد صحیح سے نصیب ہوتا ہے۔ اس اخلاص کی ضد نفاق ہے۔ جس میں غیر اللہ کا تقرب مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نفاق اس اعتقاد فاسد کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں منافق کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ اعتقاد ارادہ کے قبیلہ میں سے نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم دوسرے مقام پر ذکر کر چکے ہیں۔

لیکن طلب ثواب میں اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ نیک عمل سے نفع آخرت کا ارادہ کرے۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس کی حقیقت یہ بیان کرتے تھے "ایسے نیک کام پر نفع آخرت کا ارادہ کرنا جسے شرعاً رد کرنا دشوار ہو اور رد کر دینے کی صورت میں آخرت میں نفع کی امید باقی نہ رہے۔ ہم اخلاص کی اس تعریف میں ملحوظ قیدوں کی شرح دوسرے مقام پر کر چکے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواریوں نے آپ سے دریافت کیا "اخلاص کیا ہے" آپ نے جواب دیا" اخلاص یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے نیک کام کرے اور دل میں اس کی چاہت نہ رکھے کہ اس پر اس کی حمد و ثنا کی جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول مبارک کا مطلب

بھی یہی ہے کہ بندہ ریاء کو نزدیک نہ آنے دے اور حمد و ثناء کی خصوصیت سے نفی اس واسطے فرمائی کہ یہ ریاء کے اقوی اسباب ہیں جو اخلاص کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "ریاء کاری وغیرہ کے میل کچیل سے اعمال کو پاک و صاف رکھنے کا نام اخلاص ہے"۔

حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "تمام نفسانی اور بشری تقاضوں کو بھول جانے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ دوام ربط اور دوام مراقبہ کا نام اخلاص ہے"۔ یہ اخلاص کا مکمل بیان ہے۔ اخلاص کی تعریف میں اور بھی بہت سے اقوال ہیں۔ لیکن انکشاف حقائق کے بعد نقل اقوال میں کوئی فائدہ نہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب اخلاص کی حقیقت دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا

تقول ربی اللہ ثم تستقیم کما امرت۔ — اخلاص یہ ہے کہ تو کہے میرا رب اللہ ہے۔ اور پھر جو تجھے حکم ہے اس پر قائم اور مضبوط ہو جائے۔

یعنی تو اپنے نفس اور خواہشات کی عبادت چھوڑ دے بلکہ صرف رب تعالیٰ کی پوجا اور بندگی کرے۔ اور اس کے حکم کے مطابق اس کی عبادت اور بندگی میں مستقیم رہے۔ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد میں دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے سے تعلق منقطع کرے اور اس کی ذات کے سوا ہر چیز اپنی نظر سے ہٹا دے۔ اخلاص حقیقی اسی کا نام ہے۔ اخلاص کے مقابلہ میں ریاء ہے۔ اور ریاء کی تعریف ہے۔ عمل آخرت کے عوض دنیوی نفع کا ارادہ کرنا۔ پھر ریاء دو قسم ہے (۱) ریاء محض (۲) ریاء مخلوط۔ ریاء محض تو یہ ہے کہ صرف دنیوی نفع کا ارادہ کیا جائے۔ اور ریاء مخلوط یہ ہے کہ عمل آخرت سے دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کے نفع کا ارادہ کیا جائے۔ یہ تو تھی اخلاص اور ریاء دونوں کی حقیقت اور ماہیت باقی رہی ان دونوں کی تاثیر تو اخلاص سے تو تم اپنے فعل کو قربت اور نزدیکی کا سبب بنالو گے۔ اور طلب ثواب میں اخلاص سے تمہارا عمل بڑے ثواب اور عظمت کا مستحق ہو جائے گا۔ اس کے برعکس نفاق عمل خیر کو ضائع کر دیتا ہے۔ اور اس عمل سے نزدیکی اور قربت کی حیثیت سلب کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل پر ثواب کا جو وعدہ کیا ہے نفاق سے وہ عمل اس وعدے کا مستحق نہیں رہتا۔ بعض علماء کے نزدیک ریاء محض کا صدور عارف سے نہیں ہو سکتا ہاں ریاء کی آمیزش ہو سکتی ہے۔ جس سے نصف ثواب باطل اور ضائع ہو سکتا ہے۔ اور بعض دوسرے علماء

کے نزدیک عارف سے ریاء محض کا صدور بھی ہو سکتا ہے اور اس سے دُگنے کا نصف ثواب ضائع ہوتا ہے، اور ریا مخلوط دُگنے کا چوتھائی ثواب برباد ہوتا ہے۔ اور ہمارے شیخ قدس سرہ کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ عارف سے آخرت کا تصور ہوتے ہوئے ریاء محض کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت سے سہو کی صورت میں ریاء محض کا صدور ممکن ہے۔ مختار اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ ریاء کی تاثیر سے عمل کی قبولیت ختم ہو جاتی ہے، اور ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ باقی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ نصف ثواب ضائع ہوتا ہے یا چوتھائی ثواب۔ اور ان مسائل کی شرح بڑی طویل ہے۔ ہم ان کی مکمل اور پوری شرح و تفصیل کتاب "احیاء العلوم" اور "اسرار معاملات دین" میں کر چکے ہیں۔

سوال : اگر تم یہ سوال کرو کہ اخلاص کا موقعہ محل کونسا ہے۔ اور کس طاعت میں یہ پایا جاتا ہے، اور کہاں واجب و ضروری ہے؟

جواب : تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علماء کے نزدیک اعمال تین قسم ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں دونوں قسم کے اخلاص پایا جاتا ہے۔ اور وہ عبادات ظاہرہ اصلیہ ہیں۔ دوسری قسم عبادات کی وہ ہے جس میں دونوں قسم کا اخلاص نہیں پایا جاتا۔ وہ عبادات باطنیہ اصلیہ ہیں۔ اور اعمال کی تیسری قسم وہ ہے جس میں طلب اجر و ثواب کا اخلاص تو پایا جاتا ہے۔ لیکن اخلاص العمل نہیں پایا جاتا۔ اور یہ وہ مباحات ہیں جو سامان آخرت کے طور پر انسان اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے وہ عبادات اصلیہ جو غیر اللہ کے لیے بھی ہو سکتی ہیں ان میں اخلاص عمل پایا جاتا ہے۔ تو اکثر عبادات باطنہ میں اخلاص عمل متحقق ہوتا ہے۔ لیکن طلب اجر میں اخلاص، تو یہ اکثر مشائخ کرامیہ کے نزدیک عبادات باطنہ میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ ان پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی مطلع نہیں ہوتا۔ تو ان میں ریاء کے اسباب و دواعی نہیں پائے جا سکتے۔ لہذا ان میں طلب اجر کے اخلاص کی حاجت اور ضرورت نہیں پڑتی۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ جب ایک بندہ مقرب عبادات باطنہ سے دنیوی نفع کا قصد کرے تو یہ بھی ریاء میں داخل ہے۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں کوئی بعید نہیں کہ بہت سی عبادات باطنہ میں دونوں قسم کا اخلاص پایا جائے۔ اسی طرح نوافل شروع کرتے وقت دونوں قسم کا اخلاص ہونا ضروری ہے۔ لیکن وہ مباحات جو تیاری آخرت کی غرض سے انسان نے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں ان میں طلب ثواب کا اخلاص تو پایا جاتا ہے مگر اخلاص عمل نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ یہ مباحات بذات خود عبادت و قربت نہیں ہیں۔ بلکہ قربت و بندگی کا

کا ذریعہ اور موجب ہیں۔

سوال : اگر تم کہو کہ یہ جو بیان کیا گیا ہے یہ دونوں قسم کے اخلاص کے موقعہ و محل کا بیان تھا۔ ان دونوں کا وقت بھی بتائیں۔

جواب : اخلاص عمل تو فعل کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اس سے متاخر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اخلاص طلب اجر عمل سے متاخر ہو سکتا ہے۔ اور بعض علماء عمل سے فراغت کے وقت کا اعتبار کرتے ہیں۔ یعنی عمل سے فراغت اخلاص کی کیفیت پر ہوتی ہے تو اخلاص کا اعتبار ہوگا اور اگر ریاء پر ہوتی ہو تو ریاء کا اعتبار ہوگا۔ اور چونکہ عمل سے فراغت ہو چکی ہے اس لیے اب اس کا تدارک ممکن نہیں۔ اور مشائخ کرامیہ کے نزدیک جب تک عمل سے کوئی دنیوی منفعت نہ اٹھائی ہو اور اخلاص کا ارادہ کر لیا جائے تو اخلاص معتبر ہو جائے گا۔ لیکن اگر دنیوی منفعت حاصل کر لی ہو تو پھر اخلاص کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض علماء کا خیال ہے کہ فرائض میں موت تک اخلاص کا پیدا کر لینا ممکن ہے۔ لیکن نوافل میں نہیں۔ اور انہوں نے فرائض اور نوافل میں فرق کی یہ وجہ بیان کی ہے۔ کہ فرائض میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بندہ داخل ہوتا ہے۔ تو اس میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی طرف سے آسانی کی امید ہوتی ہے۔ لیکن نوافل میں یہ صورت حال نہیں۔ کیونکہ نوافل بندہ اپنی مرضی اور چاہت سے شروع کرتا ہے۔ لہٰذا ان میں اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں کماحقہ ادا کرے۔ اور ان میں ذرا سی کوتاہی نہ آنے دے۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ جس شخص سے ریاء کا صدور ہو چکا ہو، یا ترک اخلاص کا ارتکاب ہو چکا ہو تو اس کے لیے مذکورہ وجوہ کی روشنی میں تلافی اور تدارک کی گنجائش ہے۔ ان باریک اور دقیق مسائل میں لوگوں کے مختلف مذاہب نقل کرنے سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ فی زمانہ صحیح عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔ اور اس راہ تصوف و فقر پر چلنے والوں کی رغبت اور ان کا شوق ختم ہو چکا ہے۔ اسی لیے وہ ان دقائق و حقائق کو جاننے کی طرف متوجہ نہیں۔ نقل مذاہب سے دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس راستے کے مبتدی کو عبادات میں اور قریب لایا جائے۔ اور اس کو اپنی بیماریوں کا علاج ایک مذہب میں نہ ملے تو دوسرے مذہب میں پالے۔ کیونکہ انسانی امراض، اعراض، اعمال کی خرابیاں اور ان کی آفات مختلف ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تم یہ باتیں اچھی طرح سمجھ لوگے۔

سوال : کیا ہر عمل میں اخلاص مفرد ہی صرف کافی ہو سکتا ہے۔ یا ہر عمل کے ہر جزو کے لیے

علیحدہ علیحدہ اخلاص جدید کی ضرورت ہے۔

جواب: اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں سارے عمل کے لیے ایک ہی اخلاص کی ضرورت ہے۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ کچھ اعمال ایسے ہیں، جن میں ایک اخلاص ہی کفایت کرتا ہے جیسے وہ اعمال جو مختلف ارکان سے مرکب ہیں لیکن من حیث المجموع درستی اور فساد کے لحاظ سے ایک شے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔

سوال: ایک شخص اپنے عمل خیر سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی نہیں بلکہ اپنے نفع اور فائدے کا ارادہ کرتا ہے۔ لوگوں سے کوئی ارادہ نہیں رکھتا یعنی اس کے دل میں یہ بات نہیں کہ اس عمل خیر پر لوگ میری حمد و ثناء کریں یا میرے عمل کو دیکھیں یا مجھے کوئی نفع پہنچائیں۔ تو کیا اس قسم کا عمل بھی ریاکاری میں داخل ہے۔

جواب: اس قسم کا عمل خالص ریاء کارانہ عمل ہے۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ عمل میں مراد کا اعتبار ہوتا ہے۔ اس کا اعتبار نہیں ہوتا جس سے مراد طلب کی جا رہی ہو سلہٰذا عمل سے تیری مراد اگر دنیوی نفع اور فائدہ ہو تو بہر حال یہ ریاء ہے چاہے خدا تعالیٰ سے یہ مراد طلب کی جا رہی ہو یا لوگوں سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

من کان یرید حرث الاخرۃ	جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ رکھتا ہو۔ تو
نزد له فی حرثه ومن کان	ہم اس کی اس کھیتی میں اضافہ کریں گے۔ اور
یرید حرث الدنیا نوته منها	جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم اسے کچھ دے
وماله فی الاخرۃ من	دیتے ہیں۔ لیکن آخرت میں اسے کچھ حصہ نہیں
نصیب۔	ملے گا

اور لفظ ریاء کا اعتبار نہیں۔ بلکہ نیت اور مراد کا اعتبار ہے اور یہ لفظ رویۃ سے مشتق ہے۔ اس سے اشتقاق کی وجہ یہ ہے کہ یہ ارادہ فاسدہ اکثر و بیشتر لوگوں کی طرف سے اور ان کے دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

سوال: اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ سے دنیا اس لیے طلب کرے کہ وہ لوگوں کے سامنے دست حاجت دراز کرنے سے بچے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت میں دل جمعی سے مصروف و مشغول رہ سکے تو کیا ایسا قصد و ارادہ بھی ریاء میں داخل ہے۔

جواب: لوگوں کے سامنے دست حاجت دراز کرنے سے بچنا کثرت مال وجاہ اور سامان دنیا کی زیادتی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ چیز تو قناعت اور خدا تعالیٰ پر کامل بھروسے اور توکل سے ہوتی ہے لیکن اگر طلب دنیا سے اس کا مقصد یکسوئی سے عبادت میں مصروف ہونا ہو تو اس طرح کا مقصد وارادہ ریاء میں داخل نہیں۔ لیکن اس سے وہی چیزیں مراد ہوں گی جو آخرت اور اسباب آخرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس کا قصد بھی قطعاً آخرت کی تیاری سے ہی متعلق ہو۔ اگر کسی عمل خیر سے اس قسم کا ارادہ ہو تو وہ ریاء نہیں۔ کیونکہ دنیوی امور اس ارادہ سے خیر بن جاتے ہیں، یا اعمال آخرت کے حکم کے تحت آجاتے ہیں۔ اور خیر کا ارادہ ریاء نہیں ہو سکتا۔ یوں ہی اگر تم یہ ارادہ کرو کہ لوگوں میں تمہاری عزت ہو اور مشائخ اور مذہبی رہنما تم سے محبت کریں۔ لیکن اس سے تمہارا مقصود یہ ہو کہ تمہیں اہل حق کے مذہب کی تائید و تقویت کی قدرت حاصل ہو۔ یا اس طرح مؤثر طور طریقہ پر اہل بدعت کا رد کر سکو، تاکہ اس طرح ٹھوس طریقہ سے علم دین کی اشاعت کر سکو۔ اور لوگوں کو عبادت کی تحریض و ترغیب دے سکو۔ اپنے نفس کی عظمت و بزرگی اور حصول دنیا کی نیت نہ ہو تو دین سے متعلق اس طرح کے تمام مضبوط ارادے اور اچھی نیتیں ریاء میں داخل نہیں۔ کیونکہ درحقیقت ان سے مقصود آخرت ہے۔

میں نے بعض مشائخ سے پوچھا کہ کئی اولیاء اللہ کی عادت ہے کہ وہ عسرت و تنگی کے ایام میں سورہ واقعہ پڑھتے ہیں۔ کیا ان کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ اس سے اللہ تعالیٰ ان کی اس عسرت اور تنگی کو دور کرے اور انہیں رزق کے معاملہ میں فراخی اور وسعت عطا کرے۔ کیا عمل آخرت سے حصول دنیا کا ارادہ کرنا درست ہے۔

بعض مشائخ کی طرف سے اس کا جو جواب مجھے ملا اس کا مفہوم یہ تھا کہ اولیاء کرام کی مراد و نیت اس سے یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قناعت عطا کرے۔ اور اتنی مقدار میں روزی عطا کرے جس سے وہ عبادت الٰہی بجالاتے رہیں۔ اور درس و تدریس کی قوت بحال رہے۔ اور اس طرح کا ارادہ نیک ارادہ ہے۔ دنیا کا ارادہ نہیں۔

جاننا چاہیے کہ عسرت و تنگی کے وقت فراخی رزق کے لیے اس سورت کو پڑھنے کا معمول بنانا خود حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے بوقت وفات سب مال خیرات کر دیا اور اپنی اولاد کے لیے کچھ نہ چھوڑا تو اس فعل پر جب

ان کو ڈانٹا گیا تو انہوں نے جواب دیا میں اپنی اولاد کے لیے سورۂ واقعہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
سنت کے اسی اصول کے مطابق ہمارے علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی باتیں اختیار کیں۔ ورنہ بحمدہ تعالیٰ انہیں دنیا کی عسرت اور فراخی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو اسباب دنیا کی تنگی اور عسرت کو غنیمت جانتے تھے۔ اور اس میں ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور مالی تنگدستی کو اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم تصور کرتے تھے۔ اور جب اپنے آپ کو ساز و سامان دنیوی کی وسعت و کشادگی میں دیکھتے تو سخت ڈرتے تھے۔ حالانکہ اکثر لوگ دنیوی مال و نعمت کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم خیال کرتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ وسعت مال و دولت ان کے لیے استدراج اور مصیبت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے عسرت اور تنگدستی کو کیوں اللہ تعالیٰ کا احسان تصور نہ کریں جب کہ ان کی اندرونی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ عموماً بھوک کی حالت میں ہوتے ہیں۔ متقدمین صوفیاءؒ کہا کرتے تھے بھوک ہمارا سرمایہ ہے۔ اس بارے میں اہل تصوف کا مذہب یہ ہے۔ اور میرا اور میرے مشائخ کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور ہمارے اسلاف کی سیرت بھی یہی تھی۔ باقی رہا اس سلسلے میں بعض متاخرین کا کوتاہی کرنا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

رزق کی وسعت اور تنگی کے متعلق ان کا نقطہ نظر میں نے اس لیے بیان کیا ہے تاکہ مخالف جہالت کی وجہ سے ان کو حقیر اور مجبور خیال نہ کرے۔ یا صحیح العقیدہ مبتدی ان کے متعلق غلطی میں مبتلا نہ ہو۔

سوال: اہل علم، اصحاب تجرد و زہد اور ارباب صبر و قناعت کو یہ کب لائق ہے کہ وہ حصول دنیا کے لیے وظیفے کرتے پھریں؟

جواب: جب کہ مقصود حصول قناعت اور تیاری آخرت ہو تو پھر قوت لایموت کے لیے کوئی وظیفہ پڑھنا یا قرآن کی سورۃ پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔ ہاں حرص و شہوت کی پیروی کے لیے ایسا کرنا درست نہیں۔ نیز عسرت اور تنگدستی سے پریشان ہو کر یہ راستہ اختیار کرنا بھی ٹھیک نہیں۔

اور جب مقصود تیاری آخرت ہو تو اس کے پیچھے اکثر و بیشتر تو اپنے دل میں قناعت محسوس کرے گا۔ اور بھوک اور ضعف و لاغری کو بھی مفقود پائے گا۔ نیز طعام سے بے نیازی اور عدم حاجت بھی محسوس کرے گا۔ جن لوگوں نے اس کا تجربہ کیا ہے ان کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔

اللہ تعالیٰ تجھے توفیق دے اس تحقیق کو ذہن میں رکھ۔

عُجب

دوسرا امر قادح عُجب ہے۔ اس سے بچنا دو وجہ سے ضروری ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ عجب کے باعث انسان توفیق وتائید ایزدی سے محروم ہو جاتا ہے، عجب میں گرفتار انسان انجام کار ذلیل وخوار ہوتا ہے، جب انسان توفیق وتائید خداوندی سے محروم ہو جاتا ہے تو ہلاکت وبربادی کا جلد شکار ہوتا ہے، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں۔ بخل جس کی پیروی کی جائے خواہش نفسانی جس کا انسان متبع بن جائے۔ اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا جاننا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عجب عمل صالح کو تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حواریین سے فرمایا۔ بہت سے چراغ ہیں جن کو ہوا نے بجھا دیا اور بہت سے عابد ہیں جن کو عجب نے تباہ کر دیا۔ جب انسانی زندگی سے مقصود اور غرض وغایت عبادت وبندگی ہے اور یہ خصلت انسان کو اس مقصود سے محروم کر دیتی ہے کہ انسان کسی خیر کو حاصل نہیں کر سکتا اور اگر کچھ تھوڑی بہت نیکی حاصل بھی کرے تو یہ عجب اس کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ تو بہت ضروری ہے کہ انسان اس سے بچے اور محفوظ رہے۔ واللہ ولی التوفیق والعصمۃ۔

عجب کی حقیقت اور اس کا معنی:

اگر تم یہ دریافت کرو کہ عجب کی حقیقت اور اس کا معنی کیا ہے۔ نیز اس کی تاثیر اور اس کا حکم اور نتیجہ کیا ہے۔ اس کی وضاحت ہونی چاہیئے، تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ عُجب کی حقیقت یہ ہے۔

العجب استعظام العمل الصالح	اپنے اعمال صالحہ کو عظیم خیال کرنے کا نام عُجب ہے۔

ہمارے علماء کرام علیہم الرحمتہ کے نزدیک عجب کی تفصیل یہ ہے کہ بندہ یہ ذکر واظہار کرے کہ عمل صالح کی فضیلت وبزرگی فلاں شے سے یا مخلوق یا نفس سے ہوئی ہے۔ نہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کا حصول ہوا ہے۔ علماء کرام کا بیان ہے کہ بعض اوقات عجب میں مبتلا انسان تینوں چیزوں کا ذکر کرتا ہے۔ بعض اوقات دو کا ذکر کرتا ہے۔ اور بعض اوقات صرف ایک کا ذکر کرتا ہے۔ اور عجب کی ضد احسان اور منت ہے۔ احسان ومنت سے یہ مراد ہے کہ انسان یہ ظاہر کرے کہ یہ سب بزرگی و

فضیلت خداوند تعالی سبحانہ کی تائید و توفیق سے ہے۔ اور مجھے یہ حاصل شدہ شرف و بزرگی اور مرتبہ و مقام عطا کرنے والا رب تعالیٰ ہے۔ عجب کے اسباب و علامات کے ظہور کے وقت خدا تعالیٰ کے احسان کا ذکر کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اور عام اوقات و حالات میں اس احسان خداوندی کا تذکرہ مستحب و بہتر ہے۔

باقی رہی عجب و خودستائی میں عمل صالح میں تاثیر تو اس کے متعلق بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ عجب والے انسان کے اعمال کو ضائع کرنے کے متعلق انتظار کی جاتی ہے۔ اگر وہ موت سے پہلے توبہ کرلے تو اس کے اعمال ضائع ہونے سے بچ جاتے ہیں، ورنہ ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مشائخ کرامیہ میں سے محمد بن صابر کا یہی مذہب ہے۔ محمد بن صابر کے نزدیک اعمال کے ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عمل صالح ہر قسم کی اچھائی سے خالی ہو جائے کہ اجر و ثواب اور مدح تک کا استحقاق ختم ہو جائے محمد بن صابر کے علاوہ دوسروں کے نزدیک اعمال ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عمل صالح پر گنا گنا ثواب جو ملنا تھا وہ ضائع ہو جاتا ہے عمل کا اصل ثواب باقی رہتا ہے۔

سوال: عارف شخص پر یہ بات کیسے پوشیدہ رہ سکتی ہے کہ عمل صالح کی توفیق دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور وہی اپنے فضل و احسان سے بلند مرتبہ اور کثیر ثواب عطا کرتا ہے۔

جواب: دراصل یہاں ایک عمدہ ذخیرہ اور لطیف نکتہ ہے جس کو ذہن نشین کر لینا جواب کے تمام پہلو واضح کر دیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عجب کے معاملہ میں لوگ تین قسم ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ہر حال میں عجب و خودستائی کا شکار ہیں۔ اور یہ معتزلہ اور قدریہ کا گروہ ہے جو اپنے افعال کا خود اپنے آپ کو خالق جانتا ہے۔ اور اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا اپنے اوپر کوئی احسان تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس کی مدد و نصرت اور توفیق اور لطف خاص کا منکر ہے۔ اور یہ خرابی انہیں اس شبہ کی بنا پر لاحق ہوتی ہے جس نے ان کو متاثر کیا ہوا ہے

دوسرا گروہ وہ مستقیم الحال کاملین ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے احسان کو ہی یاد کرتے ہیں۔ ان کو اپنے کسی بھی عمل میں عجب لاحق نہیں ہوتا۔ اور یہ اس بصیرت کے باعث ہے جو ان کو عطا ہوتی ہے۔ اور اس تائید کی وجہ سے ہے جو انہی کے ساتھ خاص ہے۔

تیسرا گروہ عام اہل سنت و جماعت ہیں جو جب بیدار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا ہی احسان مانتے ہیں اور جب ان پر غفلت طاری ہوتی ہے تو عجب اور خودستائی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ عارضی غفلت

سستی اور کمی بصیرت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

سوال: قدریہ اور معتزلہ کے افعال و اعمال کی صورتِ حال کیا ہے۔ کیا اس عجب کی وجہ سے ان کے سب اعمال ضائع اور برباد ہیں؟

جواب: اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ان کے تمام اعمال ضائع اور بے کار ہیں۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہی خراب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں اگر ایک شخص فی الجملہ اسلامی عقیدہ رکھتا ہو تو تھوڑی بہت اعتقادی غلطی سے اس کے اعمال ضائع نہیں ہوتے جب تک ہر عمل میں عُجب موجود نہ ہو۔ جس طرح عقیدہ اہل سنت ہوتے ہوئے یہ ضروری نہیں کہ عجب سے محفوظ رہے۔ جب تک خصوصیت سے اللہ تعالیٰ کے احسان کا اظہار نہ کرے۔

سوال: کیا ریاء اور عُجب کے علاوہ بھی کوئی چیز اعمال کو نقصان دیتی ہے۔

جواب: ان کے علاوہ بھی بہت ایسی چیزیں ہیں جو اعمال کو خراب کرتی ہیں ہم نے ان دو کا خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ بربادی اعمال میں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ بعض مشائخ کا قول ہے۔ کہ بندہ پہ لازم ہے کہ اپنے عمل کو دس چیزوں سے محفوظ رکھے۔ (۱) نفاق سے (۲) ریاء سے (۳) لوگوں سے میل جول سے (۴) احسان جتلانے سے (۵) اذیت دینے سے (۶) ندامت سے (۷) عجب سے (۸) حسرت سے (۹) سستی اور کاہلی سے (۱۰) ملامت کے خوف سے۔ یعنی اگر میں نے فلاں نیک کام کیا تو لوگ ملامت کریں گے۔ پھر ہمارے شیخ مکرم رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں سے ہر ایک کی ضد اور ان سے اعمال کو جو ضرر پہنچتا ہے سب بیان کیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں نفاق کی ضد اخلاص عمل ہے اور ریاء کی ضد طلب ثواب میں اخلاص پیدا کرنا ہے۔ اور لوگوں سے میل جول کی ضد علیحدگی اور تجرید و تفرید ہے۔ اور احسان جتلانے کی ضد اپنے عمل کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ اور اذیت دینے کی ضد اپنے عمل کی حفاظت ہے۔ ندامت کی ضد نفس کو مضبوط اور قائم کرنا ہے۔ اور عجب کی ضد اللہ تعالیٰ کے احسان کا اظہار ہے۔ حسرت کی ضد نیکی اور خیر کو غنیمت جاننا ہے۔ سستی کی ضد توفیق خداوندی کی تعظیم کرنا ہے۔ خوف ملامت کی ضد اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کا ڈر ہے۔

نفاق سے عمل ضائع اور برباد ہوتا ہے۔ ریاء عمل کو مردود بناتا ہے۔ احسان جتلانا اور اذیت دینا صدقہ کے ثواب کو برباد کرتے ہیں۔ اور بعض مشائخ کے نزدیک من و اذی سے اصل عمل کا ثواب

ضائع نہیں ہوتا البتہ دگنا تگنا ثواب جو ملنا تھا وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن نیک عمل پر ندامت بھی بالاتفاق عمل کو بے کار کرتی ہے۔ عجب سے اعمال کا زائد ثواب ضائع ہوتا ہے۔ اور حسرت اور سستی اور خوف ملامت سے عمل کا ثواب کم ہوتا ہے۔ اور عمل کی قدر و قیمت ناقص ہو جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں اعمال کا مقبول ہونا یا مردود ہونا اصحاب تحصیل کے نزدیک مختلف قسم کی عظمتوں اور نقصانات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اعمال کے حبط و ضائع ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض اوقات تو بالفعل اعمال کا نفع برباد ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اعمال میں ریاء وغیرہ کی خرابی عمل کے بے کار ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے۔ بعض اوقات اعمال پر ثواب نہیں ملتا۔ اور بعض دفعہ اعمال کا زائد ثواب نہیں ملتا۔ ثواب تو عمل کا اصل نفع ہے جو عقلاً انسان کو ملنا چاہیے۔ اور عمل کی حالت ثواب کی متقاضی اور اس کا قرینہ ہوتی ہے۔ اور ثواب کا دگنا تگنا ہو جانا اصل ثواب پر اضافہ اور زیادتی جو اللہ تعالیٰ انسان کو عطا کرتا ہے۔ اور اعمال کی قدر و قیمت میں اضافہ اور خارجی قسم کے حالات و قرائن سے عمل میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً نیک لوگوں سے حسن سلوک کرنا بھی بڑے ثواب کی چیز ہے۔ مگر والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے میں اس سے بھی زیادہ ثواب ہے۔ پھر ایک نبی سے حسن سلوک سے پیش آنا بہت ہی زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ تو بعض اوقات ایک عمل کی قدر و قیمت تو زیادہ ہوتی ہے۔ مگر اس کا ثواب دگنا تگنا نہیں ملتا یہ گفتگو خلاصہ ہے اس کا جو اس باب میں میرے ذہن میں آئی ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھو۔ وباللہ التوفیق

فَصْل

عُجب اور ریا سے بچنے کے اُصُول

تم پر عُجب و ریاء جیسی خوفناک شے کا عبور اور قطع کرنا بھی ضروری ہے۔ جو کئی طرح کی ہلاکتوں اور رہزنی کی واردات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ طاعات اور نیکیوں کا سرمایہ رکھنے والے کے لیے ان گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس راستے کی تمام مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اور ان گھاٹیوں کو عبور کرنے سے ہی عابد کو درحقیقت عبادت کا معزز اور عمدہ سرمایہ ہاتھ آتا ہے۔ اور اس سرمایے کا ضائع ہونے کا زیادہ تر خطرہ اسی گھاٹی میں پیش آتا ہے۔ کیونکہ اس گھاٹی میں رہزن شیطان کے ایسے ایسے مقامات اور اعمال کی تباہی و بربادی کے ایسے ایسے مواضع موجود ہیں جن میں اس سرمایہ کے چھن جانے کے زبردست خطرات پائے جاتے ہیں۔ اور ایسی ایسی آفات نمودار ہوتی ہیں جو بندے کی عبادت و طاعت کو بے کار کرکے رکھ دیتی ہیں۔ سب سے زیادہ کثیر الوقوع، سب سے عظیم یہ دو رہزن ہیں۔ ایک ریاء دوسرا عجب۔ لہٰذا ہم یہاں ان دونوں سے بچاؤ کے چند ضروری اور جامع اصول ذکر کرتے ہیں ان کو ذہن نشین کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ تو ان کے نقصانات سے بچا رہے گا۔

پہلا اصول:

ریاء کے بارے میں سب سے پہلے میں خدا تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کرتا ہوں۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ	اللہ تعالیٰ وہ قادر ذات ہے جس نے سات
ومن الارض مثلھن یتنزل	آسمان پیدا کیے اور انہی کی مقدار میں زمینیں
الامر بینھن لتعلموا ان اللہ	پیدا کیں۔ زمین و آسمان کے درمیان حکم نازل
علی کل شیء قدیر و ان اللہ	ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر
قد احاط بکل شیء علما ۔	ہے۔ اور اس کے علم نے ہر شے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے گویا یوں فرمایا ہے۔ میں نے آسمان پیدا کیے اور زمینیں پیدا کیں۔ اور ان دونوں کے درمیان اپنی صناعی کے عجیب و غریب نمونے بھی پیدا کیے، یہ سب کچھ پیدا کرکے

تیری نظر عبرت کے حوالے کر دیا تاکہ تو خود مشاہدے سے جان لے کہ میں قادر بھی ہوں، عالم بھی ہوں۔ اور اے انسان تیرے نقص اور ضعف کا یہ حال ہے کہ دو رکعت نماز پڑھتا ہے مگر اس میں بھی تجھ سے کئی طرح کی کوتاہی واقع ہو جاتی ہے۔ اور کئی قسم کے عیوب و نقائص رہ جاتے ہیں۔ میں چونکہ قادر ہونے کے ساتھ ساتھ عالم بھی ہوں اس لیے تیری ان دو رکعتوں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ مگر تو اپنی اس حقیر سی عبادت کے بارے میں میری نظر میرے علم میری مدح و ثناء اور میری قدر دانی پر کفایت نہیں کرتا۔ بلکہ تو اس کا طالب ہوتا ہے کہ لوگوں کو تیری اس عبادت کا حال معلوم ہو تاکہ لوگ تیری مدح و ثناء کریں۔ کیا تیرا یہ رویہ وفاداری کا رویہ ہے۔ کیا یہ دانشمندی کی بات ہے۔ ایسا رویہ کوئی عقلمند اپنے لیے اختیار نہیں کرتا۔ تجھ پر افسوس تو بڑی بے سمجھی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

دُوسرا اُصول:

جس شخص کے پاس ایک نفیس شے ہو جسے بیچ کر وہ لاکھوں دینار وصول کر سکتا ہو پھر وہ ایک پیسے کے عوض فروخت کر دے تو کیا یہ عظیم خسارا نہیں کہلائے گا۔ اور یہ انتہائی درجہ کا نقصان نہیں ہوگا۔ اور اس کا یہ فعل اس کی پست ہمتی اور قصور علم کی دلیل نہیں ہوگی اور یہ اس کی کمزوری رائے اور بے عقلی کا ثبوت نہیں؟ ضرور اس کی کم عقلی کا ثبوت ہے۔ بعینہ یہی حالت اس بندے کی ہے جو اپنے عمل سے خدا تعالےٰ کی رضاء، اس کی قدر دانی، اس کی مدح و ستائش اور اس کے ثواب کو چھوڑ کر مخلوقات کی مدح و ستائش اور کمینی دنیا کا طلب گار ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رضاء و ثواب کے مقابلے میں مخلوق کی مدح و ثناء اور دنیا کی طلبگاری لاکھوں دینار کے مقابلے میں ایک پیسے سے بھی کم حیثیت رکھتی ہے بلکہ تمام دنیا و مافیہا بلکہ ایک دنیا نہیں اس طرح کی بیسیوں دنیا بھی خدا تعالیٰ کی رضاء کے سامنے ہیچ اور بے حیثیت ہیں۔ کیا یہ خسران مبین نہیں کہ اپنے نفس کو اعمال صالحہ کے عوض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی عنایات عظیمہ شریفہ کو چھوڑ کر ان حقیر اور کمینی چیزوں کو چاہے اور قبول کرے۔ پھر اگر کمینی دنیا کی چاہت اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آ سکتے تو پھر بھی آخرت ہی کو چاہو دنیا اس کے ساتھ خود بخود مل جائے گی۔ بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی رضاء اور خوشنودی کے ہی طلب گار بنو اللہ تعالیٰ تمہیں دارین کی نعمتوں سے مالا مال کر دے گا۔ کیونکہ وہ دنیا و آخرت سب کا مالک ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ اس آیہ میں بیان فرماتا ہے۔

من کان یرید ثواب الدنیا فعند   جو شخص دنیا کا طالب ہو تو اس کو دنیا بھی خدا

اللہ ثواب الدنیا والاخرۃ۔	ہی سے طلب کرنی چاہیے کیونکہ دنیا و آخرت دونوں کی نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ان اللہ لیعطی الدنیا بعمل الاخرۃ ولا یعطی الاخرۃ بعمل الدنیا۔	اللہ تعالیٰ نیک اعمال کے طفیل دنیا بھی عطا کر دیتا ہے۔مگر اعمال دنیوی کے ساتھ آخرت عطا نہیں کرتا۔

تو جب تم نیت خالص کر لو اور آخرت کے لیے دنیوی افکار سے ہمت خالی کر لو۔ تو تمہیں دنیا و آخرت مل جائیں گی۔ لیکن اگر تم نے صرف دنیا کو ہی چاہا تو آخرت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اور بسا اوقات اُتنی دنیا بھی تم کو نہ ملے گی جتنی تم چاہتے تھے۔ اور حسب منشا دنیا تم کو مل بھی گئی تو پھر بھی وہ چند دن کی بہار ہے۔ تو طالب دنیا بن کر تم نے دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ مول لے لیا۔ لہٰذا دانشمندی کا ثبوت دو۔

تیسرا اُصول:

وہ مخلوق جس کے لیے تم کام کرو گے اور جس کی رضا کے طالب بنو گے اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم اس کی رضا کے لیے یہ کام کر رہے ہو تو وہ تمہیں بُرا جانے گی اور تم پہ ناراض ہو گی۔ اور تمہیں ذلیل اور ہلکا جانے گی۔ تو ایک عقلمند آدمی اس کے لیے کوئی کام کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا جس کو اگر پتہ چل جائے کہ وہ میری رضا کے لیے کام کر رہا ہے تو اس پہ ناراض ہو۔ اور اُس کو ذلیل جانے لہٰذا اسے مسکین بندے اس کی رضاء و خوشنودی کے لیے کام کر اور اس کو اپنا مقصود اور اپنی کوششوں کا مرکز بنا جو تجھ سے محبت کرے۔ جو تجھے نعمت عطا کرے اپنی رحمت تجھ پر نچھاور کرے۔ تیری عزت کرے۔ یہاں تک کہ تجھے اجر و ثواب دے کر خوش اور راضی کرے۔ اور تجھے سب سے بے نیاز کر دے۔ اگر تو عقلمند ہے تو اس نکتہ کو ذہن میں بٹھا۔

چوتھا اُصول:

جس شخص کے پاس کوشش و سعی کا ایسا سرمایہ موجود ہو جس کے ذریعہ وہ دنیا میں سب سے بڑے بادشاہ کی رضاء اور خوشنودی حاصل کر سکتا ہو۔ لیکن وہ اس سے بادشاہ کی خوشنودی تو حاصل

نہ کرے بلکہ اس سے ایک جاروب کش کی رضاء وخوشنودی کا خواہاں بنے تو اس کی یہ حرکت اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ شخص بے وقوف اور احمق ہے۔ صائب الرائے نہیں۔ بدبخت اور بدقسمت ہے۔ سب لوگ اسے کہیں گے جب عظیم بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا بہتر ہے۔ یہ ممکن تھا تو تو نے اسے ترک کر کے ایک جاروب کش کی خوشنودی حاصل کرنے میں کیا بہتری محسوس کی۔ خاص کر جب کہ بادشاہ کی ناراضگی کی وجہ سے وہ جاروب کش بھی تجھ سے ناراض ہو گا۔ تو اس طرح دونوں کی خوشنودی سے تو ہاتھ دھو بیٹھا۔ بعینہٖ یہی حال ریاء کار انسان کا ہے۔ جب کہ انسان اللہ رب العالمین کی جو انسان کی تمام مہمات ومشکلات کے لیے کافی ہے۔ رضاء اور خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ تو حقیر، ضعیف، بے وقعت مخلوق کی رضا جوئی کی کیا ضرورت وحاجت ہے۔ پھر اگر تمہاری ہمت کمزور ہو، اور تم بصیرت سے خالی ہو کہ لامحالہ رضاء مخلوق کے ہی طالب بنو تو ایسی صورت میں بھی تمہیں اپنا ارادہ غیر کی رضا سے خالی کرنا چاہیے اور اپنی سعی وکوشش خالص خدا تعالیٰ کے لیے ہونی چاہیے کیونکہ لوگوں کے قلوب اور ان کی پیشانیاں اس کے قبضہ میں ہیں۔ وہ دلوں کو تیری طرف جھکا دے گا۔ اور نفوس انسانی کو تیرا گرویدہ بنا دے گا اور لوگوں کے سینے تیری محبت والفت سے لبریز کر دے گا۔ تو اس طرح تمہیں، وہ کچھ ملے گا جو تم اپنی کوشش اور قصد وارادے سے حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن اگر تم اپنی کوششوں کو خدا تعالیٰ کے لیے خالص نہ کرو بلکہ رضاء مخلوقات کے ہی طالب بنو تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے دل تم سے پھیر دے گا۔ اور لوگوں کے دلوں میں تیرے متعلق نفرت ڈال دے گا۔ اور مخلوق کو تجھ پر ناراض کر دے گا۔ تو تمہارے اس رویہ سے خدا تعالیٰ بھی ناراض ہو گیا اور مخلوق بھی ناراض ہو گئی۔ تو ایسے شخص کے خسارے اور محرومی کا کیا ٹھکانا۔

حکایت:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ایک شخص کہا کرتا تھا خدا کی قسم میں ایسی عبادت کروں گا جس سے لوگوں میں میرا چرچا ہو۔ یہ شخص نماز کے لیے سب سے پہلے مسجد میں داخل ہوتا اور سب سے آخر مسجد سے نکلتا۔ اوقات نماز میں ہر وقت نماز پڑھتا ہی نظر آتا۔ ہمیشہ روزہ دار رہتا۔ مجالس ذکر میں پابندی سے شریک ہوتا۔ سات ماہ کا عرصہ وہ اسی طرح کرتا رہا۔ لیکن اس کے متعلق لوگوں کا رویہ یہ تھا کہ جب بھی کہیں سے گزرتا تو سب لوگ یہی کہتے اللہ تعالیٰ اس ریاکار کو دیکھے اور سنبھلے۔ آخر اس نے اپنے آپ پر ملامت کی اور کہا کہ میری عبادت اور بندگی تو ضائع گئی اور اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ آئندہ کے

پہلے میں بندگی و عبادت صرف رضا الٰہی کے لیے کروں گا۔اس نے عبادت میں پہلے کی نسبت مزید اضافہ نہ کیا۔ بلکہ اتنی ہی مقدار میں کرتا رہا جتنی مقدار میں پہلے کرتا تھا۔اس نے صرف نیت میں تبدیلی کی اور اس میں اخلاص پیدا کیا۔اس کے بعد جہاں سے بھی وہ گزرتا سب یہی کہتے اللہ تعالیٰ فلاں شخص پر رحمت نازل فرمائے۔یہ حکایت بیان کرنے کے بعد حضرت امام حسن بصری علیہ الرحمۃ نے یہ آیت پڑھی

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اللہ تعالیٰ
سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۔	عنقریب ان کے لیے دوستی اور مودت پیدا کر دے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی ان سے دوستی کرے گا اور لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی دوستی اور مودت ڈال دے گا۔

کسی نے بہت ٹھیک کہا ہے :

(۱)	یا مبتغی الحمد والثوابا	فی عمل تبتغی محالا
(۲)	قد خیب اللہ ذا ریاء	وابطل السعی والکلالا
(۳)	من کان یرجو لقاء رب	اخلص من خوفہ الفعالا
(۴)	الخلد والنار فی یدیہ	فراٰہ یعطیک النوالا
(۵)	والناس لا یملکون شیئا	فکیف رایتہم ضلالا

ترجمہ اشعار :

(۱) اے لوگوں سے حمد و ثواب کے طالب تو اپنے عمل سے ایک امر محال کا قصد کر رہا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ ریاء کار کو ناکام و نامراد کرتا ہے۔اس کی سعی اور مشقت کو بے کار کر دیتا ہے۔

(۳) جو ملاقات رب تعالیٰ کا امیدوار ہو وہ اس کے ڈر سے اپنے افعال میں اخلاص پیدا کرتا ہے۔

(۴) جنت اور دوزخ اس کے ہاتھ میں ہیں۔اس لیے اپنے اعمال اسی کو دکھا وہ تجھے اپنی عطاؤں سے مالا مال کر دے گا۔

(۵) لوگوں کے قبضہ اختیار میں کچھ نہیں۔تو بے سمجھی کے باعث ان کے لیے ریاکاری کیوں کرتا ہے۔

عُجب کا بیان

ہم اس سے بچاؤ کے لیے بھی چند ضروری اور جامع اصول بیان کرتے ہیں:

پہلا اصول یہ ہے کہ بلاشبہ بندے کا فعل اسی وقت مفید اور قابل اعتبار ہوتا ہے جبکہ اسے محض حصول رضا الٰہی کے لیے کیا جائے۔ ورنہ اس کی مثال اس مزدور کی طرح ہوگی جو کہ سارا دن دو درہموں کے لیے مارا مارا پھرتا ہے اور اس چوکیدار کی طرح ہوگی جو صرف دو پیسوں کے لیے تمام رات جاگتے اپنی آنکھوں سے نکال دیتا ہے اور ایسے جیسا کہ کاروباری لوگ محض چند ٹکوں کے لیے شب و روز اپنے اوقات عزیزہ کو ضائع کرتے رہتے ہیں تو پھر جب بندہ مثلاً محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ایک روزہ رکھتا ہے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی وجہ سے اس روزہ کی جزا کی مثال نہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

انما یوفی الصّٰبرون اجرھم بغیر حساب — مشکلات پر صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر دیا جائے گا۔

اسی حدیث شریف میں وارد ہے۔

اعددت لعبادی الصائمین، مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر۔ — میں نے اپنے روزہ دار بندوں کے لیے ایسا اجر تعیین کر رکھا ہے جس کو کسی آنکھ نے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی کسی کان نے اسے سنا اور نہ ہی کسی کے دل پر اس کا کھٹکا تک گزرا۔

بہر صورت بندہ جب اللہ تعالیٰ کے لیے ایک روز روزہ رکھتا ہے تو اس روزہ کی قیمت اور اجر بے اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح اگر بندہ کسی رات محض حصول رضا الٰہی کی خاطر قیام کرتا ہے تو اس اعتبار سے یہ قیام بیشمار اعزاز اور اہتمام کا مستحق ہو جاتا ہے جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون ○ — کسی نفس کو یہ علم نہیں کہ اس کے اعمال کا بدلہ اس کی آنکھوں کے لیے کس قدر ٹھنڈک کا موجب ہوگا۔

بہر نہج یہ معمولی سی عبادت جس کی قیمت دو درہم یا دو پیسہ تھی جبکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی جائے تو اس کی بے بہا قیمت ہو جاتی ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ اگر ایک کسی گھڑی میں محض رضا الٰہی کے لیے دو رکعتیں پڑھی جائیں بلکہ ایک سانس جس میں لا الٰہ الا اللہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے پڑھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

ومن عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فاولٰئک یدخلون الجنۃ یرزقون فیھا بغیر حساب۔

جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت جبکہ وہ ایماندار ہو تو وہ جنت میں داخل ہوں گے جہاں انہیں بلا حساب و کتاب کھانے کو رزق دیا جائے گا۔

حساب:

تو یہ ایک سانس جس کی دنیاداروں کے ہاں کوئی عزت وقیمت نہیں جبکہ اس کو رضا الٰہی کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے تو کتنے غیر معمولی اعزاز کا مستحق ہو جاتا ہے تو بندے کو دیکھنا چاہیے کہ وہ شب وروز اپنے ان اوقات عزیزہ کو فضول اور بیہودہ کاروبار میں ضائع کرتا ہوا نظر آتا ہے پس عقلمند کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ فعل جو کہ بلا رضا الٰہی کچھ قیمت نہیں رکھتا تھا وہی حصول رضا الٰہی کے نظریہ سے کس قدر شرافت اور احترام کا مستحق ہو جاتا ہے سو اس کا ہر فعل خوشنودی خدا کے لیے ہونا لازمی ہے تاکہ دنیا و آخرت میں ہر طرح سے مفید ثابت ہو اور اس کی یوں ایک مثال دی جاسکتی ہے کہ مثلاً انگور کا گوشہ یا ریحان کا شگوفہ جس کی بازار میں ایک دمڑی یا پیسہ قیمت ہو اگر کوئی اس کو بادشاہ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرے اور وہ بادشاہ اس حقیر سے تحفہ کو شرف قبولیت بخشے اور خوشی سے ایک ہزار اشرفی دیدے تو وہ حقیر شئی حصول رضا کی وجہ سے ایک ہزار دینار کی ہوگئی اور اگر وہ اس کو قبول نہ کرے تو اس کی قیمت وہی پیسہ یا دمڑی پڑے گی اسی طرح بندے کے جملہ اعمال کی کیفیت ہے کہ ان کو دیکھ کر اترانا اور دوسروں کے اعمال کی تحقیر کرنا بندے کے لیے ایک مہلک شئی ہے بلکہ یہ التجا کرنی ضروری ہے کہ اے اللہ یہ سب تیرا ہی فضل وکرم ہے تیری توفیق سے سب کچھ ہوتا ہے کہ بندے کے جملہ اقوال وافعال دنیا و آخرت میں موجب اجر وثواب ہوں۔

اور دوسرا اصل یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ دنیا کے بادشاہ جب کسی آدمی کو کوئی کھانا یا مشروب یا لباس یا چند ایک فانی درہم ودینار عطا کرتے ہیں تو وہ آدمی دن رات اس بادشاہ کی خدمت بجا لاتا ہے حالانکہ اس خدمت میں ذلت بھی ہوتی ہے وہ اس کی خدمت میں اس طرح کھڑا رہتا ہے کہ اس کے پاؤں بے حس ہو جاتے ہیں اور جب بادشاہ اپنی سواری پر سوار ہوتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے کبھی ساری ساری رات اس کے دروازہ پر پہرہ دیتا ہے اور کبھی دشمن سے مقابلہ کی نوبت آتی ہے تو اپنی وہ جان اس پر قربان کر دیتا ہے جو اسے پھر کبھی نہ مل سکے گی اور یہ تمام خدمت اور تکلیف اور خطرات اور نقصان صرف اس تھوڑے سے حقیر منافع کے لیے برداشت کر جاتا ہے حالانکہ حقیقت میں یہ تمام احسانات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور بادشاہ صرف ایک ظاہری

سبب ہوتا ہے۔ پھر تیرا وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا جبکہ تیری کوئی حقیقت نہ تھی پھر تیری تربیت کی اور بہت اچھی کی پھر تجھ پر دینی دنیاوی اور جانی ظاہری اور باطنی منافع کی تجھ پہ بارش برسادی کہ جن کو سمجھنے سے تیری عقل، فہم اور فراست قاصر ہے خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (الآیۃ) — اگر تم اللہ تعالیٰ کے احسانات شمار بھی کرنے لگو تو نہ کر سکو۔

پھر دیکھ کہ تو دو رکعت نماز پڑھتا ہے جن میں کئی ایک قصور اور کوتاہیاں ہوتی ہیں اور پھر اس کے باوجود اس نے تجھ سے آئندہ کے لیے بہترین جزا اور رنگارنگ نوازشات کا وعدہ فرما رکھا ہے اور پھر تو ان رکعات کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور ان پر مغرور ہوتا ہے اگر تو غور کرے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ یہ عقلمندی کا کام نہیں ہے۔ اسے یاد رکھ۔

اور تیسرا اصل یہ ہے کہ ایسا بادشاہ جس کی خدمت دنیا کے بادشاہ اور امراء کرتے ہوں جس کی خدمت میں بڑے بڑے اور سردار لوگ دست بستہ کھڑے ہوں جس کی خدمت پہ دانایان زمانہ اور عقلاء عصر فخر محسوس کرتے ہوں جس کی تعریف عقلاء اور علماء کرتے ہوں جس کے آگے آگے رؤسا اور اکابر دوڑتے ہوں وہ بادشاہ اگر کسی بازاری یا دیہاتی آدمی کو محض اپنے فضل و کرم سے اپنے دروازہ پر حاضر ہونے کی اجازت بخش دے جس کے دروازہ پر بادشاہوں۔ بڑے لوگوں۔ سرداروں اور علماء و فضلاء کی بھیڑ لگی ہو اور پھر وہ بادشاہ اس کو ایک معزز مقام پر جگہ دے اور اس کی خدمت کو بنظر پسند دیکھے حالانکہ اس میں کئی ایک عیب بھی ہوں تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس حقیر انسان پر بادشاہ نے بہت بڑا کرم فرمایا۔ پھر اگر یہ حقیر اپنی ناکارہ خدمت کی وجہ سے بادشاہ پر اپنا احسان جتانے لگے اور اس کو بہت کچھ سمجھے اور اس پہ مغرور ہو تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ حد درجہ کا بیوقوف اور پاگل آدمی ہے جسے کوئی کسی قسم کا ہوش نہیں ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اب سمجھنا چاہیے کہ ہمارا معبود برحق ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی تسبیحات آسمان زمین اور ان کی تمام موجودات کر رہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الآیۃ) — کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد اور تسبیح نہ بیان کرتی ہو۔

اور ایک ایسا معبود ہے جس کے سامنے تمام آسمان اور زمینیں سجدہ ریز ہیں خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے اور اس کے عتبہ عالیہ کے خدام میں سے ہیں جبریل امین، میکائیل، اسرافیل۔ عزرائیل اور عرش اٹھانے

والے فرشتے۔ کرّوبی اور روحانی اور تمام ملائکہ مقربین کہ جن کی تعداد کو اللہ رب العالمین کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا باوجودیکہ ان کے مقامات بڑے بلند ہیں ان کے نفوس پاک ہیں ان کی عبادت بھی بہت بڑی اور زیادہ ہے۔ اور پھر اسی کے باب عالی کے خادم ہیں نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ جو تمام کائنات کا خلاصہ ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے انبیاء اور رسول بھی خدا تعالیٰ کی ان پر رحمتیں اور سلام نازل ہوں حالانکہ ان کے مراتب بڑے بلند ان کے مناقب عزیز اور مقامات بزرگ اور عادات جلیل ہیں۔ پھر علماء۔ ائمہ۔ نیک لوگ اور زاہد بھی اپنے بزرگ مراتب اور پاک اجسام اور عبادات کثیرہ خالصہ کے باوجود بھی اسی کی چوکھٹ کے غلام ہیں۔

اور دنیا کے بادشاہ اور جابر لوگ اس کے دروازہ کے ایک ادنیٰ خادم ہیں نہایت ذلت سے اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں نہایت خضوع و خشوع سے اس کے سامنے اپنے چہرے خاک پر رکھتے ہیں رو رو کر عاجزی کے ساتھ اپنی حاجتیں اس کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کی خداوندی اور اپنی غلامی کا اقرار سجدۂ عبودیت سے کرتے ہیں۔ پھر وہ کبھی ان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے اپنے فضل و کرم سے ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے اپنے کرم سے ان کی تقصیرات سے درگزر کرتا ہے۔ اور پھر اس نے اپنی اس عظمت اور جلال اور بادشاہی اور کمال کے تجھ کو باوجود تیری حقارت، تیرے عیوب اور تیری گندگی کے اپنے دروازہ پر حاضر ہونے کی اجازت بخش دی ہے۔ حالانکہ تیری حیثیت یہ ہے کہ اگر تو اپنے شہر کے سردار سے داخلہ کی اجازت مانگے تو تجھے اجازت نہ ملے اگر اپنے محلہ کے سردار سے گفتگو کرنا چاہے تو وہ تجھ سے نہ بولے اور اگر تو اپنے شہر کے حاکم کے سامنے سجدہ ریز ہو تو وہ توجہ بھی نہ کرے۔

اور اس اللہ نے تجھے اجازت دے رکھی ہے کہ تو اس کی عبادت کرے اس کی ثنا کہے اسے مخاطب کر کے بلکہ اپنی حاجتیں اس پر پیش کرے دل کھول کر باتیں کرے اپنی ضروریات اس سے مانگ لے اور وہ تیری تمام مرادیں پوری کرے۔ پھر وہ تیری ان دو رکعتوں سے خوش ہے حالانکہ ان میں بہت سے عیوب ہیں اور پھر ان پر اتنا ثواب عطا فرماتا ہے کہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور بھی نہیں آسکتا اور پھر تو اپنی ان دو رکعتوں پر مغرور ہے اور ان کو بہت کچھ سمجھتا ہے اور بڑا جانتا ہے اور اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کو نہیں سمجھتا تو کتنا برا غلام ہے اور کتنا جاہل انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی درخواست ہے اور اس جاہل نفس کی شکایات اسی کی بارگاہ میں ہیں اور صرف اسی پر بھروسہ ہے۔ اس کو یاد رکھ۔

فصل :

اب ایک اور طریقہ سے دیکھو کہ اگر کوئی بہت بڑا بادشاہ تحائف اور ہدایا نذر کرنے کی اجازت بخشے اور اس کی بارگاہ میں امراء۔ کبراء۔ رؤسا، عقلا اور دولت مند لوگ قیمتی ہیروں، نفیس ذخیروں اور بے اندازمال و دولت کے تحائف پیش کرنے لگیں پھر اگر کوئی سبزی فروش کوئی معمولی سبزی یا کوئی دیہاتی انگور کا گچھا پیش کرے جس کی قیمت ایک دمڑی یا ایک رتی بھر ہو اور ان بڑے بڑے لوگوں اور دولت مندوں کے گروہ میں گھس جائے جو بہترین تحائف لے کر کھڑے ہوں اور پھر وہ بادشاہ اس فقیر سے اس کا ہدیہ قبول فرمائے اور اسے پسندیدگی اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کے لیے خلعتِ فاخرہ اور عزت و احترام کا حکم صادر فرمائے تو کیا یہ اس کا انتہائی فضل و کرم نہ ہو گا۔ پھر اگر یہ فقیر بادشاہ پہ احسان جتانے لگے اور اپنے ہدیہ کو بہت کچھ سمجھے اور بادشاہ کے احسان کا تذکرہ کرنا بھول جائے تو کیا اسے دیوانہ۔ بدحواس یا بیوقوف اور بدتمیز اور انتہائی نادان نہ سمجھا جائے گا

اب تجھ پر لازم ہے کہ جب تو خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو اور دو رکعت ادا کرے تو فارغ ہونے پر ذرا سوچ کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنے خادم کھڑے ہوئے ہوں گے زمین کے مختلف گوشوں میں۔ جنگلوں سمندروں۔ پہاڑوں اور شہروں میں کئی ایک استقامت والے۔ صدیق۔ خائف۔ مشتاق۔ مجتہدین اور عاجزی کرنے والوں کے گروہ اور غور کر کہ اس گھڑی میں خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں کتنی ہی خالص عبادت اور کھوٹ سے مبرا خدمت پیش ہو رہی ہو گی اور وہ بھی ڈرنے والے لوگوں، پاک زبانوں، رونے والی آنکھوں۔ آباد دلوں۔ پاک سینوں اور پرہیزگار لوگوں کی طرف سے اور تیری نماز اگرچہ تو نے اس کو اچھی طرح ادا کرتے ہیں اس کے اخلاص اور مضبوطی میں اپنی طاقت کے مطابق کوشش کی ہو گی لیکن پھر بھی اس بادشاہ عظیم کی بارگاہ میں پیش ہونے کے قابل کہاں ہے اور ان عبادات کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہے جو وہاں پیش ہو رہی ہیں کیونکہ تو نے اسے غافل دل سے ادا کیا جس میں طرح طرح کے عیوب شامل تھے بدن گناہوں کی آلودگی سے ناپاک تھا اور زبان فضول اور گناہ کی باتوں سے لتھڑی ہوئی تھی پھر ایسی نماز اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کے قابل کہاں تھی اور رب العزت کی بارگاہ میں ہدیہ کرنے کی اس میں کونسی صلاحیت تھی۔

ہمارے شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا اے عقلمند غور کر آسمان کی طرف نماز بھیجنے میں تو نے کبھی وہ توجہ کی ہے جو کسی امیر آدمی کے سامنے کھانا پیش کرتے وقت تو کرتا ہے۔ ابو بکر دقاق فرمایا کرتے کہ جب میں نماز سے فارغ ہوتا ہوں تو اس عورت سے زیادہ شرمندگی مجھ پر مسلط ہو جاتی ہے جو زنا سے فارغ ہوئی ہو۔

پھر اللہ تعالیٰ سبحانہ نے محض اپنے فضل و کرم سے ان دو رکعتوں کی قدر افزائی کی اور ان پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ فرمایا حالانکہ تو اس کا غلام ہے اس کا دیا ہوا کھاتا ہے اور پھر یہ عمل بھی اسی کی توفیق اور امداد سے تو نے کیا ہے پھر با وجود ان تمام چیزوں کے تو ان پر مغرور ہے اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسان کو بھول رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ تمام عجائبات میں سے عجیب چیز ہے اور اس کا صدور ایسے جاہل ہی سے ہو سکتا ہے جس میں کوئی عقل نہ ہو اور ایسے غافل سے جس کا کوئی ذہن نہ ہو اور یا پھر کسی مردہ دل سے جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ اس کو یاد رکھ۔ ہم اللہ تعالیٰ ہی سے اس کے فضل و کرم کا واسطہ دے کر بہترین کفایت کا سوال کرتے ہیں۔

فصل :

پھر ان گذارشات کے بعد میں کہوں گا کہ اے انسان اس گھاٹی میں اپنی خواب غفلت سے بیدار ہو ورنہ خسارہ اٹھائے گا۔ یہ گھاٹی بڑی سخت و دشوار گزار۔ نہایت کڑوی اور نقصان دہ ہے جو تجھے اس راہ میں پیش آتی ہے کیونکہ پچھلی تمام گھاٹیوں کے ثمرات یہی آکر منتہی ہوتے ہیں اگر تو یہاں سے بچ کر نکل گیا تو غنیمت اور فائدہ حاصل کریگا اور اگر دوسری طرح کا معاملہ ہوا تو تمام محنت رائگاں جائے گی امیدیں خاک میں مل جائیں گی عمر ضائع ہو جائے گی۔ پھر اب معاملہ یہ ہے کہ اس گھاٹی میں تین امور آکر مجتمع ہو گئے ہیں۔

پہلا یہ ہے کہ معاملہ نہایت باریک ہے اور نقصان بڑا سخت اور خطرات بے انداز۔ معاملہ کی باریکی تو یہ ہے کہ اعمال میں ریاء اور عجب کی راہیں نہایت باریک ہیں ان پر دینی امور میں بصیرت رکھنے والا۔ نہایت عقلمند بیدار دل اور ہوشیار آدمی ہی مطلع ہو سکتا ہے اور ایک جاہل۔ کھنڈرا اور غفلت کی نیند سویا ہوا آدمی کہاں ان کو جان سکتا ہے۔

میں نے اپنے علماء کرام رحمہم اللہ سے نیشاپور میں سنا بیان کرتے تھے کہ عطاء سلمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کپڑا نہایت اچھا بُنا بڑا خوبصورت کپڑا تیار ہوا آپ اسے اٹھا کر بازار لے گئے اور بزاز کو جا کر دکھایا اس نے اس کی قیمت بہت تھوڑی لگائی اور کہا کہ اس میں فلاں فلاں عیب ہیں تو عطاء نے اس کو واپس لے لیا اور رونے لگے اور بڑا سخت روئے بزاز کو اس پر ندامت ہوئی اور آپ سے معذرت کرنے لگا اور عطاء کی مانگی ہوئی قیمت دینے پر تیار ہو گیا تو عطاء نے کہا میں اس لیے نہیں رویا۔ بلکہ رونے کی وجہ یہ ہے کہ میں یہ صنعت جانتا ہوں میں نے اس کپڑے کی مضبوطی اور درستی اور خوبصورتی میں بہت کوشش کی یہاں تک کہ میری دانست میں اس میں کوئی عیب نہ تھا۔ پھر جب اس کے عیوب کو جاننے والے پر پیش کیا تو اس نے اس کے عیوب ظاہر کر دیے جن سے میں بے خبر

تھا پھر ہمارے ان اعمال کا کیا حال ہوگا جبکہ کل وہ خداوند تعالیٰ کے حضور پیش کیے جائیں گے معلوم نہیں ان میں کتنے عیوب اور نقصان ظاہر ہوں گے جن سے آج ہم بے خبر ہیں۔

بعض نیک لوگوں سے روایت ہے کہ میں ایک رات سحری کے وقت بر لب سڑک ایک بالاخانے پر سورۃ طٰہٰ پڑھ رہا تھا جب میں نے سورۃ کو ختم کر لیا۔ تو مجھے کچھ اونگھ سی آگئی میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی آسمان سے نازل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک صحیفہ تھا اس نے وہ میرے سامنے پھیلا کر رکھ دیا تو اس میں وہی سورۃ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی اور ہر کلمہ کے نیچے دس نیکیاں لکھی ہوئی تھیں۔ مگر ایک کلمہ میں نے دیکھا کہ وہ مٹا ہوا ہے اور اس کے نیچے کچھ بھی نہیں لکھا ہوا۔ میں نے کہا میں نے یہ کلمہ بھی پڑھا تو تھا اور نہ اس کا ثواب لکھا ہوا ہے نہ یہ کلمہ ہی لکھا ہوا ہے۔ تو اس آدمی نے کہا تم صحیح کہتے ہو تم نے اسے پڑھا تھا اور ہم نے لکھا بھی تھا مگر ہم نے آسمان سے ایک آواز دینے والے کو سنا اس نے کہا کہ اس کلمہ کو مٹا دو اور اس کا ثواب بھی ختم کر دو تو ہم نے اس کو مٹا دیا۔ اس آدمی نے کہا کہ میں اپنے خواب ہی میں رونے لگا اور ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ ایک آدمی سڑک پر سے گزرا تو اس کو سنانے کے لیے تم نے یہ کلمہ بلند آواز سے پڑھا تھا تو اس کا ثواب ختم ہو گیا۔ اس کو یاد رکھ۔

باقی رہی نقصان کی شدت تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاء اور عجب ایک بہت بڑی آفت ہے جو ایک لحظہ میں واقع ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ستر سال کی عبادت کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ اور ان کے ساتھیوں کی ضیافت کی تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ اس تھال میں روٹی رکھ کر لاؤ جو میں دوسرے حج کے موقع پر لایا تھا پہلے حج والے تھال میں روٹی نہ لانا تو سفیان نے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ اس مسکین نے اتنی سی بات میں اپنے حج کو باطل کر دیا۔

اور بعض نے نقصان زیادہ ہونے کی یہ توجیہ کی ہے کہ وہ تھوڑی سی عبادت جو ریاء اور عجب سے سلامت رہے اس عبادت کی قیمت خدا تعالیٰ کے نزدیک بے اندازہ ہے اور ایسی بہت سی عبادت جسے یہ آفت پہنچ جائے اس کی کوئی قیمت نہیں رہتی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو بچائے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا مقبول عمل کبھی کم نہیں ہوتا۔ اور مقبول عمل کم ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

امام نخعی سے پوچھا گیا۔ کہ فلاں فلاں عمل کا کتنا ثواب ہے آپ نے فرمایا جب وہ قبول ہو جائے تو اس کے ثواب کی کوئی حد نہیں۔

اور وہب سے روایت ہے کہ پہلے لوگوں میں ایک آدمی تھا جس نے ستر سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ایک ہفتہ کے بعد روزہ افطار کیا کرتا تھا اس نے اللہ تعالیٰ سے ایک حاجت کا سوال کیا تو اُس کی وہ حاجت پوری نہ ہوئی۔ وہ اپنے نفس کو ملامت کرنے لگا اور کہنے لگا اگر تیرے پاس کوئی بھلائی ہوتی تو تیری حاجت پوری کر دی جاتی تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو نازل فرمایا اور کہا اے آدم کے بیٹے تیری وہ ایک گھڑی جس میں تو نے اپنے نفس کو بے حقیقت سمجھا وہ تیری پہلی تمام عبادت سے بہتر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عقل مند کو اس کلام پر غور کرنا چاہیئے کیا یہ شدید نقصان نہیں ہے کہ ایک آدمی ستر سال تک تکلیف اور محنت اُٹھائے اور دوسرا ایک گھڑی سوچ بچار کرے تو اُس کی ایک گھڑی کی فکر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ستر سال کی عبادت سے افضل ہو جائے۔ کیا یہ عظیم نقصان نہیں ہے کہ ستر سال سے ایک گھڑی زیادہ بہتر ہو جائے اور ستر سال کی تمام عبادت بیکار چلی جائے۔ خدا کی قسم یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اور اس سے بے خبر رہنا اس سے بھی بڑا نقصان ہے اور وہ خصلت جس کی یہ قیمت ہو اور ایسے خطرات ہوں ضروری ہے کہ اُس سے اجتناب اور پرہیز کی جائے اور اسی معنی میں عقل مند لوگوں کی نگاہ ایسی باریکیوں پر پڑتی ہے۔ پھر وہ ان اسرار کو پہچاننے کا اولاً تو اہتمام کرتے ہیں اور بعد میں اُسی رعایت اور حفاظت کا خیال رکھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ اعمال کی ظاہری کثرت پر نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ شان صفائی میں ہے کثرت میں نہیں۔ وہ کہتے ہیں ایک ہیرا ہزار کوڑیوں سے بہتر ہے۔ لیکن جن لوگوں کا علم کم ہوتا ہے۔ اور جن کی نگاہ اس باب میں قاصر ہے وہ ایسے معانی سے بے خبر ہیں۔ اور وہ دلوں کے عیوب سے بے خبر ہیں اور اپنے نفوس کو رکوع اور سجود اور کھانے پینے سے روک کر تھکا دیتے ہیں۔ اُن کو تعداد اور کثرت نے دھوکا دے رکھا ہے۔ اور وہ صفائی اور بزرگی پر نگاہ نہیں رکھتے اور ایسے اخروٹوں کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دیتی جن میں کوئی گودا نہ ہو۔ اور ایسے مکانوں کی بلند چھتیں کوئی نفع نہیں دیتیں جن کی بنیادیں مضبوط نہ ہوں۔ اور ان حقائق کو صرف عالم لوگ ہی جان سکتے ہیں جن پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کشف ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل و کرم سے ہدایت کا ولی ہے۔

اور باقی رہا خطرات کا بڑا ہونا تو اُس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔

پہلی یہ ہے۔ کہ معبود ایک ایسا بادشاہ ہے۔ کہ جس کے جلال اور عظمت کی کوئی انتہا نہیں اور اُس کے تجھ پر احسانات اتنے ہیں جو حساب اور شمار سے باہر ہیں اور تیرا بدن پوشیدہ عیوب سے آلودہ ہے۔ بیشمار آفات سے بھرا ہوا ہے اور معاملہ خطرناک ہے۔ اگر نفس کی جلدی سے تیرا پاؤں پھسل گیا تو پھر تو محتاج ہوگا کہ عیب دار

بدن اور بُرائی کی طرف میلان رکھنے والے اور بُرائی کا حکم دینے والے نفس سے کسی خالص عمل کا استخراج کرے ایسے طریقہ پر کہ وہ رب العالمین۔ کے جلال اور عظمت کے لائق ہو۔ اور اُسی کی نعمتوں اور احسانات کی کثرت کا شکرانہ بن سکے۔ اور اُسی کی بارگاہ میں پسندیدگی اور قبولیت حاصل کر سکے ورنہ تجھ سے وہ عظیم فائدہ فوت ہو جائے گا جس کے فوت ہونے کو کوئی نفس برضا و رغبت قبول نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ تجھے کوئی ایسی مصیبت پہنچ جائے کہ جس کی تجھے طاقت نہ ہو۔ اور خدا کی قسم یہ ایک عجیب حالت ہے۔ اور ایک عظیم کیفیت ہے۔

باقی رہا اُس بادشاہ کے جلال اور عظمت کا معاملہ اس طرح کہ ملائکہ مقربین ہر وقت دن رات اس کی خدمت میں کھڑے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اُن میں سے اپنی ابتدائے پیدائش سے لے کر قیام میں ہیں اور بعض اُن ہی سے رکوع کی حالت میں اور بعض سجدہ کی کیفیت میں اور بعض اُن میں سے تسبیح و تہلیل میں مشغول ہیں تو قیام کرنے والے کا قیام اور رکوع کرنے والے کا رکوع اور سجدہ کرنے والے کا سجدہ اور تسبیح کہنے والے کی تسبیح اور لا الہ الا اللہ کہنے والے کی تہلیل صور پھونکنے تک برابر چلی جائے گی اور پھر بھی اُن کی عبادت پوری نہ ہوگی پھر بھی جب وہ اس عظیم خدمت سے فارغ ہوں گے تو سب کے سب پکار اٹھیں گے تو پاک ہے۔ جیسا تیری عبادت کا حق تھا ہم اُسے ادا نہیں کر سکے۔

اور یہ رسولوں کے سردار۔ کائنات کا خلاصہ تمام مخلوقات سے زیادہ علم اور فضیلت رکھنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو فرماتے ہیں کہ میں تیری ایسی ثنا بیان نہیں کر سکتا جس ثناء کا تو مستحق ہے۔ اور کہتے ہیں کہ میں تیری اُس تعریف کو بیان کرنے سے قاصر ہوں جس تعریف کا تو مستحق ہے۔ پھر اُس عبادت کا تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے جس کا تو اہل ہے۔ اور آپ ہی تو ہیں جنہوں نے فرمایا کہ کوئی آدمی جنت میں اپنے عمل سے داخل نہیں ہو سکتا۔ صحابہ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول کیا آپ بھی داخل نہیں ہو سکتے تو آپ نے فرمایا جب تک خدا تعالیٰ کی رحمت مجھ کو نہ ڈھانپ لے۔ میں بھی نہیں داخل ہو سکتا۔

باقی رہے انعامات اور احسانات تو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔

اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے احسانات کو شمار کرنے لگو تو شمار بھی نہیں کر سکتے۔

اور جیسا کہ حدیث میں ہے۔

يحشر الناس على ثلثة دواوين۔	لوگوں کے اعمال کے تین دفتر ہوں گے ایک نیکیوں
ديوان الحسنات وديوان السيئات	کا دفتر ایک بُرائیوں کا دفتر اور ایک خدا تعالیٰ کی
وديوان النعم فتقابل الحسنات	نعمتوں کا دفتر نیکیوں کو نعمتوں کے مقابل لایا
بالنعم فلا يؤت بحسنة الاق	جائے گا جب کوئی نیکی لائی جائے گی تو اُس کے
بنعمة حتى تغمر الحسنات	مقابل میں نعمت رکھ دی جائے گی یہاں تک کہ
النعم وتبقى السيئات والذنوب	نیکیاں نعمتوں میں ختم ہو جائیں گی اور گناہ اور
فلله تعالى فيها المشية۔	برائیاں باقی رہ جائیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ کو
	اُن میں اختیار ہے۔

باقی ہے نفس کے عیوب اور اُن کی آفات۔ پس ہم پہلے اُس کو اُس کے باب میں ذکر کر چکے ہیں اور خطرناک معاملہ تو یہ ہے کہ آدمی عبادت میں ستر سال تک محنت کرتا ہے۔ اور تکلیف اُٹھاتا ہے اور وہ اُن کے عیوب اور آفات سے بے خبر ہوتا ہے۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے۔ کہ اُن میں سے ایک بھی مقبول نہیں ہوتا۔ اور کبھی وہ کئی سال تک محنت کرتا ہے۔ اور ایک گھڑی اُسے برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور ان تمام خطرات سے بڑھ کر یہ خطرہ ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ بندے کو دیکھتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی عبادت اور خدمت لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتا ہے۔ اس طرح کہ اُسی کا ظاہر تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ اور باطن مخلوق کے لیے۔ پھر وہ اس کو اس طرح مردود قرار دیتا ہے۔ کہ اُسے کوئی بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں بنا سکتا۔ اس سے خدا کی پناہ۔

اور بعض علماء سے سنا ہے۔ کہ وہ حسن بصری کے متعلق بیان کرتے تھے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کو خواب میں دیکھا گیا تو اُن سے اُن کا حال پوچھا گیا۔ تو فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ اور فرمایا اے حسن کیا تجھے یاد ہے۔ کہ ایک دن تو مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا لوگوں نے تجھ کو دیکھا تو تو نے اپنی نماز اچھی کر کے پڑھی اگر تیری پہلی نماز میرے لیے خالص نہ ہوتی تو میں تجھے آج اپنے دربار میں سے ہانک دیتا۔ اور تجھ سے اپنے تعلقات منقطع کر لیتا۔

اور جب معاملہ مشکل اور باریکی کی وجہ سے اس عظیم حد تک بڑھا ہوا ہے۔ تو عقلمند لوگوں نے اس میں غور کیا اور وہ اپنی جانوں پر ڈرتے رہے یہاں تک کہ بعض اُن میں سے اپنے اُس عمل کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے تھے

جو لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ یہاں تک کہ رابعہ بصریہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا کہ میرا جو عمل ظاہر ہو جائے میں اُسے شمار میں نہیں لاتی۔ اور کسی اور نے کہا اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپا جس طرح تو اپنی بُرائیوں کو چھپاتا ہے۔ اور کسی اور نے کہا۔ اگر تجھے نیکیوں کو چھپا کر رکھنے کی کوئی جگہ مل سکے تو ایسا ہی کر۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ رابعہ سے سوال کیا گیا۔ کہ آپ کو اپنے کون سے عمل پر سب سے زیادہ امید ہے۔ تو انہوں نے فرمایا اس عمل پر کہ میں اپنے اعمال سے مایوس ہوں۔

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ محمد بن واسع اور مالک بن دینار دونوں کی ملاقات ہوئی۔ تو مالک نے کہا یا تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوگی یا جہنم۔ تو محمد بن واسع نے کہا یا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی یا جہنم تو مالک نے کہا مجھے تیرے جیسے اُستاد کی کتنی ضرورت ہے۔

بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا میں نے تیس سال تک عبادت میں محنت کی پھر میں نے ایک کہنے والے کو دیکھا جو مجھ سے کہنے لگا اے بایزید اُس کے خزانے عبادت سے بھرے ہوئے ہیں اگر تو اُس کی بارگاہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ تو تجھے ذلت اور مسکینی اختیار کرنی چاہیے۔

اور میں نے استاد ابوالحسن سے سادہ استاد ابوالفضل رحمہ اللہ سے بیان کرتے تھے۔ کہ آپ نے فرمایا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جو بھی عبادت کرتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول پہنچا ہے۔ آپ سے اسی معاملہ میں گفتگو کی گئی تو آپ نے جواب دیا کسی کام کے مقبول ہونے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کو میں جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے۔ کہ میں اُن کو پورا نہیں کر رہا ہوں۔ تو میں جانتا ہوں کہ میرے عمل غیر مقبول ہیں۔ تو آپ سے کہا گیا۔ پھر آپ عمل کیوں کرتے ہیں۔ فرمایا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی دن مجھ کو درست کر دیں تو نفس کو اچھے کام کرنے کی عادات تو ہوگی۔ اور ابتدا سے اسے عادت ڈالنے کی ضرورت نہ ہوگی یہ حال اُن بڑے بڑے لوگوں کا ہے جو صاحب مجاہدہ اور مشکلات کو عبور کرنے والے اور مضبوط قدم رکھتے تھے۔ تیری حالت ایسی ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

فاطلب لنفسک صحبۃ مع غیرھم   وقع الایاس وخابت الآمال

ھیھات تدرک بالتوانی سادۃ   کدوا النفوس وساعد الاقبال

پھر مجھے خیال ہوا کہ میں یہاں وہ حدیث بیان کر دوں جو صادق المصدوق سے منقول ہے۔ اور ہم نے اُس کو کئی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

ابن مبارک رحمہ اللہ خالد بن معدان سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت معاذ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی حدیث سناؤ۔ جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہو اور اُس کو یاد کیا ہو اور اُس کی شدت اور باریکی کی وجہ سے آپ اُسی کا تذکرہ ہر روز کرتے ہوں تو آپ نے فرمایا ہاں۔ بیان کرتا ہوں۔

پھر آپ بڑی دیر تک روتے رہے پھر کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی ملاقات کا شوق حد سے بڑھ گیا ہے۔

پھر فرمایا ایک دفعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا آپ سواری پر بیٹھے۔ اور مجھے بھی اپنے پیچھے بٹھالیا۔ پھر ہم چلے آپ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اُٹھائی پھر فرمایا۔ تمام تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جو اپنی مخلوق میں جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے ـــــ اے معاذ میں نے عرض کیا لبیک یا سید المرسلین آپ نے فرمایا میں تجھ سے ایسی بات بیان کر رہا ہوں کہ اگر تو نے اُس کو یاد رکھا تو تجھے نفع دے گی اور اگر تو نے اس کو ضائع کر دیا۔ تو اللہ عزوجل کے نزدیک تیری حجت ختم ہو جائے گی ـــــ اے معاذ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین اور آسمان کی پیدائش سے پہلے سات فرشتوں کو آسمانوں کے خازن اور دربان کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اور ہر ایک آسمان کے دروازے پر ایک فرشتہ کو بحیثیت دربان کھڑا کر دیا۔ پھر کراماً کاتبین بندے کے اعمال لے کر چڑھتے ہیں اُن میں روشنی اور چمک ہوتی ہے۔ جیسے سورج کی روشنی۔ یہاں تک کہ وہ پہلے آسمان پر چلے جاتے ہیں اور کراماً کاتبین اُس کے عمل کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں اور اُس کو خالص جانتے ہیں۔ پھر جب وہ دروازہ پر پہنچتے ہیں تو دربان فرشتہ اُن سے کہتا ہے۔ اس عمل کو عمل کرنے والے کے منہ پر دے مارو۔ میں غیبت کا فرشتہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ میں ایسے آدمی کا عمل اُوپر نہ جانے دوں جو لوگوں کی غیبت کرتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ـــــ پھر دوسرے دن فرشتے اُوپر جاتے ہیں۔ اُن کے پاس بہت اچھے عمل ہوتے ہیں۔ وہ عمل نور سے روشن ہوتے ہیں کراماً کاتبین اُن کو بہت زیادہ اور پاکیزہ خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ دوسرے آسمان پر جاتے ہیں تو فرشتہ کہتا ہے ٹھہر جاؤ اور اس عمل کو عمل کرنے والے کے منہ پر دے مارو کیونکہ اُس کی نیت اس عمل سے دنیا کمانے کی تھی مجھے میرے اللہ نے حکم دے رکھا ہے کہ میں کسی ایسے آدمی کا عمل اوپر نہ جانے دوں جو مجھے چھوڑ کر غیر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پھر فرشتے شام تک اُس پر لعنت کرتے رہتے ہیں ـــــ پھر فرشتے بندے کا عمل لے کر اوپر جاتے ہیں اور اُس سے بڑا خوش ہوتے ہیں۔ اُن میں صدقہ

روزہ اور بہت سی نیکیاں ہوتی ہیں۔ فرشتے ان کو بہت زیادہ سمجھتے ہیں اور خالص جانتے ہیں۔ پھر جب وہ تیسرے آسمان تک پہنچتے ہیں تو دربان فرشتہ کہتا ہے۔ کہ ٹھہر جاؤ اور اس عمل کو عمل کرنے والے کے منہ پر دے مارو۔ میں تکبر والوں کا فرشتہ ہوں۔ میرے اللہ نے مجھے حکم دے رکھا ہے۔ کہ میں کسی ایسے آدمی کا عمل اُوپر نہ جانے دوں جو مجھے چھوڑ کر غیر کی طرف متوجہ ہو۔ یہ آدمی لوگوں پر اُن کی مجالس میں اپنی بڑائی بیان کرتا ہے ——— اور فرشتے بندے کا عمل لے کر اُوپر جاتے ہیں اور وہ عمل اس طرح چمکتے ہیں جیسے ستارے یا کوئی روشن ستارہ اُن اعمال میں سے تسبیح کی آواز آتی ہے۔ اُن میں روزہ۔ حج۔ نماز اور عمرہ ہوتا ہے ——— پھر جب وہ چوتھے آسمان پر جاتے ہیں۔ تو وہاں کا موکل دربان فرشتہ اُن سے کہتا ہے۔ ٹھہر جاؤ۔ اور اس عمل کو عمل کرنے والے کے منہ پر دے مارو۔ میں عُجب والوں کا فرشتہ ہوں مجھے میرے اللہ نے حکم دے رکھا ہے۔ کہ میں ایسے آدمی کا عمل اُوپر نہ جانے دوں جو مجھے چھوڑ کر غیر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے۔ تو اس پر مغرور ہو جاتا ہے ——— اور فرشتے بندے کا عمل لے کر اوپر جاتے ہیں وہ عمل اس طرح آراستہ ہوتے ہیں جیسے دُلہن سسرال جانے کے وقت۔ جب وہ اُن کو لے کر پانچویں آسمان تک پہنچتے ہیں ان میں جہاد حج۔ عمرہ وغیرہ اچھے اعمال ہوتے ہیں اُن کی چمک سورج جیسی ہوتی ہے۔ تو فرشتہ کہتا ہے میں حسد کرنے والوں کا فرشتہ ہوں۔ یہ آدمی لوگوں پر اُن چیزوں میں حسد کرتا تھا جو اُن کو اللہ نے اپنے فضل سے دی ہیں۔ یہ آدمی خدا تعالیٰ کی پسندیدہ تقسیم پر ناراض ہے۔ میرے اللہ نے مجھے حکم دے رکھا ہے۔ کہ میں اس کے عمل اُوپر نہ جانے دوں۔ کہ وہ مجھے چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہے ——— اور فرشتے بندے کا عمل لے کر اُوپر جاتے ہیں اُن میں اچھے وضو۔ بہت سی نمازیں۔ روزے۔ حج اور عمرہ ہوتا ہے۔ وہ چھٹے آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ تو دروازے پر مقررہ نگہبان کہتا ہے۔ میں رحمت کا فرشتہ ہوں ان اعمال کو عمل کرنے والے کے منہ پر دے مارو۔ یہ آدمی کبھی کسی انسان پر رحم نہیں کرتا تھا اور کسی بندے کو مصیبت پہنچتی ہے۔ تو خوش ہوتا ہے۔ میرے اللہ نے مجھے حکم دے رکھا ہے۔ کہ میں اِس کے اعمال کو اوپر نہ جانے دوں یہ مجھے چھوڑ کر غیروں کی طرف متوجہ ہے ——— پھر فرشتے بندے کا عمل لے کر چڑھتے ہیں اُس میں بہت سا صدقہ۔ نماز۔ روزہ۔ جہاد اور پرہیزگاری ہوتی ہے۔ اُن کی آواز ہوتی ہے۔ جیسے رعد کی آواز اور چمک جیسے بجلی کی چمک ——— پھر جب وہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں۔ تو فرشتہ جو اس آسمان پر موکل ہے کہتا ہے۔ میں ذکر کا فرشتہ ہوں یعنی سنانے کا اور لوگوں میں آواز دینے کا۔ اِس عمل والے نے اس عمل میں مجلسوں میں

تذکرہ اور دوستوں میں بلندی اور بڑے لوگوں کے نزدیک جاہ پسندی کی نیت کی تھی۔ میرے اللہ نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ میں اس کے عمل کو اُوپر نہ جانے دوں کہ یہ مجھے چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور ہر وہ عمل جو اللہ کے لیے خالص نہ ہو وہ ریا ہے۔ اور ریاء کار کا عمل اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے۔ اور فرشتے بندے کے اعمال نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج۔ عمرہ۔ اچھا خلق خاموشی اور ذکر الٰہی لے کر اوپر جاتے ہیں ساتوں آسمانوں کے فرشتے اُن کی مشایعت کے لیے ساتھ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے سامنے سے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ پھر وہ اللہ عزوجل کے سامنے کھڑے ہو کر اُس کے لیے شہادت دیتے ہیں کہ اُس کا عمل نیک خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔۔۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ تم میرے بندے کے اعمال پر نگران ہو اور میں اُس کے دِل کی نگرانی کرنے والا ہوں۔ اس عمل سے اُس کا ارادہ مجھے خوش کرنا نہیں تھا بلکہ میرے سوا اوروں کو خوش کرنا مقصود تھا۔ میں اسے اپنے لیے خالص نہیں سمجھتا۔ اور میں خوب جانتا ہوں جو عمل کرنے سے اس کی نیت تھی اس پر میری لعنت۔ اس نے بندوں کو بھی دھوکہ دیا اور تم کو بھی۔ لیکن مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میں غیبوں کا جاننے والا ہوں۔ دلوں کے خیالات سے واقف ہوں۔ مجھ پر کوئی پوشیدہ چیز چھپی نہیں رہ سکتی اور کوئی چھپی چیز مجھ سے اوجھل نہیں ہے۔ میرا علم حاضر کے متعلق بھی اُسی طرح ہے۔ جیسے مستقبل کے متعلق ہے۔ اور گزری ہوئی چیزوں کے ساتھ میرا علم اُسی طرح ہے جیسا کہ باقی چیزوں کے متعلق اور میرا علم پہلے لوگوں کے ساتھ اُسی طرح ہے۔ جیسے پچھلوں کے ساتھ۔ میں پوشیدہ کو جانتا ہوں اور دِل کے خیالات کو بھی۔ میرا بندہ اپنے عمل کے ساتھ مجھے کس طرح دھوکہ دے سکتا ہے۔ دھوکہ تو مخلوق کھاتی ہے۔ جن کو علم نہیں ہوتا اور میں تو غیبوں کا جاننے والا ہوں اس پر میری لعنت ہے۔ اور ساتوں فرشتے اور تین ہزار فرشتے وداع کرنے والے سب کہتے ہیں اے ہمارے رب اس پر تیری لعنت ہے۔ اور ہماری بھی لعنت۔ پھر آسمانوں والے کہتے ہیں اس پر اللہ کی لعنت اور لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ پھر معاذ رضی اللہ عنہ رونے لگے اور بڑا سخت روئے اور کہا اے اللہ کے رسول آپ نے جو ذکر فرمایا ہے۔ اس سے نجات کی کیا صورت ہے۔ تو فرمایا اے معاذ اپنے نبی کی یقین میں اقتدا کر۔ میں نے کہا۔ آپ تو اللہ کے رسول ہیں اور میں معاذ بن جبل ہوں۔ مجھے نجات اور خلاصی کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا اے معاذ اگر تیرے عمل میں کوتاہی ہو تو لوگوں کی بے آبروئی کرنے سے اپنی زبان کو روک خصوصاً اپنے بھائیوں۔ قرآن پڑھنے والوں سے اور لوگوں کی بے آبروئی کرنے سے اپنے نفس کے عیبوں کا علم تجھے روک دے اور اپنے

بھائیوں کی خدمت کر کے اپنے نفس کو پاک نہ بنا اور اپنے بھائیوں کو گرا کر اپنے آپ کو بلند کرنے کی کوشش نہ کر اور اپنے عمل میں ریاء کاری نہ کر کہ تو لوگوں میں پہچانا جائے۔ اور اس طرح دنیا میں مشغول نہ ہو جا کہ تجھے آخرت کا معاملہ بھول جائے۔ اور جب تیرے پاس کوئی اور آدمی بھی بیٹھا ہو تو کسی دوسرے سے چھپ کر مشورہ نہ کر اور لوگوں میں بڑائی حاصل کرنے کی کوشش نہ کر کہ دنیا اور آخرت کی بھلائیاں تجھ سے منہ موڑ لیں گی۔ اور اپنی مجلس میں اس طرح فحش گوئی نہ کر کہ لوگ تیری بداخلاقی کی وجہ سے تجھ سے گریز کرنے لگیں۔ اور لوگوں پر احسان نہ جتا اور لوگوں کی عزت کا پردہ اپنی زبان سے چاک نہ کر کہ تجھے جہنم کے کتے پھاڑ ڈالیں گے۔ اور یہی ہے اللہ تعالیٰ کا قول۔

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ یعنی ہڈیوں سے گوشت کو الگ کر دیں گے۔

میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اِن باتوں کی کون طاقت رکھ سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا اے معاذ جو میں نے تجھ سے بیان کیا ہے۔ وہ اُسی آدمی پر آسان ہے۔ جس پر اللہ آسان کرے۔ تجھے اِن تمام باتوں سے یہ چیز کفایت کرتی ہے۔ کہ تو لوگوں کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو تو اپنے نفس کے لیے پسند کرتا ہے۔ اور لوگوں کے لیے وہی کچھ ناپسند کرے جو اپنے نفس کے لیے ناپسند کرتا ہے۔ اگر تو ایسا کرے گا تو سلامت رہے گا اور نجات پا جائے گا۔

خالد بن معدان نے کہا کہ حضرت معاذ قرآن پاک کی تلاوت بھی اِس کثرت سے نہیں کرتے تھے جتنا کہ اِس حدیث کو بیان کرتے اور اپنی مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے اور اے آدمی جب تو نے یہ عظیم حدیث اور بہت بڑی خبر سن لی ہے۔ جس کا انجام بڑا دردناک ہے جس کے اثر سے دِل اُڑنے لگتے ہیں اور عقول پریشان ہو جاتی ہیں۔ اور جس کو سینے اُٹھانے سے تنگ ہیں۔ جس کی ہیبت سے نفس گھبراتے ہیں تو اپنے مولا کی رحمت کا دامن تھام لے اور عاجزی اور تضرع اور دن رات کے رونے سے اُس کے دروازہ کو لازم پکڑ۔ جیسا کہ دوسرے عاجزی کرنے والے اور تضرع کرنے والے کرتے ہیں اس معاملہ میں نجات صرف اُس کی رحمت سے ہے۔ اور اس سمندر سے سلامتی کے ساتھ بچ نکلنا صرف اُس کی توجہ اور توفیق اور عنایت سے ہے۔ غافلوں کی نیند سے بیدار ہو اور اس کام کو اُس کا حق دے اور اس خوفناک گھاٹی میں اپنے نفس سے جہاد کرنا کہ تو ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک نہ ہو جائے۔ اور ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی التجا ہے وہ بہترین مددگار ہے۔ اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے اور گناہ سے بچنے اور نیکی کرنے کی

طاقت بھی اللہ تعالٰی بلند اور عظیم کی توفیق سے ہے۔

فصل :

قصہ مختصر جب تو نے اچھی طرح دیکھ لیا اور اللہ تعالٰی کی اطاعت کے اندازے کو ملاحظہ کر لیا اور مخلوق اور اُن کی کمزوری اور ان کی جہالت کو دیکھ لیا تو اپنے دل کے ساتھ اُن کی طرف توجہ مت کر اور اُن کی مدح و ثناء اور ان کی تعظیم سے بے نیاز ہو جا کہ اُس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو ان چیزوں سے اپنی عبادت کو مردود نہ کر اور جب تو نے دنیا کی کمینگی اور حقارت اور سرعت زوال کو جان لیا ہے۔ تو اللہ تعالٰی کی عبادت سے اُس کی طرف توجہ نہ کر اور اپنے نفس سے کہہ۔ اے نفس رب العالمین کی تعریف اور اُس کی شکر گزاری عاجز اور جاہل مخلوق کی ثناء سے بہتر ہے۔ جو کہ حقیقت میں تیرے عمل کی قدر کو اور تیری محنت کو جانتے ہی نہیں۔ اور تیرے حق کو تیرے اعمال میں اور تیری تکلیفات میں نہیں پہچان سکتے بلکہ بسا اوقات تجھ پر کسی ایسے آدمی کو فضیلت دیں گے جو کہ تجھ سے ہزار یا درجہ کم تر ہو گا۔ اور سب سے زیادہ حاجت کے اوقات میں تجھ کو ضائع کر دیں گے۔ اور بھول جائیں گے۔ اور اگر وہ ایسا نہ بھی کریں تو اُن کے ہاتھ میں آخر ہے بھی کیا اور ان کی طاقت کہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ پھر وہ بھی اللہ تعالٰی ہی کے قبضے میں ہیں۔ تو پھر وہ اُن کو جس طرح چاہے گا اور جدھر چاہے گا پھیر دے گا تو اے نفس عقل سے کام لے اور اپنی عزیز عبادت کو اُن کی وجہ سے ضائع نہ کر اور نہیں فوت ہو گی تجھ سے اُس ذات کی ثناء جس کی ثناء تمام تر فخر اور عطا ہے۔ اور جس کی عطا تمام تر ذخیرہ ہے۔ اور کہنے والے نے کتنا سچ کہا ہے۔

سهر العيون لغير وجهك باطل

وبكاؤهن لغير فقدك ضائع

ترجمہ۔ تیرے چہرے کے سوا آنکھوں کا جاگنا باطل ہے۔ اور تیرے گم ہونے کے سوا اُن کا رونا ضائع ہے۔

اور کہو اے نفس کیا ہمیشگی کی جنت بہتر ہے یا دُنیا اور اُس کا ناکارہ اور فانی حرام سے آلودہ سامان حالانکہ تجھے طاقت ہے کہ تجھے تیری اِس عبادت سے ہمیشگی کی نعمتیں حاصل ہوں پس نہ ہو تو خسیس ہمت ردی ارادے اور کمینہ افعال والا۔ کیا تو غور نہیں کرتا کہ کبوتر جب فضا میں بلند اُٹھنے والا ہو تو اُس کی قیمت کس طرح بڑھ جاتی ہے۔ اور اُس کی قدر کتنی زیادہ ہو جاتی ہے۔ سو تو اپنی تمام ہمت کو آسمان کی طرف بلند کر اور

اپنے دِل کو اکیلے اللہ تعالیٰ کے لیے خالی کر دے جس کے اختیار میں تمام امور ہیں۔ اور ناکارہ چیزوں کی وجہ سے اپنی کمائی ہوئی عبادت کو ضائع نہ کر۔ اور اسی طرح جب تو اچھی طرح غور کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور بڑے بڑے احسانات کو اِس عبادت میں اپنے اوپر ملاحظہ فرمائے گا کہ اُسی نے تجھ کو اس کی توفیق بخشی اور اُس نے اِس کا سامان فراہم کیا۔ اور اُسی نے تمام موانعات کو تجھ سے دُور فرمایا یہاں تک کہ اِس عبادت کے لیے فارغ ہوا۔

پھر اُس نے تجھ کو توفیق اور تائید سے خاص کیا اور اِس کو تجھ پہ آسان بنایا اور تیرے دِل میں اُس کو زینت بخشی یہاں تک کہ تو نے اس پر عمل کیا۔

پھر اُسی نے اپنی عظمت اور جلال اور تیری عبادت اور تجھ سے بے نیازی اور اپنی تجھ پہ بے انداز نعمتوں کے باوجود تیرے لیے اس معمولی عمل پر ثنائے جمیل اور ثواب عظیم کا اجر تیار کر رکھا ہے جس کا تو کسی صورت میں مستحق نہیں ہے۔ پھر وہ اِس پر تیری شکر گزاری کرتا ہے۔ اور اس معمولی کام پر تیری ثنا کہتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے تجھ سے محبت رکھتا ہے۔

خاصًا یہ سب کچھ اُسی کے بہت بڑے فضل کی وجہ سے ہے۔ نہ کسی اور وجہ سے ورنہ تیرا کونسا حق ہے اور تیرے اِس عیب دار اور حقیر عمل کی کونسی قدر ہے۔ سوائے نفس اپنے رب کریم رحیم سبحانہ وتعالیٰ کے احسان کو یاد کر کہ اُس نے تجھ پر اِس عبادت کے بجالانے میں کتنا احسان کیا اور اس سے شرم کر کہ تو اپنے عمل کی طرف توجہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہم پہ ہر حال میں فضل اور احسان ہے اور اِس عبادت کے حاصل ہو جانے کے بعد تیرا شغل اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اسے اپنی رحمت سے قبول فرمالے۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کے خلیل ابراہیمؑ کی بات نہیں سنی۔ کہ جب وہ خدا تعالیٰ کے گھر کی تعمیر کی خدمت سے فارغ ہوئے تو کس طرح اللہ تعالیٰ کی جناب میں گڑگڑائے کہ وہ اِس کو قبول فرما کر اُن پر احسان کرے انہوں نے کہا:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ — اے ہمارے رب ہم سے قبول فرما بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

اور جب اپنی دُعا سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ۔ — اے ہمارے رب دُعا کو قبول فرما

پھر اگر اُس نے اِس کھوٹی پونجی کو قبول فرما کر تجھ پر احسان کیا تو اُس نے اپنی نعمت کو مکمل کر دیا اور احسانِ عظیم فرمایا کتنی اچھی ہے یہ سعادت اور دولت اور عزت و رفعت اور یہ خلعت اور نعمت اور ذخیرہ اور کرامت تجھ پر کتنی زیب دے گی۔ اور اگر دوسری کیفیت ہوئی تو اس خسارے اور نقصان اور محرومی پر نہایت افسوس۔ پس تو اُٹھ اور اس کیفیت میں مشغول ہو جا۔ جب تو اس عمل پر ہمیشگی کرے گا اور اپنی عبادت سے فارغ ہونے پر اپنے دل پر اس کی تکرار کرے گا اور خداوند تعالیٰ سے مدد چاہے گا تو وہ تجھے مخلوق اور نفس کے التفات سے بچالے گا اور عُجب اور ریاء کاری کے شغل سے محفوظ رکھے گا اور تجھے خالص اخلاص پر عبادات ذکر الٰہی میں آمادہ کرے گا اور پھر تمام حالات میں تجھ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہو گا۔ تجھے ظاہری اطاعت حاصل ہو گی جو امید کے قابل ہو اور ایسی نیکیاں میسر آئیں گی جن میں کوئی کدورت نہ ہو اور ایسی مقبول عبادتیں حاصل ہوں گی جن میں کوئی نقص نہ ہو اور ایسی عبادت اگر بالفرض زندگی میں ایک ہی دفعہ میسر ہو جائے اور پھر کبھی میسر نہ ہو تو وہ بھی حقیقت میں بہت ہے۔ اور مجھے اپنی عمر کی قسم اگر چہ اس کی تعداد کم ہو لیکن اس کے معنی بہت ہیں اس کی قدر بڑی ہے۔ اس کا نفع کثیر ہے۔ اس کا انجام اچھا ہے۔ اور اس طرح کی توفیق ملنا بہت عزیز ہے۔ اور بندے پر خدا تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے پھر اُس تحفے سے کونسا تحفہ بڑا ہو سکتا ہے کہ جس کو اللہ رب العالمین قبول کرلے اور اُس کوشش سے اچھی اور کون سی کوشش ہو سکتی ہے۔ جس کی شکر گزاری بے قراروں کی دعائیں سننے والا کرے اور رب العالمین اُس پر تعریف کرے اور کون سی پونجی اِس پونجی سے زیادہ معزز ہے۔ جس کو رب العالمین پسند کرلے اور اُس پر خوش ہو جائے۔ پس اے مسکین غور کر! اور ہوشیار ہو جا کہ تو خسارہ پانے والوں سے نہ ہو جائے۔ اور جب معاملہ اِس حد تک پہنچ جائے گا تو تو اللہ تعالیٰ کے مخلص ڈرنے والے شکر کرنے والے اللہ کے احسانات پر راضی ہونے والے لوگوں میں سے ہو جائے گا۔ اور تو اس خوفناک گھاٹی کو اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا اُس کی آفتوں سے سلامت رہے گا اور اُس کی بھلائیاں اور پھل اپنے ساتھ لے جائے گا اُس کی سعادتوں اور کرامتوں پر ہمیشہ کے لیے فائز ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل و کرم سے عصمت اور توفیق کے والی ہیں۔ اور اللہ بلند عظیم کی توفیق ہی سے گناہ سے پرہیز اور نیکی کی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔

ساتویں گھاٹی

اور یہ گھاٹی حمد اور شکر کی ہے۔ اللہ تجھے بھی توفیق دے اور ہمیں بھی ان گھاٹیوں کے قطع کرنے کے بعد اور ایسی عبادت کے حصول کے بعد جو آفات سے صحیح سلامت ہو اللہ تعالیٰ کا شکر اور حمد بجا لانا اسی نعمت عظیمہ اور احسان کریمہ پر لازم ہے۔ اور یہ تجھے دو وجوہات سے لازم ہے۔ ایک تو نعمت عظیمہ کے دوام کے لیے اور دوسرے زیادہ حاصل ہونے کے لیے پھر نعمت دوام کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ شکر کے ساتھ نعمتیں مقید ہو جاتی ہیں۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہتی ہیں۔ اور اس کو ترک کر دینے سے چلی جاتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔	اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات میں اُس وقت تک تبدیلی نہیں کرتے جب تک وہ خود نہ تبدیل ہو جائیں

اور فرمایا:

فکفرت بانعم اللہ فاذاقها اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون۔	پس اُس نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو خوف اور بھوک کا لباس پہنا دیا یہ بدلہ تھا ان کی کمائی کا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم	اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں کیوں سزا دے گا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان للنعم اوابد کاوابد الوحش فقیدها بالشکر۔	نعمتیں بھی اسی طرح بھاگ جاتی ہیں جیسے جنگلی جانور بھاگ جاتے ہیں تو ان کو شکر کے ساتھ پابند کرو۔

باقی رہا زیادت کا حصول! تو چونکہ شکر نعمتوں کے لیے زنجیر ہے تو وہ زیادت کا پھل دیں گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔ — اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔

اور فرمایا:۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔ — جن لوگوں نے ہدایت کو قبول کیا تو اللہ اُن کو ہدایت زیادہ دیتا ہے۔

اور فرمایا

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ — جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم اُن کو اپنے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

پھر عقلمند مالک جب غلام کو دیکھتا ہے کہ وہ اُس کی نعمت کا حق ادا کر رہا ہے تو اُس پر اور بھی احسان کرتا جاتا ہے۔ اور اُس کو اُن کا اہل سمجھتا ہے۔ ورنہ اُس سے اپنے احسانات منقطع کر لیتا ہے۔ پھر نعمتیں دو قسم کی ہیں۔ دنیاوی اور دینی۔ پھر دنیاوی دو قسم کی ہیں۔ پہلی نفع کی نعمت اور دوسری مدافعت کی نعمت۔ نفع کی نعمت تو یہ ہے۔ کہ تجھے اللہ تعالیٰ تیرے مناسب اور منافع کی چیزیں عطا فرمائیں پھر منافع کی دو قسمیں ہیں صحیح پیدائش اور جسمانی سلامتی اور عافیت اور مرغوب چیزوں کا مہیا کرنا۔ مثلاً کھانا پینا۔ لباس نکاح وغیرہ کے فوائد۔ اور مدافعت کی نعمت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تجھ سے بگاڑ پیدا کرنے والی اور تکلیف دینے والی چیزوں کو تجھ سے روک رکھے۔ اور یہ بھی دو قسم ہے۔ پہلی نفس میں کہ اللہ تعالیٰ تجھے تمام آفتوں۔ بیماریوں سے محفوظ رکھے اور دوسری اُن چیزوں کی مدافعت جن سے تجھے کوئی نقصان پہنچ سکے یا کوئی انسان یا جن یا درندہ اور موذی جانور تجھے بُرائی پہنچانے کا قصد کرے۔

اور باقی رہیں دینی نعمتیں! تو وہ بھی دو قسم کی ہیں۔

نعمت توفیق اور نعمت عصمت۔

توفیق کی نعمت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے پہلے تو اسلام کی توفیق بخشے پھر اتباع سنت کی پھر اطاعت کی۔ اور عصمت کی نعمت یہ ہے۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ تجھے کفر اور شرک سے بچائے پھر بدعت اور گمراہی سے پھر تمام گناہوں سے اور اس کی تفصیل اس کائنات کے مالک کے سوا کوئی نہیں جانتا جس نے تجھ پر احسانات کیے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا — اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے احسانات کو شمار کرنے

تُحْصُوْهَا ۔ گنو تو شمار بھی نہ کر سکو۔

اوران تمام نعمتوں کا رواج بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر ان کا احسان کیا اور ہر طرف سے اس میں اضافہ فرمایا کہ جس کو نیز او ہم نہ تو شمار کر سکتا ہے اور نہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور یہ تمام چیزیں بس ایک ہی چیز سے متعلق ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اُس کا شکر۔

اور وہ کام جس کی یہ قیمت ہو جس میں یہ تمام فائدے ہوں حق رکھتا ہے کہ اس کو کسی حال میں غفلت کے بغیر تمام رکھا جائے۔ یہ ایک قیمتی ہیرا ہے اور عزیز کیمیا ہے۔ اور اللہ ہی اپنے فضل و رحمت سے توفیق کا والی ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ حمد اور شکر کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے معنی کیا ہیں اور اُن کا حکم کیا ہے تو جان لینا چاہیے کہ علماء نے حمد اور شکر میں کچھ فرق کیا ہے۔ وہ یہ کہ حمد تسبیح و تہلیل کی قسم سے ہے۔ تو یہ ظاہری کوششوں میں سے ہو گی۔ اور شکر صبر اور سپردگی کی قسم سے ہے۔ تو یہ باطنی کوششوں میں سے ہو گا۔ کیونکہ شکر کفر کے مقابل ہے۔ اور حمد مذمت کے مقابل۔ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ حمد عام ہے اور اکثر ہے۔ اور شکر کم ہے اور خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۝ اور میرے شکر گزار بندے تھوڑے ہیں۔

تو ثابت ہوا کہ یہ دونوں الگ الگ معانی رکھتے ہیں۔ پھر یہ فرق بھی ہے کہ حمد کسی کے اچھے کام کرنے پر تعریف کرنے کو کہتے ہیں۔ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ کے کلام کا مقتضا یہی ہے۔

باقی رہا شکر تو اس کے معنی میں علماء نے بہت کلام کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔ خداوند تعالیٰ کی ظاہر اور باطن میں تمام اعضاء سے اطاعت کا نام شکر ہے۔ اور ہمارے بعض مشائخ کا بھی یہی قول ہے۔ کہ انہوں نے کہا ظاہر اور باطن میں اطاعت کا ادا کرنا شکر ہے۔ پھر دوسرے قول کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ ظاہر اور باطن میں گناہوں سے پرہیز کرنا شکر ہے اور کسی اور نے کہا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کو اختیار کرنے سے اپنی حفاظت کرنے کا نام شکر ہے۔ کہ تو اپنے دل اور زبان اور اعضاء کی اس طرح حفاظت کرے کہ ان تینوں سے کسی طرح بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کر سکے اور اس قول اور پہلے شیخ کے قول میں فرق یہ ہے۔ کہ شیخ بزرگ نے حفاظت کو گناہوں سے اجتناب پر ایک زائد معنی کی حیثیت سے ثابت کیا ہے۔ اور نافرمانی سے اجتناب کی حقیقت تو یہی ہے۔ کہ جب اُس کے دواعی موجود ہوں تو انسان نافرمانی نہ کرے اور اس تعریف

کے مطابق کوئی ایسا معنی اپنے نفس میں حاصل نہیں ہوگا جس سے بندہ مشغول رہے اور ناشکری سے بچا رہے اور ہمارے شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا احسان کرنے والے کی نعمت کے مقابلے میں اس طرح تعظیم کی جائے کہ احسان کرنے والے کی نافرمانی اور ناشکری سے اُس کو روک دے اِس کا نام شکر ہے۔ اور اگر احسان کے مقابلہ میں محسن کی تعظیم رکھی جائے تو ایسی صورت میں یہ بھی صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندے کا شکر کرے اور یہ بہت اچھی تعریف ہے۔ اور اس میں کافی تفصیل ہے۔ جس کو ہم نے اپنی کتاب احیائے علوم الدین وغیرہ میں پوری طرح بیان کیا ہے۔ لیکن حاصل یہ ہے۔ کہ بندے سے شکر یہ ہے۔ کہ اپنے محسن کی اس طرح تعظیم کرے کہ اُس کی نافرمانی سے باز آجائے اور یہ اُس کے احسان کے یاد کرنے سے ہوتا ہے۔ اور شکر کرنے والے کا حال شکر میں بہت بہتر ہے۔ اور ناشکری کرنے والے کا حال ناشکری میں بہت بدتر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ منعم کا کم از کم یہ حق ہے۔ کہ اُس کی نعمت کے ساتھ اُس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور کتنی بدتر حالت ہے۔ اُس آدمی کی جو منعم کی نعمت کو اُس کی نافرمانی پر ہتھیار کے طور پر استعمال کرے پس بندے پر شکر کا حقیقت میں یہ فرض ہے۔ کہ اُس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ایسی تعظیم ہو کہ وہ خدا تعالیٰ اور اُس کی نافرمانی کے درمیان حائل ہو جائے۔ جبکہ اُس نعمت کو یاد کرے۔ جب اُس نے ایسا کر لیا تو اُس نے شکر کا اصل ادا کر دیا۔ پھر اس کے مقابل خدا تعالیٰ کی اطاعت میں کوشش اور عبادت میں جدوجہد ہے۔ کیونکہ وہ نعمت کے حقوق میں سے ہے۔ تو نافرمانی سے بچتے رہنا بھی ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے توفیق ہے۔

اگر تم یہ سوال کرو کہ شکر کا مقام کونسا ہوتا ہے۔ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اُس کا مقام دینی اور دنیاوی نعمتیں ہیں۔ باقی رہا مصیبتوں اور سختیوں پر دنیا میں خواہ وہ اپنے نفس پر ہوں یا اہل اور مال پر شکر کرنا بندے پر لازم ہے۔ یا نہیں تو بعض نے کہا ہے۔ کہ بندے کو اُن پر اُن کی حیثیت سے شکر کرنا لازم نہیں ہے۔ بلکہ اُن پر صبر کرنا لازم ہے۔ باقی رہا شکر تو وہ نعمتوں پر ہوتا ہے نہ کہ کسی دوسری چیز پر اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی سختی ایسی نہیں کہ جس کے پہلو میں اللہ تعالیٰ کا احسان نہ ہو۔ تو اُس نعمت پر جو اُس سختی سے ملی ہوئی ہے۔ بندے پر شکر یہ لازم ہے۔ نہ کہ سختی اور مصیبت پر۔ اور یہ نعمتیں وہ ہیں جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمائیں آپ نے فرمایا کہ جب کبھی بھی کوئی مصیبت مجھ پر آئی۔ تو میں نے اُس میں اللہ تعالیٰ کے چار احسان دیکھے۔ پہلا یہ کہ وہ مصیبت میرے دین میں نہ آئی۔ دوسری یہ کہ اس سے زیادہ نہ آئی۔

تیسری یہ کہ میں رضا بالقضاء سے محروم نہ رہا۔ اور چوتھی یہ کہ مجھے اُس پر ثواب کی امید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ یہ بھی ایک نعمت ہے۔ کہ وہ سختی دور ہو جانے والی ہے ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ کہ کسی دوسرے کی طرف سے۔

اور اگر وہ سختی کسی مخلوق کے سبب سے ہو تو وہ تیری طرف سے اُس پر ہے۔ نہ کہ اُس کی طرف سے تجھ پر۔ تو اس وقت بندے پر شکر یہ لازم ہے اُن نعمتوں پر جو سختی کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

اور کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے۔ اور ہمارے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اس قول کو راجح قرار دیا ہے۔ کہ دنیا کی مصیبتوں پر شکر کرنا بھی بندے کے لیے لازم ہے۔ کیونکہ یہ سختیاں حقیقت میں نعمتیں ہیں کیونکہ بندے کو اس کے معاوضے میں عظیم منافع بے انداز ثواب اور اچھا بدل آخرت میں ملتا ہے۔ جن کے مقابلہ میں ان سختیوں کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ اور اس سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو گی اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ تجھے بدمزہ اور کڑوی دوائی پلائے تاکہ خطرناک بیماری دور ہو جائے یا کسی بہت بڑی بیماری یا خوفناک خطرے کی وجہ سے کوئی نیز افصد کرے یا سینگی لگائے۔ تو اس کا نتیجہ نفس کی صحت۔ بدن کی سلامتی اور زندگی کی صفائی ہو گا تو اُس کا تجھے کڑوی دوائی پلا کر تکلیف دینا یا فصد کا زخم لگانا یا سینگی کھینچنا حقیقت میں ایک بہت بڑا احسان اور عظیم نعمت ہو گی۔ اگرچہ اُس کی ظاہری صورت ناپسندیدہ ہے اُس سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ اور نفس وحشت محسوس کرتا ہے۔ پھر بھی تو اُس آدمی کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ بلکہ اپنی ہمت کے مطابق اُس کو اچھا معاوضہ بھی دیتا ہے۔ تو یہی حکم اِن مصیبتوں اور سختیوں کا بھی ہے۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ نبی سختیوں پر بھی اسی طرح حمد اور شکر ادا کرتے تھے جیسا کہ خوشی کی چیزوں پر۔ آپ نے فرمایا:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى مَا سَآءَ وَ سَرَّ — تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں برائیوں پر بھی اور بھلائیوں پر بھی۔

کیا آپ اللہ تعالیٰ کے قول کی طرف غور نہیں فرماتے کہ:۔

عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ — ہو سکتا ہے۔ کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اُس میں بہت سی بھلائی رکھی ہو۔

اور اللہ تعالیٰ جس کا نام بھلائی رکھے وہ اِس سے بہت زیادہ ہے۔ کہ تیرا خیال بھی وہاں تک پہنچ سکے۔ اور اس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے۔ کہ نعمت صرف وہ ہی نہیں ہوتی جس میں خوشگوار مزہ ہو یا جسے طبیعت کے

تقاضے کی وجہ سے نفس چاہے بلکہ وہ چیز بھی نعمت ہے جس سے درجات میں رفعت نصیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نعمت کو زیادت کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور جب سختی بندے کے شرف اور درجات کی بلندی کا سبب ہے۔ تو یہ بھی حقیقت میں نعمت ہوگی۔ اگرچہ اپنی ظاہری صورت سے اسے سختی اور تکلیف شمار کیا جاتا ہے۔ اس کو اچھی طرح یاد رکھ خدا تجھے توفیق دے۔

پھر اگر تم یہ پوچھو کہ شکر گزار افضل ہے یا صبر کرنے والا تو معلوم ہونا چاہیے کہ شکر کرنے کا افضل ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ فرمایا:۔

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۔ میرے تھوڑے بندے شکر گزار ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو اخص الخواص بنایا ہے۔ اور نوح علیہ السلام کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۔ یقیناً وہ شکر گزار بندہ تھا۔

اور ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ وہ اُس کی نعمتوں کا شکر گزار تھا۔

اور اس لیے بھی کہ یہ انعام اور عافیت کے مقام پر ہوتا ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے۔ کہ اگر مجھ پر احسان کیا جائے اور میں شکر کروں تو یہ اُس سے مجھے زیادہ پسند ہے۔ کہ میں سختی میں مبتلا کیا جاؤں اور صبر کروں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ صبر کرنے والا زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ اُس کی مشقت چونکہ بڑی ہے۔ اس لیے اس کا ثواب بھی بڑا اور درجات بھی بلند ہوں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۔ نِعْمَ الْعَبْدُ ۔ ہم نے اس کو صبر کرنے والا پایا۔ وہ بڑا اچھا بندہ تھا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ صابر لوگ بغیر حساب کے پورا پورا اجر دیے جائیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حقیقت میں شکر کرنے والا صابر کے سوا کوئی نہیں اور صبر کرنے والا حقیقت میں شکر گزار کے سوا اور کوئی نہیں۔ کیونکہ شکر گزار امتحان میں ہے۔ اِس میں سختی کے سوا چارہ نہیں جس پر وہ لازمی طور پر صبر کرے گا اور بے صبری نہ کرے گا۔ کیونکہ شکر احسان کرنے والے کی ایسی تعظیم ہے۔ جو اُس کی نافرمانی سے روک دے اور بے صبری بھی نافرمانی ہے۔

اور صبر کرنے والا بھی نعمت سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ پہلے معنیٰ کے مطابق سختی بھی حقیقت میں نعمت ہے۔ تو جب اُس پر صبر کرے گا تو حقیقت میں یہ بھی شکر ہو گا۔ کیونکہ صبر یہ ہے۔ کہ اللہ کی تعظیم کے لیے اپنے نفس کو بے صبری سے روکے اور شکر بھی بعینہٖ یہی ہے۔ کیونکہ وہ ایسی تعظیم ہے۔ جو نافرمانی سے بچائے اور اس لیے بھی کہ شکر گزار اپنے نفس کو ناشکری سے روکتا ہے۔ اور نافرمانی سے صبر کرتا ہے۔ اور اپنے نفس کو شکر پر آمادہ کرتا ہے۔ اور عبادات پر صبر کرتا ہے۔ تو حقیقت میں یہ بھی صابر ہے۔ اور صابر نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی جس نے اُسے بے صبری سے روک دیا اور صبر پر آمادہ کیا تو اُس نے اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کیا۔ تو حقیقت میں یہی شاکر ہے۔ اور اِس لیے بھی کہ نفس کو ناشکری سے روکنا جبکہ نفس اس کا ارادہ رکھتا ہو۔ ایک سختی ہے جس پر شکر گزار صبر کرتا ہے۔ اور صابر کی توفیق اور عصمت ایک نعمت ہے جس پر صابر شکر گزار ہے۔ تو ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے الگ نہیں۔

اور اس لیے بھی کہ وہ بصیرت جو ان دونوں پر انسان کو آمادہ کرتی ہے۔ وہ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہمارے بعض علماء کے قول کے مطابق استقامت کی بصیرت ہے۔ انہیں وجوہات کی بنا پر ہم نے کہا ہے۔ کہ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اس جملے کو خوب ذہن نشین کر اور توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

فصل:

اے مردِ خدا تجھ پر لازم ہے۔ کہ اس آسان سی گھاٹی کو عبور کرنے کے لیے اپنی ہمت خرچ کر دے یہ ایسی گھاٹی ہے کہ جس کی مشقت بہت تھوڑی ہے۔ معاوضہ بہت زیادہ ہے۔ اور جس کا وجود نہایت عزیز اور قدر و منزلت نہایت عظیم ہے۔ دو چیزوں پر غور کر پہلی یہ ہے۔ کہ نعمت اُس کو دی جاتی ہے جو اُس کی قیمت کو جانتا ہو۔ اور اس کی قدر کو صرف شکر گزار ہی جانتا ہے۔ اور ہمارے اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ جو کہ خداوند تعالیٰ نے کفار سے حکایت کرتے ہوئے اور اُن کا جواب دیتے

ہوئے فرمایا ہے۔

اَهٰۤؤُلَاۤءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۔ — کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں سے واقف نہیں ہے۔

تو ان جاہل لوگوں نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ عظیم نعمت اور بڑا احسان اُسی پر کیا جاتا ہے جو مالی لحاظ سے زیادہ اور حسب و نسب کے لحاظ سے اشرف ہو۔ تو کہنے لگے اِن فقیروں کا ایک مقام ہے۔ کہ اُن کے قول کے مطابق غلام اور آزاد تھے کہ ان کو یہ نعمت عظیمہ دی جائے اور ہمیں اس سے محروم رکھا جائے تو انہوں نے تکبر کی راہ اور مذاق کے طریق پر کہا کیا یہی وہ لوگ ہیں پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے۔ تو اُن پر اللہ تعالیٰ نے اِس روشن نکتہ سے جواب دیا اور فرمایا:۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ — کیا خداوند تعالیٰ شکر گزاروں کو نہیں جانتا۔

جس کلام کا مدعا یہ ہے۔ کہ آقا کریم اُسی کو نعمت دیتا ہے جو اس کی قدر کو پہچانتا ہو اور اُس کی قدر وہی پہچانتا ہے جو اُس پر اپنے نفس اور دل سے متوجہ ہو۔ اور دوسری چیزوں کو چھوڑ کر اُس کو پسند کر لے اور اُس کے حصول میں جو مشکلات برداشت کرنا پڑیں اُن کی پرواہ نہ کرے پھر اُس کا شکر ادا کرنے کے لیے ہمیشہ منعم کے دروازے پر کھڑا رہے۔ اور ہمارے ازلی علم میں یہ پہلے سے موجود تھا۔ کہ یہ کمزور لوگ اس نعمت کی قدر کو جانیں گے۔ اور اِس کے شکریہ کے لیے کھڑے ہوں گے تو تمہاری نسبت یہ اِس نعمت کے زیادہ حق دار تھے۔ اور تمہاری دولت مندی اور ثروت اور دنیاوی جاہ و حشمت اور حسب و نسب کی اللہ کو کوئی پرواہ نہیں تم لوگ تمام تر نعمت دنیا اور اُس کے سامان اور حسب و نسب کی بلندی کو سمجھتے ہو نہ کہ دین۔ علم۔ حق اور معرفت کو۔ یہی وجہ ہے کہ تم لوگ اِسی کی تعظیم کرتے ہو اور اسی پر فخر کرتے ہو کیا تم غور نہیں کرتے کہ تم اِس دین اور علم اور حق کو اگر قبول کرتے ہو تو اُس پر احسان جتاتے ہو جو یہ چیزیں تمہارے پاس لے کر آیا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے۔ کہ تم ان چیزوں کو حقیر سمجھتے ہو اور ان کی بہت تھوڑی پرواہ کرتے ہو اور یہ کمزور لوگ اس پر اپنی جانیں قربان کرتے ہیں۔ اس کی آبیاری کے لیے اپنا خون دیتے ہیں۔ اور جو کچھ اُن کے ہاتھوں سے اِس سلسلہ میں نکل جاتا ہے۔ اُس کی پرواہ نہیں کرتے اور نہ اُن کی پرواہ کرتے ہیں جو اُن سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اور یہ اس لیے ہے۔ کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی قدر کو

پہچانا جن کے دلوں میں اس کی تعلیم راسخ ہے۔ اور اس کے سوا ہر چیز کا ضائع ہو جانا اُن پر نہایت آسان ہے۔ اور اس میں ہر سختی کو برداشت کرنا اُن کو پسند ہے۔ تو یہ لوگ اپنی تمام عمر کو اس کے شکریہ میں ختم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ اس نعمت عظیمہ اور احسان جلیلہ کے اہل قرار پائے اور ہمارے سابقہ علم کی وجہ سے ہم نے اُن کو خاص کر لیا اور تمہیں اس سے محروم کر دیا۔

پھر میں کہتا ہوں لوگوں میں سے ہر طریق کا یہی حال ہے۔ کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے دینی نعمتوں میں سے کسی نعمت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ خواہ وہ علمی ہو یا عملی۔ جب تم حقیقت میں غور کرو گے تو ان لوگوں کو اُس کی قدر کا سب سے زیادہ جاننے والا اور اس کی تعظیم میں سب سے زیادہ سخت اور اُس کے حصول میں سب سے زیادہ کوشش کرنے والا اور اُس کی تعظیم میں سب سے بڑا اور اُس کے شکریئے میں سب سے زیادہ مضبوط پاؤ گے۔

اور بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محروم کیا ہے۔ اُن کو اپنی تقدیر کے مطابق اسی بے پرواہی اور بے ادبی کی وجہ سے محروم کیا ہے۔ پھر اگر علم اور عبادت کی تعظیم عوام اور بازاری لوگوں کے دلوں میں بھی ویسی ہی ہوتی جیسی کہ علماء اور عبادت گزاروں کے دل میں ہے۔ تو وہ کبھی بازاروں کو اختیار نہ کرتے اور اُس کو چھوڑ دینا ان پر آسان ہو جاتا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ کوئی فقیہ جب کسی ایسے مسئلہ کو دریافت کر لیتا ہے۔ جس میں پہلے اُس کو التباس تھا تو اُس کا دل کتنا خوش ہو جاتا ہے۔ اُس کی خوشی کتنی بڑی ہوتی ہے۔ اور اُس کے دل میں اُس کا مقام کتنا بزرگ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُس کو ہزار دینار مل جاتا تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اور کبھی دین کے معاملے میں کوئی مسئلہ اُس کو پریشان رکھتا ہے۔ تو وہ اس میں سال بھر تک بلکہ دس سال بلکہ بیس سال تک بھی غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ اور پھر بھی وہ اس سے اکتا نہیں جاتا یہاں تک کہ کبھی اللہ تعالیٰ اُس کو یہ مسئلہ سمجھا دیتے ہیں۔ تو پھر اس کو اللہ کا بہت بڑا احسان اور سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اپنے آپ کو تمام اغنیاء سے زیادہ غنی اور ہر شریف سے زیادہ اشرف سمجھتا ہے۔ بلکہ کبھی اس مسئلہ کو کسی بازاری یا کسی سست طالب علم کے سامنے بیان کر دیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ بھی علم کی محبت اور رغبت میں اسی جیسا ہے۔ پس وہ اُس کی طرف کان بھی نہیں رکھتا اور کبھی اگر اُس پر کلام لمبا ہو جائے تو اُکتا جاتا ہے۔ یا سو جاتا ہے۔ اگر اُس کے لیے یہ ظاہر ہو جانے تو اُسے کوئی معاملہ نہیں سمجھتا تو یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرنے والے کا ہے۔ کہ وہ ریاضت اور نفس کو شہوات اور لذات

سے محفوظ رکھنے کے لیے کتنی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے اعضاء کو حرکات و سکنات میں کس طرح پابند رکھتا ہے۔ کہ ہو سکتا ہے۔ کہ شاید اللہ تعالیٰ پوری طہارت اور آداب کے ساتھ دو رکعت کی توفیق دے دے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں کتنی زاری کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو صفائی اور حلاوت کے ساتھ ایک ساعت کی مناجات نصیب کر دے اگر وہ مہینہ بھر میں بلکہ سال بھر میں بلکہ اپنی ساری زندگی میں ایک مرتبہ بھی اس پر کامیاب ہو جائے تو اس کو بہت بڑا احسان اور سب سے عظیم نعمت سمجھتا ہے۔ اور کتنا خوش ہوتا ہے۔ اور کتنا اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اور اُن مشقتوں اور تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا جو اُس نے راتوں کو جاگ کر اُٹھائی ہیں۔ اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

پھر تو اُن لوگوں کو دیکھتا ہے۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ عبادات کی رغبت رکھتے ہیں اگر اسی طرح کی خالص عبادت مثلاً اُن کے رات کے کھانے کا ایک لقمہ بھی نقصان کرنے کے بعد حاصل ہو یا کسی ایسی بات کے چھوڑنے کے بعد جو اُن کو محبوب ہو یا اُن کی آنکھوں سے ایک ساعت کی نیند روکنے کے بعد حاصل ہو تو اُن کے نفس اِن پر آمادہ نہیں ہوتے اور نہ ان کے دِل خوش ہوتے ہیں اور اگر اتفاق سے اُن کو خالص عبادت حاصل ہو بھی جائے تو وہ اُسے کوئی بڑا معاملہ نہیں سمجھتے۔ اور نہ وہ اُس کا کوئی بڑا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کی خوشی اُس وقت ہوتی ہے۔ اور اُن کی زبان سے حمد کا کلمہ اُس وقت نکلتا ہے۔ جب اُن کو کوئی درہم مل جائے یا کوئی روٹی کا ٹکڑا مل جائے یا اچھا سالن مل جائے یا کافی مدت تک بدن کی سلامتی کے لیے نیند آجائے تو اُس وقت کہتے ہیں الحمد للہ۔ یہ اللہ کا احسان ہے۔ پھر یہ غافل عاجز لوگ اُن نیک بخت کوشش اور اجتہاد کرنے والوں کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسکین لوگ اِس بھلائی سے محروم ہیں اور وہ خدا کی توفیق دیئے گئے لوگ اِسی پر کامیاب ہیں۔ اور اسی طرح ہدایت کے معاملہ کو احکم الحاکمین نے تقسیم کر دیا ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ پس یہ تفصیل ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی۔

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ ۝ — کیا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نہیں جانتا

پس اِس کو سمجھ اور اس کے حق کی رعایت کر اور جان لے کہ جس بھلائی کی تو خواہش کرتا ہے۔ اُس سے تو صرف اسی وجہ سے محروم ہے کہ تو اس کے قدر کو نہیں جانتا سو تو اپنی ہمت صرف کر کہ اللہ کی نعمتوں اور پوری تعظیم کی قدر جانے پھر تو اُس کا اہل ہو جائے گا اور اُس کی عطا تجھے نصیب ہوگی پھر وہ تجھ پر اُس کی بقا کے ساتھ بھی احسان کرے گا جیسا کہ اُس نے تجھ پر ابتداءً احسان کیا جیسا کہ ہم اِس کو دوسرے اصل میں بیان کریں گے

بیشک وہی ہے شفقت کرنے والا مہربان۔

دوسرا اصل یہ ہے کہ جو آدمی کسی چیز کی قدر نہ جانے وہ نعمت اُس سے چھین لی جاتی ہے۔ اور جو قدر نہیں جانتا وہی ناشکرا ہے جس نے اُس نعمت کی قدر نہ کی اور اُس کا شکر ادا نہ کیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِیْ اٰتَيْنٰهُ	اور پڑھ ان پر خبر اُس آدمی کی جس کو ہم نے اپنی
اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ	آیتیں دیں پھر وہ اس سے نکل گیا پھر شیطان
الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝	اس کے پیچھے لگا سو وہ گمراہوں سے ہو گیا اور
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا۔	اگر چاہتے ہم تو اُس کو ان آیتوں کے ذریعے
(الآیۃ)	سے بلند کر دیتے۔

کلام کا مقصد یہ ہے۔ کہ ہم نے اُس بندے پر بڑی بڑی نعمتوں اور عظیم احسانات سے دین کے متعلق جو ہم نے اُس کو بصیرت دی تھی انعام کیا اور بڑا رتبہ اور رفیع منزلت اپنے دروازے پر اُس کو عطا کی تاکہ وہ ہمارے پاس بلند مرتبہ عظیم القدر بڑے جاہ و جلال والا ہو جائے لیکن وہ ہماری نعمت کی قدر سے جاہل رہا اور حقیر اور کمینی دنیا کی طرف مائل ہو گیا۔ اور اپنی کمینی اور ردی خواہشات نفس کو اختیار کر لیا اور یہ نہ جانا کہ ساری دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دینی نعمتوں میں سے ایک نعمت کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور یہ مچھر کے ایک پر کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ تو اس آدمی کی مثال اُس کتے کی سی ہے۔ جو عزت اور راحت اور توہین اور مشقت میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور نہ رفعت اور شرف کو حقارت اور خست سے الگ دیکھتا ہے سو یہ دونوں حالتوں میں ہانپتا ہے۔ اُس کے نزدیک تمام بزرگی روٹی کے ایک ٹکڑے میں ہے جسے وہ کھا لے یا دسترخوان کی ایک ہڈی میں جسے اُس کی طرف پھینک دیا جائے برابر ہے۔ کہ تو اُسے اپنے ساتھ تخت پر بیٹھائے یا اپنے سامنے اسے گندگی اور مٹی میں کھڑا کر دے سو اُس کی ہمت اور کرامت اور نعمت سب کچھ اسی میں ہے۔ تو اس بُرے انسان نے جب ہماری نعمت کی قدر کو نہ پہچانا اور جو بزرگی ہم نے اُس کو دی تھی اُس کا حق نہ پہچانا تو اُس کی بصیرت کُند ہو گئی اور ہمیں چھوڑ کر دوسروں کی طرف توجہ کرنے کے سبب سے مقام قرب میں اُس کا ادب بدتر صورت اختیار کر گیا اور ہماری نعمتوں کے تذکرہ کو چھوڑ کر حقیر دنیا اور خسیس لذت میں مشغول ہو گیا۔ تو ہم نے اُس کی طرف قہر کی نظر سے دیکھا اور اُسے انصاف

کے میدان میں کھڑا کر دیا۔ اور اُس کے متعلق مذمت کا فیصلہ نافذ کیا۔ پھر اُس سے اپنی تمام خلعتیں اور کرامتیں چھین لیں اور اُس کے دل سے اپنی معرفت کھینچ لی پھر وہ ننگا ہو کر اُن تمام نعمتوں سے باہر نکل گیا جو ہم نے اُس کو اپنے فضل سے دی تھیں۔ پس وہ ایک ہانکا ہوا کتا اور شیطان مردود ہو گیا۔ ہم اللہ کی ناراضگی اور اُس کے دردناک عذاب سے اُسی کی پناہ چاہتے ہیں وہ ہم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

پھر ایک بادشاہ کی مثال پر قناعت کر کہ وہ اپنے کسی بندے کی عزت کرے اور اُسے خاص اپنے کپڑے پہنائے اور اُسے اپنے قریب کرے اور اپنے تمام خادموں۔ دربانوں پر اُس کو سردار بنا دے اور اُسے اپنے دروازے کی ملازمت کا حکم دے پھر حکم دے کہ اُس کے لیے کسی دوسری جگہ میں محل تعمیر کیے جائیں اور اُس کے لیے بلند تخت بچھائے جائیں۔ اُس کے لیے طرح طرح کے کھانے چنے جائیں آراستہ لونڈیاں اُس کو مہیا کی جائیں۔ غلام اُس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں یہاں تک کہ جب وہ اِس ملازمت سے واپس جائے تو اُس جگہ ایک مخدوم بادشاہ کی حیثیت سے بیٹھایا جائے اور اُس کی خدمت کی حالت اور اپنے ملک اور ولایت کی حالت میں ایک ہی ساعت کا فاصلہ ہو یا اس سے بھی کم پھر اگر یہ بندہ بادشاہ کے دروازے پر جانوروں کی نگرانی کرتے ہوئے کسی نوکر کو روٹی کا ٹکڑا کھاتے دیکھے یا کسی کتے کو ہڈی چباتے ہوئے تو بادشاہ کی خدمت کو چھوڑ کر اُن کو دیکھنے میں مشغول ہو جائے اور اپنی توجہ اُس طرف پھیر دے اور شاہی خلعتوں اور کرامتوں کی طرف توجہ نہ کرے اور اُس ملازم کی طرف دوڑے اور اپنا ہاتھ پھیلا اُس سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے لگے یا کسی کتے کو ہڈی چباتے دیکھ کر مزاحمت کرنے لگے اور اُن پر رشک کرے اور اُن کی اِس حالت کو بڑا اچھا جانے تو کیا بادشاہ جب اِس آدمی کو اس حالت میں دیکھے گا تو یہ نہ سمجھے گا کہ یہ بیوقوف اور کمینہ ہمت آدمی ہے جو اس نے ہماری کرامت کا حق نہ پہچانا اور ہم نے اِس کو خلعت عطا کر کے اور اپنی بارگاہ میں حاضر کر کے اور اپنی عنایت اِس پر مبذول کر کے اِس کی جو عزت افزائی کی تھی اس نے اُس کے قدر کو نہیں دیکھا اور ہم نے اِس کے لیے دولت کے ذخیرے اور کئی قسم کی نعمتیں مہیا کی تھیں۔ یہ کمینہ ہمت اور عظیم الجہل اور بدتمیز انسان ہے۔ اِس سے خلعتیں چھین لو اور اس کو ہمارے دروازے سے دھتکار دو۔

پس یہی حال عالم کا ہے۔ جب وہ دنیا کی طرف جھک جائے اور یہی حال عابد کا ہے جب وہ خواہش کی پیروی کرنے لگے بعد اِس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی عبادت اور اپنی نعمتوں کی پہچان اور اپنی شریعت

اور اُس کے احکام سے سرفراز کیا تھا۔ پھر اُس نے اِن کے قدر کو نہ جانا تو وہ اللہ کے نزدیک سب سے حقیر اور سب سے ذلیل ہے۔ کہ اِس میں رغبت کرتا ہے۔ اور اس کی حرص رکھتا ہے۔ اور اُس کے دِل میں یہ سب سے بڑی اور سب سے محبوب چیز ہے اُن تمام چیزوں سے جو اس کو علم اور عبادت اور حکمت اور حقائق سے ہم نے عنایت کی تھیں۔ اور یہی حال ہے اُس آدمی کا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی توفیق اور عصمت سے خاص کر لیا۔ اور اپنی خدمت اور عبادت کے انوار سے اُس کو زینت بخشی اور اکثر اوقات میں رحمت کی نظر سے اُس کو دیکھا اور اس کی وجہ سے فرشتوں پر فخر کیا اور اس کو اپنے دروازے کی سرداری اور وجاہت بخشی اور اُسے شفاعت کے مقام پر کھڑا کیا۔ اور اس کو عزت کی منزل پر اُتارا یہاں تک کہ جب وہ اِس حیثیت کا ہو گیا کہ اگر اُس کو پکارے تو وہ قبول کرے اور لبیک کہے اور اگر اُس سے مانگے تو اُس کو دے اور غنی کر دے اور اگر دنیا بھر کی شفاعت کرے تو اُن کے متعلق اُن کی شفاعت کو قبول کرے اور اُسے راضی کرے اور اگر خدا کو قسم دے تو وہ اُس کی قسم کو پورا کرے اور اگر اُس کے دِل میں کسی چیز کا خیال آئے تو اُس کو سوال کرنے سے پہلے عطا کرے پھر جس آدمی کی یہ حالت ہو اور پھر بھی وہ ان نعمتوں کی قدر نہ پہچانے۔ اور اس منزلت کی قدر کو نہ دیکھے اور بے حیا نفس کی ردی خواہشات کی طرف چلا جائے یا کمینی دنیا کے حصول میں لگ جائے جس کو کوئی بقا نہیں۔ اور اُن کرامتوں اور خلعتوں اور ہدیوں اور احسانوں اور عطاؤں کو نہ دیکھے پھر اُن چیزوں کو نہ ملحوظ رکھے جن کا اُس نے وعدہ کیا ہے۔ جو آخرت میں اُس کے لیے تیار ہیں عظیم ثواب اور ہمیشہ کی رہنے والی پوری نعمتیں تو یہ کتنا حقیر آدمی ہے۔ اور کتنی بدتر حالت میں بندہ ہے اور اگر وہ جانے تو کتنے خطرناک مقام پر ہے۔ اور اِس کا یہ کام اگر وہ سمجھے تو کتنی بڑی بے حیائی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ رحیم اور شفیق سے سوال کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے عظیم فضل اور وسیع رحمت سے ہمارے حالات کو درست کر دے بیشک وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

تو اے مردتم پر لازم ہے کہ تو اپنی ہمت صرف کرے تاکہ تو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات کے قدر کو پہچانے اور جب تجھ پر دین کی نعمت کا احسان فرمائے تو دنیا اور اس کے سامان کی طرف توجہ کرنے سے پرہیز کر کیونکہ یہ تجھ سے ایک طرح کی سستی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے دین کی نعمتوں کا والی بنایا اور پھر تو نے قدر نہ کی کیا تو نے اللہ تعالیٰ کے قول کو نہیں سنا جو سید المرسلین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:۔

ولقد اٰتینٰك سبعًا من المثانی	اور بے شک دی ہم نے تجھ کو سات آیتیں
والقراٰن العظیم ۝ لا تمدن	بار بار پڑھی جانے والی اور قرآن بزرگ عطا فرمایا تو
عینیك الٰی ما متعنا بہٖ ازواجًا	ہم نے اُن کو طرح طرح کا سامان دیا ہے۔
منھم الاٰیۃ	اُس کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جسے قرآن عظیم دیا جائے اُس کا حق ہے کہ وہ حقیر دنیا کی طرف پسندیدگی اور رضامندی کی نگاہ سے کبھی نہ دیکھے۔ چہ جائیکہ اُس کو اس میں رغبت ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر ادا کرے کہ یہ وہ بزرگی ہے جس کی حرص اللہ تعالیٰ کے دوست ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے متعلق کی کہ اس پر احسان کرے لیکن اُس نے اِس کو قبول نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے حبیب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہش کی کہ اپنے چچا ابو طالب پر اس کا احسان کرے اُس نے بھی قبول نہ کیا۔

اور باقی رہا دنیا کا سامان تو یہ وہ چیز ہے۔ جو اللہ تعالیٰ ہر کافر فرعون ملحد زندیق جاہل اور فاسق کو عطا فرماتا ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے زیادہ ذلیل ہیں یہاں تک کہ وہ اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور اِس سامان سے ہر ایک نبی۔ برگزیدہ۔ صدیق۔ عالم۔ اور عابد کو محروم کر دیتا ہے۔ جو کہ اُس کی نگاہ میں سب سے بہترین مخلوق ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو روٹی کا ٹکڑا اور کپڑے کا چیتھڑا بھی بعض دفعہ نصیب نہیں ہوتا۔ اور اُن پر احسان جتاتا ہے۔ کہ اُن کو اس گندگی سے آلودہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون سے فرمایا۔ اگر میں چاہوں تو تم کو زینت دیدوں تاکہ فرعون کو معلوم ہو جائے جب کہ اُس کو ملاحظہ کرے یہ کہ اُس کی قدرت اِس سے عاجز ہے۔ تو میں کر سکتا ہوں لیکن میں تم دونوں سے دنیا کو لپیٹ لوں گا اور اُس کو تمہارے نزدیک نہ آنے دوں گا اور میں اپنے دوستوں سے ایسا ہی کرتا ہوں۔ میں اُن کو دنیا کی نعمتوں سے اس طرح ہانک دیتا ہوں جس طرح مشفق چرواہا اپنے اونٹوں کو خطرناک جگہوں سے روک دیتا ہے۔ اور دنیا کے عیش اور اطمینان کو اُن سے الگ رکھتا ہوں اور یہ اس لیے نہیں کہ وہ میری نگاہ میں ذلیل ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ میری کرامت سے پورا حصہ حاصل کر سکیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

ولو لا ان یکون الناس امۃ	اور اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ ایک ہی گروہ
واحدۃ لجعلنا من یکفر بالرحمٰن	ہو جائیں گے تو ہم خدا تعالیٰ کا انکار کرنے والوں
لبیوتھم سقفا من فضۃ۔ الاٰیۃ۔	کے مکانوں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے۔

پس دونوں امور میں غور کر اگر تجھے بصیرت حاصل ہے۔ اور کہہ تمام تعریف اُس اللہ کے لیے ہے کہ جس نے ہم پر اپنے اولیاء و اصفیاء کی نعمتوں سے احسان فرمایا۔ اور اپنے دشمنوں کے فتنے کو ہم سے دور کر دیا تاکہ ہم حمدِ اکبر اور پورے شکر اور بڑے احسان اور نعمت عظمیٰ کے ساتھ مخصوص ہو جائیں اور حصّہ حاصل کریں۔ جو کہ اسلام ہے۔ پس یہ نعمت اس قابل ہے کہ تو اس کی شکر گزاری سے دن رات میں کسی وقت بھی غفلت نہ کرے اگر تو اس کے قدر کو پہچاننے سے عاجز ہے تو جان لے کہ اگر تو دنیا کی ابتدا ہی میں پیدا کر لیا جاتا اور اسلام کی نعمت کے شکریہ ادا کرنے میں اول وقت سے لے کر ہمیشہ تک مصروف رہتا تو تو اس کا حق ادا نہ کر سکتا بلکہ اِس فضلِ عظیم کے بعض حقوق بھی ادا نہ ہوئے۔

میں کہتا ہوں جاننا چاہیے کہ یہ مقام میری دانست کے مطابق جو میں اس نعمت کا قدر جانتا ہوں اِس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اِس کے متعلق ایک کروڑ ورق بھی لکھے جائیں تو پھر بھی میرا علم اس سے زیادہ ہوتا۔ باوجود اس اعتراف کے کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ نہ جاننے کے مقابل میں تمام دنیا کے سمندروں کے مقابلے میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا تو نے سیّد المرسلین کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا قول نہیں سنا:۔

ما كنت تدری ما الكتاب ولا الایمان الی ان قال وعلمك ما لم تكن تعلم وكان فضل الله علیك عظیما ۔	نہیں تھا تو جانتا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کیا چیز یہاں تک کہ فرمایا اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا۔ اور تجھ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

بل الله یمن علیكم ان هدٰكم للایمان الآیة	بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی راہ نمائی کی۔

اور کیا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں سنا جب کہ آپ نے ایک آدمی سے سنا کہ وہ کہہ رہا تھا:۔

الحمد لله علی الاسلام ۔	تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں کہ اس نے اسلام کی دولت بخشی۔

توآپؑ نے فرمایا تونے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت پر تعریف کی۔

اور جب یعقوبؑ کے پاس خوشخبری لانے والا آیا تو آپ نے فرمایا تونے یوسفؑ کو کس دین پر چھوڑا۔ اُس نے کہا دین اسلام پر تو آپ نے فرمایا اب نعمت پوری ہوگئی اور کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی کلمہ اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں اور نہ اس سے زیادہ شکرگزاری میں کوئی کلمہ ہے کہ بندہ کہے تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم پر احسان فرمایا اور دین اسلام کی راہنمائی کی۔

اور اس سے ہوشیار رہنا کہ اسلام کے شکرانہ میں کبھی غفلت نہ کرنا اور اسلام اور معرفت اور توفیق اور عصمت کے جس حال پر تو فائز ہے۔ اس سے دھوکہ نہ کھا جانا۔ کیونکہ اس کے باوجود امن اور غفلت کا یہ مقام نہیں ہے کیونکہ تمام امور کا تعلق انجام سے ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے۔ جو آدمی اپنے دین پر مطمئن ہو جائے اُس سے دین چھین لیا جاتا ہے۔ اور ہمارے شیخ رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تو کافروں کا حال اور ان کا ہمیشہ آگ میں رہنا سنے تو اپنے نفس پر مطمئن نہ ہو کیونکہ معاملہ خطرناک ہے۔ اور تو نہیں جانتا کہ انجام کیا ہوگا۔ اور تیرے متعلق غیب میں کیا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تو اپنے اوقات کی صفائی پر مغرور نہ ہو کہ اُن کے نیچے نہایت گہری آفتیں موجود ہیں اور بعض نے کہا اے عصمت سے دھوکا کھانے والے گروہ اس کے نیچے طرح طرح کی آفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو طرح طرح کی عصمت سے مزین کیا اور وہ حقیقت میں اُس کے نزدیک ملعون تھا۔ اور بلعام کو اپنی ولایت کے نور سے مزین کیا۔ حالانکہ وہ اُس کے نزدیک حقیقت میں دشمن تھا۔ اور حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کتنے ہی لوگوں کو احسان کرکے مہلت دی جاتی ہے۔ اور کتنے ہی آدمی اچھے قول سے فتنے میں مبتلا ہیں۔ اور کتنے ہی آدمی خدا کی پردہ پوشی سے دھوکہ میں مبتلا ہیں۔ ذوالنون مصری سے پوچھا گیا۔ کہ وہ کونسی خطرناک چیز ہے جس سے بندہ دھوکہ کھا جاتا ہے۔ تو کہا الطاف اور کرامات سے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ — کہ ہم اُن کو اس طرح آہستہ آہستہ کھینچ رہے ہیں کہ وہ نہیں جانتے۔

اہل معرفت نے کہا کہ ہم اُن پر نعمتیں پوری کرتے ہیں اور اُن کو شکر ادا کرنا بھلا دیتے ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

احسنت ظنك بالايام اذ حسنت — ولم تخف سوء ما يأتي به القدر

وسالمتك الليالي فاغتررت بها
وعند صفو الليالي يحدث الكدر

ترجمہ:۔ جب تجھ پر اچھے دن ہوں تو تو اُن کو اچھا سمجھتا ہے۔ اور اس کا خوف نہیں رکھتا جو تقدیر سے دن نستاتی ہے۔ اور تیری راتیں سلامتی سے گزرتی ہیں تو تو اس کا دھوکہ کھا جاتا ہے۔ اور راتوں کی صفائی کے وقت کدورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور جان لینا چاہیے کہ جب تو بہت زیادہ قریب ہو جائے تو تیرا معاملہ بہت زیادہ خوفناک اور مشکل ہے۔ اور تیرا امر بہت زیادہ سخت اور باریک ہے۔ اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے۔ کہ کوئی چیز جب انتہائی بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ تو جب وہ نیچے گرتی ہے۔ تو بہت بُری طرح سے گرتی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

ما طار طير فارتفع الا كما طار وقع

ترجمہ:۔ جب کوئی پرندہ اُڑ کر بلند چلا جاتا ہے۔ تو جس طرح سے اُڑتا ہے۔ اُسی طرح گرتا ہے۔

تو اس وقت مطمئن ہونے اور شکرانے سے غفلت برتنے اور اپنے حال کی حفاظت میں عاجزی اور زاری کو چھوڑ دینے کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ابراہیم بن ادھم فرمایا کرتے تھے ہم کیسے مطمئن ہو سکتے تھے جب کہ ابراہیم خلیل یہ عرض کرتے ہیں:۔

واجنبني وبني ان نعبد الاصنام۔ کہ مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی عبادت سے محفوظ رکھ۔

اور یوسف صدیق علیہ السلام عرض کرتے ہیں:۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا۔ مجھے اسلام کی حالت میں فوت کر۔

اور سفیان ثوری ہمیشہ کہتے رہتے یا اللہ بچائے بچائے گویا کہ آپ کشتی میں ہیں جس کے غرق ہونے کا اندیشہ ہے۔

اور ہمیں محمد بن یوسف رحمہ اللہ سے روایت پہنچی ہے۔ آپ نے کہا میں نے سفیان ثوری کو ایک رات غور سے دیکھا وہ ساری رات روتے رہے ہیں نے پوچھا کیا گناہوں پر روتے ہو؟ تو آپ نے ایک تنکا اُٹھایا اور کہا گناہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اللہ مجھ سے اسلام نہ چھین لے اور اس سے خدا کی پناہ۔

اور میں نے بعض عارفین سے سنا ہے۔ کہتے تھے کہ بعض انبیاء علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ سے بلعام اور اُس کے مردود ہونے کا معاملہ پوچھا کہ وہ اِن آیات اور کرامات کے بعد کیسے مردود ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ میں نے اُس کو دیا تھا اُس پر اُس نے ساری زندگی میرا ایک دن بھی شکر ادا نہ کیا۔ اور اگر ایک دفعہ بھی وہ میرا شکریہ ادا کر دیتا تو میں اُس سے نہ چھینتا۔

پس اے آدمی ہوشیار ہو اور شکر کے رکن کی بہت زیادہ حفاظت کر اور دینی نعمتوں پر اس کی حمد بیان کر کہ سب نعمتوں سے بالاتر اسلام اور معرفت ہے۔ اور سب سے چھوٹی نعمت تسبیح کہنے کی توفیق یا بے مقصد بات کرنے سے پرہیز ہے۔ ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں تجھ پر پوری کرے۔ اور زوال کی کڑواہٹ میں تجھے مبتلا نہ کرے کہ سب سے زیادہ تلخ اور سب سے زیادہ مشکل عزت کے بعد ذلت اور قرب کے بعد بُعد اور وصال کے بعد فراق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بزرگ کریم شفیق اور مہربان ہے۔

فصل:

اور قصہ مختصر کہ جب تو اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے احسانات اور بڑی بڑی نعمتوں کو اپنے اوپر دیکھے کہ جن کو تیرا دل شمار بھی نہیں کر سکتا اور تیرا خیال اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں تک کہ تو نے ان مشکل گھاٹیوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ اور علوم اور بصیرتوں کو پا لیا۔ اور بڑے گناہوں کے بوجھ سے پاک ہو گیا۔ اور موانعات سے آگے نکل گیا۔ اور عوارضات کو رد کر دیا اور بڑی چیزوں سے سلامت بچ نکلا اور اللہ کی رحمتوں پر فائز ہو گیا۔ تو کتنی ہی شریف خصلتیں اور بلند رتبے تجھ کو حاصل ہو گئے کہ جن کی ابتدا بصیرت اور پہچان سے ہوئی تھی اُن کی انتہا قرب اور بزرگی پر ہوئی۔ پھر تو اس میں اپنے عقل کی مقدار اور توفیق کے مطابق غور کرے گا اور اپنی ہمت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرے گا تو تیری زبان اُس کی حمد اور ثناء میں مشغول ہو جائے گی اور تیرا دل اُس کی عظمت اور رونق سے بھر جائے گا اور تو ایسے مقام پر پہنچ جائے گا کہ وہ تیرے اور تیرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے اور تجھے اُس کی خدمت پہ تیری ہمت کے مطابق آمادہ کرے گا اور اُس کے انعام اور احسان کا حق ادا کرنے سے اپنی طاقت کے مطابق کوتاہی کا اقرار کرنے پر اُبھارے گا اور جب تو اُس کے شکر سے غافل ہو جائے یا خاموش ہو جائے یا پھسل جائے تو تو اُس کی طرف تضرع اور زاری کرے اور کوشش کرے اور وسیلہ تلاش کرے اور کہے اے اللہ اے میرے مالک جس طرح تو نے بغیر کسی استحقاق کے محض اپنے فضل سے احسان کی ابتدا کی تھی اسی طرح بغیر کسی استحقاق کے

اپنے فضل سے اِسی کو انتہا تک پہنچا۔ اور اُس کو اُس کے اولیاء کی زبان میں پکار کہ جنھوں نے اس کی ہدایت کا تاج پایا اور اُس کی معرفت کی حلاوت چکھی پھر بھی وہ اپنے اوپر ہانک دینے اور اہانت کی جلن اور گمراہی اور بعد کی وحشت اور معزولی اور زوال کی کڑواہٹ سے ڈرتے رہے۔ وہ دروازے پر فریاد کرتے ہوئے روتے اور عاجزی کرتے ہوئے اُسی کی طرف ہاتھ پھیلاتے رہے۔ اور اپنی خلوتوں میں چیخ چیخ کر دُعائیں کرتے :-

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

اے ہمارے رب ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنی جناب سے رحمت عنایت فرما۔ بیشک تو ہی عطا کرنے والا ہے۔

میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانیں کہ ہم نے تجھ سے نعمت حاصل کی اور دوسری نعمت کے ہم امیدوار ہیں کہ تو ہی سخی اور عطا کرنے والا ہے۔ پھر جس طرح تو نے ہمیں انعام کی فضیلت ابتدا میں بخشی ہے ۔ اسی طرح اتمام کی رحمت انتہا میں عطا فرما۔ کیا تو نے غور نہیں کیا کہ سب سے پہلی دُعا جو اللہ رب العالمین نے اپنے مسلمان بندوں کو سکھائی ہے جس کو اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے انتخاب فرمایا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے :-

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ہمیں سیدھے راستے کی راہنمائی فرما۔

یعنی ہمیں ہمیشہ اِس پر ثابت قدم رکھ اسی طرح ہم بھی اُس کی جناب میں التجا کرتے ہیں کہ معاملہ بہت عظیم ہے۔

کہا گیا ہے کہ حکماء نے غور کیا تو جہان کی تمام مصیبتوں اور محنتوں کو پانچ چیزوں میں پایا مسافری میں بیماری۔ بڑھاپا میں فقیری۔ جوانی میں موت۔ اور دیکھنے کے بعد اندھا ہونا۔ اور معرفت کے بعد بے بصیرت ہو جانا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر کسی کا یہ قول ہے :-

لکل شیٔ اذا فارقته عوض ولیس للّٰه ان فارقت من عوض

ترجمہ:- ہر چیز کا کوئی نہ کوئی عوض ہے۔ جب اس کو چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اگر تو خدا کو چھوڑ دے تو اس کا کوئی عوض نہیں۔

اور کسی اور نے کہا ہے :-

اذا ابقت الدنیا علی المرء دینه — فما فاته منها فلیس بضائر

ترجمہ:۔ جب دنیا کسی آدمی کا دین خراب نہ کرے تو جو کچھ بھی اُس سے ضائع ہو جائے وہ نقصان دینے والا نہیں ہے۔

اور اسی طرح ہر ایک نعمت کا معاملہ ہے۔ جو وہ تجھ کو انعام فرمائے اور ان گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی کے قطع کرنے میں خدا کی تائید اسی طرح ہے۔ تاکہ جو اُس نے تجھے دیا ہے۔ اُسے ہمیشہ رکھے اور تجھے تیری تمنا اور خواہش سے بھی زیادہ دے پھر جب تو اس مقام پر پہنچ جائے تو تو نے اس خطرناک گھاٹی کو عبور کر لیا اور تو نے دو نہایت اچھے خزانے حاصل کر لیے جو کہ استقامت اور زیادت ہیں۔ پھر موجودہ نعمتیں جو اُس نے تجھے عطا کی ہیں تیرے پاس ہمیشہ رہیں گی۔ تجھے ان کے زوال کا خطرہ نہ ہو گا۔ اور جو نعمتیں تجھے اُس نے عطا نہیں کی ہیں وہ تجھے عطا فرمائے گا۔ حالانکہ تو اُن کو اچھی طرح مانگ بھی نہیں سکتا اور آرزو بھی نہیں رکھتا۔ پس تو اُن کے فوت ہونے سے نہ ڈر اور اس وقت تو اُن لوگوں سے ہو جائے گا جو کہ عارف۔ عالم۔ دین کے عامل۔ گناہوں سے توبہ کرنے والے پاک نفوس دنیا سے بے رغبت اور خدا کی خدمت کے لیے الگ ہونے والے شیطان کو مغلوب کرنے والے دل اور اعضاء سے پوری طرح تقویٰ اختیار کرنے والے امیدوں کو کم کرنے والے ناصح، خاشع اور تواضع کرنے والے توکل کرنے والے اپنے کام کو خدا کے سپرد کرنے والے راضی برضا، صبر کرنے والے۔ ڈرنے والے سا امید رکھنے والے مخلص۔ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھنے والے۔ اور اپنے مالک رب العالمین کی نعمتوں کا شکر کرنے والے ہیں۔ پھر تو اس کے بعد اُن لوگوں سے ہو جانے گا جو سیدھی راہ پر قائم رہنے والے معزز اور صدیق ہیں اس کلام میں غور کر اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

پھر اگر تو کہے کہ اگر معاملہ اس طرح کا ہے۔ تو اس معبود کی عبادت کرنے والے اور اس مقصود پر پہنچنے والے بہت تھوڑے لوگ ہوں گے اور کون آدمی ایسی مشقتوں کی طاقت رکھتا ہے۔ اور کون ان شرائط اور سنتوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ تو معلوم ہونا چاہیے کہ خداوند تعالیٰ بھی ایسا ہی فرماتے ہیں:۔

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۔ — اور میرے تھوڑے بندے شکر گزار ہیں۔

اور فرمایا:۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۔ لَا يَعْقِلُونَ ۔ لَا يَعْلَمُونَ ۔ — لیکن۔ اکثر لوگ شکر نہیں کرتے نہیں عقل کرتے نہیں جانتے۔

پھر یہ معاملہ اُس آدمی پر نہایت آسان ہے جس پہ اللہ آسان کر دے۔ بندہ کے ذمہ کوشش کرنا ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ کے ذمہ ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم اپنی راہوں کی ان کو راہنمائی کریں گے۔

اور جب ایک کمزور بندہ اپنے فرائض کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو رب قدیر غنی اور کریم اور رحیم کے متعلق تم کیا خیال کرتے ہو۔

پھر اگر تو کہے کہ عمر تھوڑی ہے۔ اور یہ گھاٹیاں بڑی طویل اور سخت ہیں پھر کس طرح عمر باقی رہے گی کہ یہ تمام شرائط پوری ہو سکیں۔ اور یہ گھاٹیاں طے کی جا سکیں۔ تو مجھے اپنی عمر کی قسم یہ گھاٹیاں واقعی بڑی طویل ہیں اور ان کی شرائط بھی بڑی سخت ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو انتخاب کر لیتے ہیں تو یہ لمبائی اُس پر چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اور یہ سختیاں اُس پہ آسان ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ بندہ ان کو قطع کرنے کے بعد کہتا ہے۔ کہ یہ راہ کتنی قریب ہے۔ کتنی مختصر ہے۔ کتنی آسان اور نرم ہے۔ اور میں جب اس جنگل میں کھڑا تھا تو میں نے یہ شعر کہا تھا:۔

علم المحجة واضح لمريده وارى القلوب عن المحجة فى عمى

ولقد عجبت لهالك ونجاته موجودة ولقد عجبت لمن نجا

ترجمہ:۔ سیدھے راستے کا علم چاہنے والے کے لیے واضح ہے۔ اور میں دلوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ سیدھے راستے سے اندھے ہیں۔ اور میں نے تعجب کیا ہلاک ہونے والے پر حالانکہ اُس کی نجات موجود تھی اور میں نے نجات پانے والے پر بھی تعجب کیا۔

یہاں تک کہ بعض ایسے لوگ ہیں جو ان گھاٹیوں کو ستر سال میں طے کرتے ہیں اور بعض بیس سال میں اور بعض دس سال میں اور بعض وہ ہیں کہ جن کو یہ ایک سال میں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور بعض ان کو ایک مہینہ میں طے کر لیتے ہیں بلکہ ایک جمعے میں۔ بلکہ ایک ساعت میں یہاں تک کہ بعض کو خداوند تعالیٰ کی خاص توفیق اور عنایت سے ایک لحظہ میں حاصل ہو جاتی ہیں۔

کیا تو اصحاب کہف کا واقعہ یاد نہیں کرتا۔ کہ اُن کی مدت کتنی مختصر تھی جب انہوں نے اپنے بادشاہ دقیانوس کے چہرے میں تغیر دیکھا تو کہا:۔

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا

تو کہنے لگے ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اُس کے سوا کسی معبود کو کبھی نہ پکاریں گے۔

اُن کو یہ معرفت حاصل ہوئی اور اِس راہ کے حقائق انہوں نے ملاحظہ کیے اور اس راہ کو طے کیا تو وہ اپنا معاملہ اللہ کو سپرد کرنے والے اُسی پر بھروسہ رکھنے والے اور اِس راہ پر قائم رہنے والے بن گئے جبکہ انہوں نے کہا:۔

فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ۔

تو غار میں جگہ پکڑو۔ تمہارا رب اپنی رحمت تم پر پھیلا دے گا۔

اور یہ سب کچھ اُن کو ایک ساعت یا ایک لحظہ میں حاصل ہو گیا۔

کیا تمہیں فرعون کے جادوگروں کا واقعہ یاد نہیں کہ اِن کی مدت ایک لحظہ بھر تھی جب انہوں نے موسیٰؑ کا معجزہ دیکھا تو:۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۔

کہنے لگے ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کا رب ہے۔

انہوں نے ایک ہی لحظہ میں اِس راہ کو دیکھا اور اُسے طے کر گئے اور خدا تعالیٰ کو پہچاننے والوں اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنے والوں اور اُس کی مصیبتوں پر صبر کرنے والوں اور اُس کی نعمتوں کا شکر کرنے والوں اور اُس کی ملاقات کا شوق رکھنے والوں سے ہو گئے اور پکار اُٹھے:۔

لَا ضَيْرَ ۔ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۔

کوئی پرواہ نہیں ہم اپنے رب کی طرف پھرنے والے ہیں۔

ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیم بن ادھم دنیا میں ایک بادشاہ تھے۔ انہوں نے بادشاہی چھوڑ دی اور اس راہ کا قصد کیا اُن کے لیے یہ راہ اتنی ہی ثابت ہوئی جتنی دیر میں وہ بلخ سے مرو تک جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اِس مقام پر پہنچے کہ ایک آدمی پل پر سے بہت گہرے پانی میں گرا۔ ابراہیم نے اشارہ کر کے کہا ٹھہر جا تو وہ آدمی ہوا ہی میں معلق ٹھہر گیا اور پانی سے بچ گیا۔

اور رابعہ بصری ایک بوڑھی لونڈی تھی اس کو بصرہ کے بازاروں میں گھمایا جاتا اور بوڑھی ہونے

کی وجہ سے اِس کو کوئی نہ خریدتا ایک سوداگر کو اُس پر رحم آیا اُس نے اُس کو سو درہم سے خرید کر آزاد کر دیا۔ پھر اُس نے یہ راستہ اختیار کر لیا۔ اور عبادت پر متوجہ ہوئی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ بصرہ کے زاہد، قاری اور علماء لوگ اُس کے مرتبہ کی بلندی کی وجہ سے اُس کی زیارت کو آنے لگے۔

اور جس آدمی کو خداوند تعالیٰ کی عنایت شامل حال نہ ہو اور اُس پر فضل اور ہدایت کا معاملہ نہ کیا جائے تو اُسے اُس کے نفس کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ پھر بسا اوقات وہ ایک ہی گھاٹی کی کسی وادی میں ستر سال تک پڑا رہتا ہے۔ اور اُسے طے نہیں کر پاتا اور کتنی دفعہ چیخ چیخ اٹھتا ہے۔ کہ یہ راہ کتنی اندھیری کتنی مشکل ہے۔ اور یہ معاملہ کتنا تنگ اور دشوار ہے۔ پس حالت ایک ہی لفظ کی طرف لوٹتی ہے۔ اور وہ ہے غالب جاننے والا عادل اور حکیم کی تقدیر۔

پھر اگر تو یہ سوال کرے کہ اُس کو توفیق خاص سے کیوں نوازا گیا۔ اور اس کو کیوں محروم رکھا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں مشترکہ طور پہ غلامی کی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ تو اس سوال پر خداوند تعالیٰ کے جلال کے پردوں سے آواز آتی ہے کہ ادب ملحوظ رکھو۔ اور ربوبیت کے اسرار کو پہچانو اور عبودیت کی حقیقت معلوم کرو کہ وہ :-

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ
جو کچھ کرتا ہے۔ اُس سے وجہ نہیں پوچھی جا سکتی اور باقی سب لوگ پوچھے جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں دنیا میں اِس راہ کی مثال آخرت میں پلصراط کی گھاٹیوں اور مسافروں کے اس کو طے کرنے کی ہے۔ کہ مخلوق کے احوال وہاں مختلف ہیں۔ اُن میں سے بعض پلصراط کو اس طرح عبور کریں گے جیسے چمکنے والی بجلی اور بعض تیز و تند آندھی کی طرح اور بعض تیز رفتار گھوڑے کی مثل۔ اور کچھ پرندوں کی طرح کچھ پیدل چلتے ہوئے کچھ گھسٹتے ہوئے یہاں تک کہ وہ کوئلے کی طرح ہو جائیں گے اور کچھ اُس کی آوازیں سنیں گے اور کچھ اُس کے آنکڑوں میں گرفتار ہو جائیں گے اور اُن کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا یہی حال اِس راہ کا دنیا میں اپنے مسافروں کے ساتھ ہے۔ پس یہ دونوں راستے ہیں ایک دنیا کا راستہ اور ایک آخرت کا راستہ۔ آخرت کا راستہ تو نفس کا راستہ ہے۔ کہ وہ اس کی ہولناکیاں آنکھوں والے دیکھیں گے اور دنیا کا راستہ دلوں کا راستہ ہے۔ اِس کی ہولناکیاں بصیرت اور عقل والے دیکھتے ہیں۔ اور آخرت میں ٹھہرنے والوں کے حالات مختلف ہوں گے کیونکہ دنیا میں بھی ان کے حالات مختلف ہوں گے پس اِس پر پوری طرح

توجہ کر اور توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

فصل:

پھر جاننا چاہیے کہ جو کچھ اس باب میں محقق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ راستہ لمبا اور چھوٹا ہونے میں اُن مسافتوں کی طرح نہیں ہے۔ جن کو آدمی قدموں سے طے کرتے ہیں۔ پھر نفس کی قوت اور اُس کے ضعف کے مطابق اُس کو طے کرتے ہیں۔ بلکہ یہ راستہ روحانی راستہ ہے جسے دل طے کرتے ہیں اور فکر سے طے کرتے ہیں۔ اپنے عقائد اور بصیرت کے مطابق طے کرتے ہیں۔ اور اس کا اصل ایک آسمانی نور اور خداوندی نگاہ ہے جو کسی بندے کے دل پر پڑے پھر وہ اس کے ساتھ دونوں جہانوں کے معاملہ پر حقیقت کے ساتھ غور کرتا ہے۔

پھر یہ نور وہ ہے۔ کہ بندہ اُس کو سو سال تک تلاش کرتا رہتا ہے۔ اور اُسے نہیں پاتا اور نہ اُس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ اور یہ بندے کی طلب اور کوشش میں کوتاہی اور اس راہ کی نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور کوئی اور اس کو پچاس سال کے بعد پا لیتا ہے۔ اور کوئی اس کو دس سال میں۔ کوئی ایک دن میں ... ئی رب العزت کی عنایت سے ایک ساعت اور ایک لحظہ میں پالیتا ہے۔ اور وہی ہدایت کا والی ہے۔ لیکن بندے کو کوشش کا حکم دیا گیا ہے۔ اور حکم کی تعمیل اُسی پر لازم ہے۔ اور امر مفہوم ہے۔ اور پروردگار حاکم عادل کی تقدیر کے مطابق ہے۔ وہ جو چاہتا کرتا ہے۔ اور جو چاہتا ہے۔ اس کا حکم دیتا ہے۔

پھر اگر تو یہ سوال کرے کہ یہ خطرہ کتنا بڑا ہے اور یہ معاملہ کتنا سخت ہے اور بندہ کمزور کتنا محتاج ہے پھر یہ سارا عمل اور کوشش اور ان شرائط کا حصول کس لیے ہے۔

تو میں کہوں گا مجھے اپنی عمر کی قسم تو اپنے اِس قول میں بالکل سچا ہے کہ معاملہ بڑا سخت ہے۔ اور خطرہ بہت عظیم ہے۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۔ — ہم نے انسان کو محنت میں پیدا کیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ. اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔

کہ ہم نے امانت کو آسمانوں زمینوں پہاڑوں پر پیش کیا انہوں نے اس کو اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور اس کو انسان نے اُٹھا لیا بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اور اسی لیے سیّد المرسلینؐ نے فرمایا۔

لو علمتم ما اعلم لبکیتم کثیرا و لضحکتم قلیلا۔ — اگر تم وہ کچھ جانو جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روؤ اور تھوڑا ہنسو۔

اور وہ جو بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ایک آواز دینے والا آسمان سے آواز دیتا ہے۔ کہ کاش مخلوق پیدا نہ ہوتی۔ اور اگر پیدا ہوئی تھی تو اپنی پیدائش کے مقصد کو سمجھتی اور جب مقصد کو سمجھ لیا تو کاش اُس کے مطابق عمل کرتی اور سلف صالحین بھی اسی طرح کہا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا میں پسند کرتا ہوں کہ میں کوئی گھاس ہوتا کہ جانور مجھے کھا جاتے اور ایسا عذاب کے خوف سے فرماتے اور عمر فاروقؓ نے ایک آدمی کو سنا وہ تلاوت کر رہا تھا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا۔ — کہ انسان پر ایک ایسا زمانہ گزرا ہے۔ کہ جب یہ کوئی چیز یعنی ذکر کے قابل بھی نہ تھا۔

تو آپ نے فرمایا کاش معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔

اور ابو عبیدہ بن جراحؓ نے فرمایا میں پسند کرتا ہوں کہ میں اپنے گھر والوں کا مینڈھا ہوتا میرا گوشت لوگوں میں تقسیم ہو جاتا اور میرا شوربہ لوگ پی جاتے۔ اور میں قیامت کو دوبارہ پیدا نہ ہوتا۔

اور وہب بن منبہ نے فرمایا آدم کا بیٹا احمق پیدا ہوا ہے۔ اگر یہ احمق نہ ہوتا تو دنیا میں اس کی زندگی کبھی خوشگوار نہ ہو سکتی۔

اور فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا میں کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل اور بندہ صالح پر رشک نہیں کرتا کیا قیامت کے روز ان پر عتاب نہیں کیا جائے گا۔ میں تو صرف اُن پر رشک کرتا ہوں جو پیدا نہیں ہوئے۔

عطاء سلمی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر آگ جلا دی جائے اور کہا جائے کہ جو آدمی اپنے آپ کو اس میں ڈال دے گا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ تو مجھے ڈر ہے کہ میں آگ تک پہنچنے سے پہلے ہی خوشی کی وجہ سے مر جاؤں گا۔

تو معاملہ اے انسان واقعی بڑا سخت ہے۔ جیسا کہ تو نے کہا ہے۔ بلکہ وہ تیرے وہم و گمان سے بھی بہت زیادہ سخت اور عظیم ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو تقدیر میں ازل سے نافذ ہو چکا ہے اور

غالب جاننے والے کی تدبیر نے اِس کو جاری کیا ہے۔ تو اب بندے کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی غلامی اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عاجزی اور زاری سے تھامے۔ پھر ممکن ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور اپنے فضل سے اُس پر رحم کرے۔

باقی رہا تیرا یہ کہنا کہ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ تو یہ ایک ایسا کلام ہے۔ کہ جو تیری عظیم غفلت پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ درست یہ تھا کہ تو کہتا کہ جو کچھ بندہ چاہتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ یہ کمزور بندہ کیا چاہتا ہے۔ اس کا کثر مطالبہ دو چیزیں ہیں پہلی یہ کہ دونوں جہانوں میں سلامت رہے۔ اور دوسری یہ کہ دونوں جہانوں میں بادشاہی کرے۔ اب دنیا کی سلامتی تو اس طرح ہے کہ دنیا اور اُس کی آفتیں اور اُس فتنے اور غفلت کے پردے اس طرح کے ہیں کہ اُس سے ملائکہ مقربین بھی نہیں بچ سکے یقیناً تو نے ہاروت اور ماروت کا واقعہ سنا ہوگا۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ جب بندے کی روح کو آسمان پرلے جایا جاتا ہے۔ تو آسمانوں کے فرشتے تعجب سے کہتے ہیں کہ یہ اُس دنیا سے کس طرح بچ کر آگیا جہاں ہمارے بہترین فرشتے بھی تباہ ہو گئے۔ اور آخرت اپنی ہولناکیوں اور سختیوں میں اس طرح کی ہے۔ کہ جس سے انبیاء اور رسول بھی چیخ اٹھے:۔

نَفْسِیْ نَفْسِیْ لَا اَسْئَلُكَ الْیَوْمَ اِلَّا نَفْسِیْ — مجھے بچالے مجھے بچالے۔ میں تجھ سے صرف اپنی جان کی امان چاہتا ہوں۔

یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس ستر نبیوں کے عمل بھی ہوں تو وہ بھی یہی سمجھے گا کہ نجات مشکل ہے۔ پھر جو آدمی چاہے کہ اِن فتنوں سے محفوظ رہے۔ تو اُسے چاہیے کہ وہ اسلام کو اپنے ہمراہ لے کر نکلے سلامتی کے ساتھ چلا جائے گا اُسے کوئی مصیبت نہ پہنچے گی۔ اور آخرت کے ہولناک مناظر سے بچ کر جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جائے گا۔ اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اب سوچ کہ یہ معمولی کام ہے؟

اور باقی رہی حکومت اور کرامت تو حکومت یہ ہے۔ کہ انسان کا تصرف اور مشیت نافذ ہو اور یہ حقیقت میں دنیا میں تو خداوند تعالیٰ کے دوستوں اور اُس کے برگزیدہ لوگوں اُس کی تقدیر پر راضی رہنے والوں کے لیے ہے۔ کہ جنگل اور سمندر اور زمین ان کے لیے ایک ہی قدم ہے۔ اور پتھر اور اینٹیں اُن کے لیے سونا ہیں اور جن اور انسان اور چرندے اور پرندے اُن کے تابع ہیں۔ وہ جو کچھ بھی چاہتے ہیں ہو جاتا

ہے۔ کیونکہ وہ وہی چاہتے ہیں جو اللہ چاہے۔ اور جو اللہ چاہے وہ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی مخلوق سے نہیں ڈرتے اور ان سے تمام مخلوق ڈرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی غلامی نہیں کرتے اور کائنات کی ہر چیز ان کی غلامی کرتی ہے۔ اور دنیا کے بادشاہوں کو اس رتبہ کا عشر عشیر بھی کہاں نصیب ہے۔ بلکہ وہ بہت تھوڑے اور بہت ذلیل ہیں۔

باقی رہی آخرت کی بادشاہی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب تو وہاں دیکھے گا تو ایک بڑا ملک اور نعمتیں دیکھے گا اور جس کو رب العزت ملک کبیر فرمائیں اُس کی عظمت کا اندازہ کرو۔ اور یہ تو تو جانتا ہے۔ کہ دنیا ساری کی ساری تھوڑی ہے۔ اور اس کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ساری عمر بھی بہت تھوڑی ہے اور ہم میں سے کسی ایک آدمی کا حصہ اس تھوڑے میں سے تھوڑا ہے۔ اور پھر بھی ہم میں سے بعض آدمی اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنا مال اور جان قربان کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس کو تھوڑے سے تھوڑا حاصل کر لیتے ہیں اور پھر اس کی مدت بھی تھوڑی ہوتی ہے۔ اور اگر اُسے حاصل ہو جائے تو لوگ اُس کو معذور سمجھتے ہیں بلکہ اُس پر رشک کرتے ہیں۔ اور جو کچھ اُس نے اس کے حاصل کرنے میں اپنی جان اور مال کو خرچ کیا ہے۔ اُس کو زیادہ نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ امرء القیس نے کہا:۔

بکی صاحبی لما رای الدرب دونہ　　وایقن انا لاحقان بقیصرا

فقلت لہ لا تبك عینیك انما　　نحاول ملکا او نموت فنعذرا

ترجمہ:۔ میرے ساتھی نے جب اپنے سامنے پھاٹک کو دیکھا تو رونے لگا۔ اور اُس نے یقین کر لیا کہ ہم قیصر سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ تو میں نے اُس سے کہا تیری آنکھیں نہ روئیں۔ ہم بادشاہ سے جلد کرکے دولت حاصل کریں گے یا مر جائیں گے تو دنیا ہمیں معذور سمجھے گی۔

پھر اُس آدمی کا کیا حال ہو گا جو ہمیشہ رہنے والی جنت میں بہت بڑی حکومت چاہتا ہے۔ کیا وہ اس کے مقابلے میں اُن دو رکعتوں کو جو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہے۔ یا وہ دو درہم جو خرچ کرتا ہے۔ یا دو راتیں جو جاگتا ہے۔ ان کو کافی سمجھتا ہے۔ ہرگز ہرگز نہیں بلکہ اگر اُس کے پاس ایک کروڑ بدن ہوں اور ہزار در ہزار روحیں ہوں اور ہزار در ہزار عمریں ہوں اور ہر عمر دنیا کی عمر کے برابر ہو یا اس سے بھی زیادہ اور پھر وہ اِس مقصد عزیز کے لیے اِن تمام کو خرچ کر ڈالے تو بھی یہ بہت تھوڑا ہے۔ اگر اس کے بعد کبھی وہ اپنے مقصد پر پہنچ جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل عظیم اور غنیمت بارِدہ ہو گا۔

سوا ئے مسکین اس غفلت کی نیند سے بیدار ہو۔ پھر میں نے غور کیا کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اُس کی خدمت کو لازم سمجھتا ہے۔ اور اپنی عمر بھر اسی راستے پر چلتا رہتا ہے۔ تو جو کچھ اللہ تعالیٰ اس کو عنایت فرماتے ہیں وہ چالیس کرامتیں اور خلعتیں ہیں۔ بیس تو اُن میں سے دنیا میں ہیں اور بیس اُن میں سے آخرت میں ہیں۔ وہ بیس جو دنیا میں ہیں ان میں سے:۔

پہلی یہ ہے۔ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اُس کا تذکرہ کرتے ہیں اور اُس کی ثنا کہتے ہیں اور کتنا معزز ہے وہ بندہ جس کی ثنا کہ کر اللہ رب العالمین اُس پر احسان کریں۔

اور دوسری یہ ہے کہ اللہ جل جلالہٗ اس کی شکر گزاری کرتے ہیں اور اُس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی تیرے جیسی عاجز مخلوق تیرا شکریہ ادا کرے اور تیری تعظیم کرے تو تو اُس کو کافی عزت سمجھتا ہے پھر اگر پہلوں اور پچھلوں کا معبود ایسا کرے تو اُس کا اندازہ کر و۔

اور تیسری یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اُس سے محبت رکھتے ہیں۔ اگر تیرے محلے کے رئیس یا شہر کے حاکم کو تجھ سے محبت ہو تو تو اس پر فخر کرے گا اور کئی مقام پر اس سے فائدہ اُٹھائے گا۔ پھر سوچ کہ رب العالمین کی محبت کیسی ہوگی۔

اور چوتھی یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اُس کے کارساز ہو جاتے ہیں اُس کے امور کی تدبیر کرتے ہیں۔

اور پانچویں یہ ہے کہ اُس کے رزق کے کفیل ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بغیر کسی محنت اور مشقت کے رزق کو اُس کی طرف لاتے رہتے ہیں۔

اور چھٹی یہ ہے۔ کہ وہ اُس کا مددگار ہوتا ہے۔ اور اُس کے ہر دشمن کو اور ہر برائی کا ارادہ کرنے والے کو اُس سے روکتا رہتا ہے۔

ساتویں یہ ہے کہ وہ اس کا انیس ہو جاتا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی وحشت محسوس نہیں کرتا۔ اور نہ تبدل اور تغیر کا اُسے خوف ہوتا ہے۔

آٹھویں نفس کی عزت۔ اُسے دنیا اور دنیا والوں کی خدمت کی ذلت نہیں پہنچتی۔ بلکہ وہ اس پر بھی رضامند نہیں ہوتا کہ دنیا کے بادشاہ اور جابر لوگ اس کی خدمت کریں۔

اور نویں ہمت کی بلندی وہ دنیا اور دنیا والوں کی گندگی میں آلودگی سے بلند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے کھیل تماشا اور خرافات کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

دسویں دِل کا غنا کہ وہ دنیا کے ہر غنی سے زیادہ غنی ہوتا ہے۔ ہمیشہ پاکیزہ نفس اور فراخ سینہ رہتا ہے۔ اُسے کوئی حادثہ گھبراہٹ میں نہیں لاتا اور نہ کسی چیز کے گم ہونے کا اُسے فکر ہوتا ہے۔

اور گیارھویں دِل کا نور ہے۔ وہ اپنے دل کے نور کے ساتھ علوم اور اسرار اور حکمتوں پر مطلع ہوتا ہے۔ کہ ان میں سے بعض کی اطلاع بڑی مدت اور بڑی کوشش کے ساتھ ہوتی ہے۔

اور بارھویں شرح صدر ہے کہ دنیا کے مصائب اور تکالیف اور لوگوں کی عیاریوں اور مکاریوں سے دِل تنگ نہیں ہوتا۔

اور تیرھویں ہیبت ہے۔ جو لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ کہ سب نیک و بد اُس کا احترام کرتے ہیں اور ہر فرعون و جابر اُس سے خوف کھاتا ہے۔

اور چودھویں دلوں کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دیتے ہیں کہ تمام دل اُس کی محبت پر مجبور ہو جاتے ہیں اور تمام لوگ اُس کی تعظیم پر بے اختیار ہو جاتے ہیں۔

اور پندرھویں برکت عامہ ہے جو اُس کے کلام اور نفس یا فعل یا کپڑے یا مکان غرض ہر چیز میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اُس مٹی کو متبرک سمجھتے ہیں جو اُس کے پاؤں کے نیچے آ چکی ہے۔ اور اُس جگہ کو جہاں وہ کسی دن بیٹھا ہو۔ اور اُس انسان سے جس نے اُس کو دیکھا ہو اور اس کے ساتھ کچھ صحبت رکھی ہو۔

اور سولھویں جنگلوں اور سمندروں غرض ساری زمین کی تسخیر ہے یہاں تک کہ اگر وہ چاہے تو ہوا میں اڑتا ہے۔ پانی پر چلتا ہے۔ یا ساری زمین کو ایک گھڑی میں طے کر لیتا ہے۔

اور سترھویں حیوانات کی تسخیر ہے۔ خواہ درندے ہوں یا وحشی جانور یا حشرات الارض وغیرہ پھر وحشی جانور اُس سے محبت رکھتے ہیں اور درندے اُسے چاٹتے ہیں۔

اور اٹھارویں زمین کے خزانوں کی ملکیت ہے۔ وہ جب بھی ارادہ کر کے زمین پر ہاتھ رکھتا ہے۔ تو اُسے خزانے مل جاتے ہیں۔ جب اپنے پاؤں زمین پر مارتا ہے۔ تو ضرورت کے وقت پانی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ وہ جہاں بھی اترتا ہے۔ اگر اُس کا ارادہ ہو تو اُسے کھانا مل جاتا ہے۔

اور انیسویں اللہ رب العزت کے دروازے پر قیادت اور وجاہت ہے۔ مخلوق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس کی خدمت کر کے وسیلہ ڈھونڈتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اُس کی وجاہت اور برکت

سے لوگ حاجتیں طلب کرتے ہیں۔

اور بیسویں اللہ تعالیٰ کی جناب میں دُعا کی قبولیت ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ بھی مانگتا ہے اس کو دیتا ہے۔ اور اگر کسی کی سفارش کرتا ہے تو اُس کی سفارش قبول ہوتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو قسم دیتا ہے۔ تو وہ جس طرح بھی چاہے اُس کی قسم کو پورا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اُن میں سے پہاڑ کی طرف اشارہ کرے تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔ وہ زبان سے سوال کرنے کا محتاج نہیں۔ اگر اُس کے دِل میں کسی چیز کا خیال آجاتا ہے۔ تو وہ حاضر ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہاتھ سے اشارہ کرنے کا بھی محتاج نہیں ہوتا۔

یہ کرامات تو دنیا میں ہیں۔ اور وہ جو آخرت میں ہیں تو:۔

اکیسویں یہ ہے۔ کہ اولاً تو اللہ تعالیٰ اُس پر موت کے سکرات کو آسان کر دیتے ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے۔ کہ جس سے انبیاء علیہم السلام کے دِل بھی ڈرتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ سکرات موت کو اُن پر آسان کرے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کے نزدیک موت اِس سے بھی زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ جیسے پیاسے آدمی کو صاف پانی پینے کو مل جائے۔ اللہ تعالیٰ۔ نے فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ	وہ لوگ کہ اُن کو فرشتے فوت کرتے ہیں اور وہ پاک ہوتے ہیں۔

اور بائیسویں ایمان اور معرفت پر ثابت قدمی ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے۔ جس کا انتہائی خوف اور گھبراہٹ ہے۔ اور اس پر پوری بے صبری اور رونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ۔	اللہ ایمان داروں کو قول ثابت کی وجہ سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔

اور تئیسویں فرشتے اور خوشبو اور بشارت اور رضامندی اور امان کا پہنچنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	یہ کہ نہ خوف کرو اور نہ غم کھاؤ اور اُس

بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۔ — جنت کی بشارت حاصل کرو کہ جس کا تم وعدہ کیے جاتے تھے۔

اور آخرت کی آئندہ ہولناکیوں سے خوف نہیں کھاتا۔ اور دنیا میں جو کچھ چھوڑ گیا ہے اُس کا اُسے غم نہیں ہوتا۔

اور چوبیسویں جنتوں میں ہمیشہ کی رہائش اور خدا تعالیٰ کی ہمسائیگی ہے۔

اور پچیسویں پوشیدگی میں اُس کے روح کی جلوت ہے آسمان اور زمین کے فرشتوں پر وہ عزت اور احترام سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور اُس کے بدن کو ظاہر میں جنازے کی تعظیم حاصل ہوتی ہے اس پر جنازہ کی نماز کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ اُس کی تجہیز و تکفین میں لوگ جلدی کرتے ہیں۔ اور اس کو بہت بڑا ثواب سمجھتے ہیں اور بہت بڑی غنیمت جانتے ہیں۔

اور چھبیسویں۔ قبر کے سوال و جواب کے فتنہ سے اَمن ہے۔ کہ وہ اس ہول سے مطمئن رہتا ہے اور اُسے صحیح جواب کا القا ہوتا ہے۔

اور ستائیسویں قبر کی فراخی اور اُس کی روشنی ہے۔ وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں قیامت کے دن تک رہتا ہے۔

اور اٹھائیسویں اُس کے روح اور جان کا مانوس ہونا اور معزز ہونا ہے۔ اُسے سبز پرندوں کے جسم میں رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے نیک بھائیوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اور جو کچھ اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بخشا ہے اُس پر خوش رہتے ہیں۔

اور انتیسویں عزت اور کرامت کے ساتھ اُس کا حشر ہے۔ کہ اُس کو لباس فاخرہ اور تاج پہنایا جائے گا اور بُراق پر سوار ہو گا۔

اور تیسویں چہرہ کا منور اور روشن ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ — کئی چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔

اور فرمایا:۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۔ کئی چہرے اُس دن سفید ہوں گے ہنستے ہوئے خوش۔

اور اکتیسویں قیامت کی ہولناکیوں سے امن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اَمَّنْ يَّاْتِىْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ یا وہ شخص جو آئے گا قیامت کے دن امن کی حالت میں۔

اور بتیسویں دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال کا ملنا ہے۔ اور ان میں سے بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے جنہیں حساب و کتاب کی ضرورت نہ ہو گی۔

اور تینتیسویں حساب کی آسانی ہے

چونتیسویں نیکیوں کا بوجھل ہو جانا اور بعض اُن سے ایسے بھی ہوں گے جن کو وزن کے لیے کھڑا نہیں کیا جائے گا۔

اور پینتیسویں حوض کوثر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونا پھر وہ ایک ہی دفعہ پئے گا اور اُس کے بعد پھر کبھی پیاسا نہ ہو گا۔

اور چھتیسویں پُلصراط سے گزر جانا اور آگ سے نجات پا جانا۔ یہاں تک کہ بعض اُن میں سے اُس کی آواز تک نہ سنیں گے اور وہ ایسی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے جن کو وہ چاہیں گے۔ اور اُن کے لیے آگ بجھ جائے گی۔

اور سینتیسویں قیامت کے میدان میں شفاعت کرنا جیسے کہ انبیاء اور رسول شفاعت کریں گے۔

اور اڑتیسویں جنت میں ہمیشہ کا ملک۔

اور انتالیسویں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رضامندی۔

اور چالیسویں اللہ رب العالمین کی ملاقات بلا کیف جل جلالہٗ جو کہ پہلوں اور پچھلوں کا معبود برحق ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ میں نے اِن کو اپنے فہم اور اپنے مبلغ علم کے مطابق شمار کیا ہے۔ اگرچہ میرا علم نہایت ناقص اور قاصر ہے۔ اور پھر اِس پر مزید یہ ہے۔ کہ میں نے اِن کو نہایت مختصر ذکر

کیا ہے۔ اور اِن کو اصولاً اور اجمالاً ذکر کر دیا ہے۔ اور اگر میں ان میں سے بعض کی تفصیل بیان کرتا تو یہ کتاب اِس کی متحمل نہ ہو سکتی کیا تو غور نہیں کرتا کہ میں نے ہمیشہ کے ملک کو ایک ہی خلعت شمار کیا ہے۔ اگر میں اس کو تفصیل سے بیان کرتا تو یہی چالیس خلعتوں سے زیادہ ہو جاتی۔ جیسے حور کا نور اور محلات اور لباس وغیرہ کی تفصیل پھر ان میں سے ہر ایک ایسی تفصیل پر مشتمل ہے۔ جن کو غیب اور حاضر کا جاننے والا ہی جانتا ہے۔ کہ جس نے اُن کو پیدا کیا ہے۔ اور اُن کا مالک ہے۔ اور ہمیں اُن کی معرفت کی کونسی توقع ہو سکتی ہے۔ جبکہ خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۔ — کوئی آدمی نہیں جانتا جو اُن کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

خلق فیہا ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ — کہ اُس میں وہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی انسان کے دل پر اُن کا گزر ہوا۔

اور مفسرین اللہ تعالیٰ کے اِس قول کے متعلق کہتے ہیں:۔

لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ ۔ — کہ اس سے پہلے سمندر ختم ہو جائیں کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔

کہ یہ وہ کلمات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اہل جنت کے لیے جنت میں لطف اور مہربانی سے کہے گا۔ اور جس کی یہ کیفیت ہو تو ہم اس کے ہزار در ہزار حصے کو بھی کیونکر پہنچ سکتے ہیں کہ ہم انسان ہیں یا اُس کے علم کو مخلوق کیونکر گھیر سکتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہمتیں جواب دے جاتی ہیں اور عقول اُن کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور حق یہ ہے کہ اسی طرح ہونا چاہیے اور وہ غالب جاننے والے کی اُس کے فضل عظیم کے تقاضے کے مطابق اور اس کی قدیم سخاوت کے موافق ایک عطا ہے۔ خبردار اِس مطلوب عظیم کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے اور کوشش کرنے والوں کو اپنی کوشش خرچ کرنی چاہیے اور جاننا چاہیے کہ یہ سب کچھ اُس چیز کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے۔ جس کے وہ محتاج ہیں اور جس کا وہ اُس سے سوال کرتے ہیں۔ اور جس کو مانگنے کے لیے وہ دست سوال دراز کرتے ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بندے رکھے لیے

چار چیزیں نہایت ضروری ہیں۔علم۔عمل۔اخلاص اور خوف۔پہلی کے ساتھ وہ راستے کو معلوم کرے گا ورنہ وہ ایک اندھا ہے۔پھر ان کے مطابق عمل کرے گا ورنہ وہ روک دیا جائے گا۔پھر عمل کو خالص کرے گا ورنہ وہ نقصان اٹھائے گا۔پھر وہ ہمیشہ آفات سے ڈرتا رہے گا یہاں تک کہ وہ امان حاصل کرے ورنہ وہ دھوکہ میں پڑا ہوا ہے۔

ذوالنون مصری نے بالکل سچ کہا کہ تمام مخلوق مردہ ہے۔سوا علماء کے اور علماء سوئے ہوئے ہیں ماسوائے عمل کرنے والوں کے اور عمل کرنے والے سب دھوکے میں ہیں مگر مخلص لوگ اور تمام مخلص بہت بڑے خطرے پر ہیں۔

میں کہتا ہوں چار آدمیوں سے انتہائی تعجب ہے۔ایک وہ عقلمند جو عالم نہ ہو کیا وہ اُن چیزوں کی معرفت کا اہتمام نہیں کرتا جو آئندہ پیش نہ آنے والی ہیں کیا وہ اُن چیزوں کو معلوم نہیں کرتا جن کو وہ موت کے بعد دیکھنے والا ہے۔اُس کو دلائل اور عبرتوں اور ان آیتوں کے سننے اور ان خیالات سے دل کی بے قراری اور نفس کے تصورات سے ان کو معلوم کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

اَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۔	کیا وہ زمینوں اور آسمانوں کی بادشاہی اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اُن میں غور نہیں کرتے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۔	کیا یہ لوگ خیال نہیں کرتے کہ وہ بڑے دن کے لیے اُٹھائے جائیں گے۔

اور دوسرے اُس عالم سے جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا کیا وہ یقینی طور پر نہیں جانتا کہ اُس کے سامنے بہت بڑی ہولناکیاں اور مشکل گھاٹیاں ہیں اور یہی بہت بڑی خبر ہے۔جس سے تم منہ پھیرتے ہو۔تیسرے اُس عامل سے جو مخلص نہ ہو۔کیا وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول پر غور نہیں کرتا:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ	جو آدمی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور

رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ — اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

چوتھے اس مخلص سے جوڈرنے والا نہ ہو کیا وہ اللہ جل جلالہ کے اُس معاملہ کی طرف غور نہیں کرتا جو وہ اپنے اصفیاء اور اولیاء اور اپنے خادموں سے کرتا ہے جو کہ اُس کے اور اُس کی مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی سب سے زیادہ معزز مخلوق کو فرماتا ہے :۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ الْاٰيَة — اور بے شک وحی کی گئی تیری طرف اور اُن لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے۔

اور اسی طرح کی اور بھی آیات یہاں تک کہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے مجھے سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کردیا۔

پھر قصہ مختصر ان کی تفصیل وہ ہے جو رب العالمین نے اپنی کتاب عزیز کی چار آیتوں میں بیان کردی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ — کیا تم نے خیال کر رکھا ہے۔ کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

پھر اللہ جل جلالہ نے فرمایا:۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ — چاہیے کہ ہر آدمی اُس پر غور کرے جو اُس نے کل کے لیے بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تمہارے عملوں سے خبردار ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ — جن لوگوں نے ہمارے متعلق کوشش کی ہم ضرور ان کے لیے اپنی راہیں کھول دیں گے۔

پھر ان تمام چیزوں کو ایک جامع آیت میں بیان کردیا ہے۔ اور وہ سب سے زیادہ سچا

قائل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔

جو شخص کوشش کرے گا وہ اپنی جان کے لیے کوشش کرے گا بے شک اللہ تعالیٰ تمام عالم سے بے نیاز ہے۔

اور ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے قدم کی لغزش اور اپنے قلم کی ہر بے راہ روی سے معافی طلب کرتے ہیں اور ان تمام اقوال سے مغفرت کے متمنی ہیں جو ہمارے اعمال کے مطابق نہ ہوں۔ اور ہر اس چیز سے مغفرت کے طالب ہیں جس کا ہم نے دعویٰ کیا اور اس کو دین الٰہی کے علم کی حیثیت سے ظاہر کیا حالانکہ اس میں بہت سی کوتاہیاں ہیں اور ہم اس سے ہر اس خیال سے مغفرت کے طالب ہیں جس نے ہم کو تصنع پر تیار کیا اور جس کا ہم نے اپنی کتاب میں اندراج کیا یا ہر اس کلام سے جس کو ہم نے نظم کیا یا ہر اس علم سے

جس کا ہم نے نفع دیا اور ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور اے بھائیو! کی جماعت تمہیں بھی ہمارے علم کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم خالص اس کی رضامندی چاہیں اور سوال کرتے ہیں کہ وہ اس علم کو ہم پر وبال نہ بنائے اور اس کی نیکیوں کے ترازو میں رکھے جب کہ ہمارے اعمال ہماری طرف لوٹائے جائیں یقیناً وہ بڑا سخی نہایت کرم فرمانے والا ہے۔

شیخ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ وہ ہے جس کا ہم نے قصد کیا تھا کہ عنقیٰ کے طریقہ کے سلوک کی کیفیت کی شرح میں ذکر کریں گے اور ہم نے اپنے مقصد کو پورا کیا اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں کہ جس کے احسان سے نیکیاں پوری ہوتی ہیں اور جس کے فضل سے برکات کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی بہترین مخلوق پر ہر حال میں رحمتیں نازل فرمائے جس نے معبود حقیقی کی طرف دعوت دی یعنی حضور سید عالم نور مجسم احمد مجتبیٰ حضرت مصطفیٰ اور آپ کی آل پر پاکیزہ اور برکت والی سلامتی نازل فرمائے۔ واخر دعوانا ان الحمد رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی رسولہ الکریم الامین وعلی آلہ الطیبین الطاہرین واصحابہ واولیاء امتہ اجمعین